

# میں نے روس میں کیا دیکھا



[toobaa-elibrary.blogspot.com](http://toobaa-elibrary.blogspot.com)

محمد خان

8





بسم اللہ الرحمن الرحیم

## ادارہ معارف اسلامی لاہور

یہ ادارہ اسلامی علوم و معارف کی ترویج و تحقیق کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد دودھ حاضر کے عظیم مفکر، قائد تحریک اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے جولائی ۱۹۶۳ء میں رکھی تھی اور اس کا پہلا مرکز کراچی میں قائم کیا گیا تھا۔ بعد ازاں فروری ۱۹۷۹ء میں مولانا مرحوم نے لاہور کو اس کا دوسرا مستقر بنایا۔ اب کراچی اور لاہور کے ادارہ معارف اسلامی کے دونوں مرکز داخلی طور پر خود مختار اور مقصدی اور آئینی طور پر ہم آہنگی سے کام کر رہے ہیں۔

عصر حاضر کے تقاضوں کی رعایت سے بلند پایہ لٹریچر شائع کرنے کے علاوہ محترم مؤسس کے پیش نظر خاص مقصد یہ تھا کہ اسلامی موضوعات پر کام کرنے والے مصنفین اور محققین کے لئے ایسا سازگار اور پرسکون ماحول مہیا کیا جائے جس میں وہ پورے انہماک اور فراغت کے ساتھ اپنی کوششیں جاری رکھ سکیں۔

بھگت اپنے یوم تشکیل ہی سے یہ ادارہ ان دونوں مقاصد کے لئے نہایت خوبی سے کام کر رہا ہے۔ اب تک جو منصوبے زیر عمل آچکے ہیں ان کا مجمل سا خاکہ یہ ہے:

۱ - مختلف موضوعات کی بہت سی بلند پایہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

۲ - ایسے مصنفین کا پرسرگرم تعاون حاصل کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے جو نئی کتابیں تصنیف کرنے اور دیگر زبانوں کی اہم کتابیں اردو میں ترجمہ کرنے کے علاوہ اردو زبان میں شائع شدہ بہترین کتابوں کو عربی، انگریزی، فارسی، فرانسیسی، جرمن اور سواحلی زبانوں میں منتقل کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ ایسی کتابوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتب کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

۳ - مصنفین، محققین اور طلباء کے استفادے کے لئے ایک لائبریری کی بنیاد رکھ دی گئی ہے جس میں اردو کے علاوہ عربی اور دوسری زبانوں کی ضروری کتابیں جمع کی جا رہی ہیں۔

۴ - اردو اور انگریزی کے اخبارات و جرائد کے تراشوں سے بہت احتیاط اور توجہ کے ساتھ ایسا ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے جس سے کسی بھی موضوع پر کام کرنے والے مصنفین اور محققین استفادہ کر سکتے ہیں۔

ان مساعی کو بہت وقیع قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن یہ بات اہتمام سے کہی جاسکتی ہے کہ ملت اسلامیہ جن مشکلات و مسائل سے دوچار ہے ان سے عمدہ برآمد ہونے اور اتحاد و ترقی کی کوششوں کو آگے بڑھانے میں یہ حقیر مساعی ضرور معاون ثابت ہوں گی اور انشاء اللہ ان میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا۔



ACU-720

20-2-18

# میں نے وس میں کیا دیکھا

انجینئر شاہ محمود خان



انسٹیٹیوٹ آف ریجنل سٹڈیز پشاور



۹۱۴۰۴۶

خ ل ن

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب \_\_\_\_\_ میں نے روس میں کیا دیکھا  
 نام مصنف \_\_\_\_\_ انجینئر شاہ محمود خان  
 مطبع \_\_\_\_\_ میٹروپرنٹرز، لاہور  
 کتابت \_\_\_\_\_ خطیب عبدالحمیم ساجد  
 اشاعت :-

پہلی \_\_\_\_\_ دسمبر ۱۹۸۶ء ۱۰۰۰ رو  
 دوسری \_\_\_\_\_ جون ۱۹۸۷ء ۱۰۰ رو  
 تیسری \_\_\_\_\_ فروری ۱۹۸۸ء ۱۰۰۰ رو  
 چوتھی \_\_\_\_\_ دسمبر ۱۹۸۸ء ۱۰۰۰ رو  
 پانچویں \_\_\_\_\_ نومبر ۱۹۸۹ء ۱۰۰ رو

روس - سونا

قیمت \_\_\_\_\_ ۵۲ روپے



تقسیم کنندہ :

المنار بک - سینٹر منصورہ، ملتان روڈ لاہور



# فہرستِ مضامین

پیش لفظ

۱۷

پہلا باب

۲۳

آغازِ سفر

۲۳

روس براستہ لنڈا بازار

۲۴

الوداع میری دلنواز وادیو!

۲۶

سیکولر سیم سفر

۲۷

پہلا منظر

۲۸

اندر سے رجعت پسند

۲۹

ہتھوڑے اور درانتی کے دیس میں

۳۰

پرائے دیس میں اپنے

۳۲

کھانے کا صبر آزاں انتظار

۳۳

ناشتہ اور پٹخ ایک ساتھ

۳۶

ماسکو کی ایک جھلک

۳۷

ہر سو سرنخی

۳۸



- ۳۹ لینن کی لاش کا تقدس  
۴۰ کرملین کا تاریخی چہرہ  
۴۱ عجائب گھر میں سبرک کارمل  
۴۲ کامرا نیوں کی نمائش  
۴۳ میٹرو  
۴۴ مہمان نواز لوگ  
۴۵ اجنبی سرزمین پر  
۴۶ کرس آمادگی ہاسٹل  
۴۷ سرخ دیس کے آداب  
۴۹ آنسوؤں سے وضو کیا  
۵۰ اساتذہ  
۵۱ ہم سبق  
۵۲ غیرت زندہ ہے  
۵۳ اسلام سے عقیدت  
۵۴ قرآن پاک کی محبت  
۵۶ اسلامی تحریک  
۵۶ مذہبی آزادی کا ڈھونگ  
۵۸ اسلام زندہ معجزہ ہے  
۶۰ قصاب کے اوزاروں سے آپریشن  
۶۰ شراب کا سیلاب  
۶۲ ڈسپن کے نام پر



## دوسرا باب

۶۲

امیر شہر غریب لوگ

۶۳

اسلام کا گھر

۶۵

۶۷

علی حسن سے ملاقات

۶۸

چند گھنٹے ایک مسلمان گھرانے میں

۷۰

عربی زبان پر پابندی

۷۱

قرآن موجب برکت ہے

۷۲

اشیائے ضرورت کی کمیابی

۷۴

روس میں چوری عام ہے

۷۵

ریاضی کے استاد

۷۶

خوشامد کا بول بالا

۷۸

تاجکوں پر مہربانی

۷۹

ایک لطیفہ

۸۰

آبادی کا تبادلہ

۸۱

نوجوانوں کا دینی ذوق

۸۳

یونیورسٹی میں داخلہ

۸۴

نائٹروجن گیس کا موجد - لینن

۸۶

چرس رکھنے کا الزام

۸۵

طلبہ کی سیاسی سرگرمیاں

۸۷

کے جی بی کی کارستانیاں

۸۸

۹۱

شکار یوں کے پھندے  
بے راہ روی کی تربیت

## تیسرا باب

۹۵

۹۵

۹۵

۹۷

۹۹

۱۰۰

۱۰۲

۱۰۳

۱۰۴

۱۰۵

۱۰۶

۱۰۸

۱۰۹

۱۱۰

۱۱۲

۱۱۳

۱۱۴

۱۱۵

نئی منزل، دُک

رشوت کی کرامت

غیر ملکی سیاحوں کے شکاری

مسلمان بھائی نے مدد کی

افغانستان روس میں ہے

یونیورسٹی

ابتدائی مشکلات

نماز پر حیرت

”اخلاقی جبرأت“

تانیہ کی ضیافت

علیحدہ کمرہ

روحانی ازیت کا سامان

غیر نصابی مشاغل

اساتذہ کا رویہ

روسی طلبہ کی سیاحت

اساتذہ کے اختیارات

جبر کا نتیجہ



- ۱۱۶ روسی طلبہ کی حالتِ زار
- ۱۱۷ مالی مشکلات کا حل — شادی
- ۱۱۸ غیر ملکی طلبہ
- ۱۱۹ ہسپتال میں داخلہ
- ۱۲۰ طریقِ علاج
- ۱۲۱ لینا سے واقفیت
- ۱۲۱ میرے ساتھ شادی کر لو
- ۱۲۳ شادی یا سودا
- ۱۲۴ روسی ہسپتالوں کی اقسام
- ۱۲۵ قابلِ تقلید روایت
- ۱۲۵ امریکہ کے ہسپتالوں میں
- ۱۲۶ جشنِ آزادی منایا
- ۱۲۸ یہودی پروفیسر
- ۱۲۹ ہر حال میں غیر جانبداری
- ۱۳۰ کمیونسٹ کے گھر کا قبلہ، امریکہ

## چوتھا باب

- ۱۳۱ مادی ترقی اور روحانی زوال
- ۱۳۲ مغموم اور تنہا لوگ
- ۱۳۳ غموں کا سہارا، شراب
- ۱۳۶ دروغ گوئی، ایک معاشرتی ضرورت

- ۱۳۰ غیر طبقاتی معاشرے کے دو طبقے
- ۱۳۱ مراعات یافتہ طبقہ
- ۱۴۰ کلاس فیلو کی شادی میں شرکت
- ۱۴۲ جمعہ گل کی شادی
- ۱۴۳ امیروں کے روبل بھی الگ ہیں
- ۱۴۴ کنبہ پردی
- ۱۴۵ لودا سے لودمیلا تک
- ۱۴۶ کمیونسٹ بھی، مسلمان بھی
- ۱۴۸ پارٹی میں داخلہ آسان نہیں
- ۱۴۹ کے جی بی کے ایجنٹ
- ۱۵۰ خفیہ نمازیں
- ۱۵۱ بھڑیا انسان نہیں بن سکتا
- ۱۵۳ امیروں کے چو نچلے
- ۱۵۴ اعلیٰ طبقے کے لیے مراعات
- ۱۵۵ سیاست سے عوام کی عدم دلچسپی
- ۱۵۶ مغربی لباس کے دیوانے
- ۱۵۸ نوجوان روسی کہلانے سے شرماتے ہیں
- ۱۵۹ جب بھٹی ہوئی تیلون کی قسمت جاگی
- ۱۶۰ ٹرانسپورٹ کا مسئلہ
- ۱۶۱ نئی کارستیء۔ پرانی مہنگی
- ۱۶۲ اشیائے ضرورت کی کمیابی



۱۶۴ روسی مصنوعات کا ناقص معیار

## پانچواں باب

۱۶۵ فیلڈ ورک

۱۶۸ پڑھے لکھے بغیر پاس

۱۶۹ نقل کی روز افزوں وبا

۱۷۰ تعلیم سے عدم دلچسپی کیوں؟

۱۷۱ قفقاز کا سفر

۱۷۳ ٹیکسی ڈرائیور کا تقاضا

۱۷۳ ایک مخلص خاتون

۱۷۴ گرہ یاچی کلچر سینی ٹوریم

۱۷۶ بیمار ہونے کا معقول انتظام

۱۷۷ دلوں میں چھپے لہو فان

۱۷۹ سچے جذبے مر گئے

۱۸۰ جدلی مادیت کا مخروط

۱۸۲ روس کے مال کی مانگ کیوں نہیں؟

۱۸۳ شرمناک حقیقت

۱۸۴ اجتماعی کاشتکاری کے فارم پر

۱۸۵ جنسی آوارگی

۱۸۷ جمعہ گل کو جان کا خطرہ

۱۸۸ انوکھا اسلام

۱۹۱	فارم پر ہمارا کام	۶۲۱
۱۹۲	ٹرک ڈرائیور کا جرأت	
۱۹۳	یہ تو ہم جیسا ہے	۲۲۱
۱۹۵	جمعہ گل کی اجل آگئی	۲۳۱
۱۹۶	لچھے شوہر کی تلاش	۸۲۱
۱۹۷	غسل خانے کا مسئلہ حل ہو گیا	۹۲۱
۱۹۸	اجتماعی کاشتکاری	۱۰۲۱
۱۹۹	گوشت خوش نصیبوں کو ملتا ہے	۱۱۲۱
۲۰۰	فلسفے کی استاد سے بحث	۶۲۱
۲۰۱	الحاد کی تدریس	۶۵۱
۲۰۲	یوکرین میں عیسائیت کے اثرات	۶۶۱
۲۰۳	غیر ملکیوں سے روابط پر پابندی	۲۵۱
۲۰۵	ابھی انقلاب مکمل نہیں ہوا	۱۵۱
۲۰۶	دانشور طبقے کی حقیقت پسندی	۹۵۱
۲۰۸		
۲۰۸	کوئی چارہ ساز ہوتا	۶۶۱
۲۰۹	ذوقِ سلیم سے محرومی	۶۸۱
۲۱۱	ایک روسی گھرانے سے ملاقات	۵۸۱
۲۱۲	معمرخاتون کی آپ بیتی	۷۸۱
۲۱۵	فولاد کے کارخانے میں	۸۸۱

## چھٹا باب



## مزدور عورتیں

- ۲۱۹ میرے پاس موٹر نہیں ہے  
۲۱۹ غنڈے سے دوستی  
۲۲۲ خزانہ عالم کی سیر  
۲۲۵ روحانی بیماریوں کا ہجوم  
۲۲۸ عیش و عشرت کی ارزانی  
۲۳۰ استاد محترم کی رنگین مزاجی  
۲۳۳ تین افغان ترقی پسند  
۲۳۶ یہاں کوئی مسلمان نہیں  
۲۳۸ یہ کھیت میرے اپنے تھے  
۲۳۹ کاش یہ معصوم ہی رہتے  
۲۴۲

## ساتواں باب

- ۲۴۷ اشتراکیت کی تدریس  
۲۴۷ اڈلیہ میں ایک ماہ  
۲۴۹ قابل دید مقامات  
۲۵۱ استاد سے اختلافی بحث  
۲۵۵ خدا یا خیر!  
۲۵۶ پروفیسر صاحبہ کو دوست مل گیا  
۲۵۹ افغان فوجی افسروں سے ملاقات  
۲۶۱  
۲۶۲

۲۶۴	زرعی فارم میں	۲۱۶
۲۶۹	حق دوستی ادا کرتے ہیں	۲۱۶
۲۷۰	بے حیائی کے اڈے	۲۶۶
۲۷۲	بھیڑ چال	۵۶۶
۲۷۴	سب سے زیادہ مظلوم — روسی عورت	۸۶۶
۲۷۶	ناکام شادیاں	۰۶۶
۲۷۸	مذہب آزاد ہے یا پابند !	۶۶۶
۲۸۰	تم نے دیکھا ہے خدا کو ؟	۲۶۶
۲۸۴	خدا نے میری حفاظت کی	۸۶۶

## آٹھواں باب

۲۸۷	فقہاء میں چند ہفتے	۵۶۰
۲۸۸	غیر ملکی مال کا ضبط	۵۶۲
۲۹۰	کارخانے کے مسائل	۴۶۲
۲۹۲	صحت کے مرکز میں	۵۵۲
۲۹۴	قومی تعصب	۲۵۲
۲۹۶	اسلام سے محبت کرنے والی لڑکی	۲۵۲
۲۹۹	مسلمانوں کی پُر درد داستان	۲۵۲
۳۰۰	دلوں میں دبی چنگاریاں	۱۲۶
۳۰۲	اسلام کے خلاف سرکاری حربے	۲۶۶
۳۰۴	جذبات کے بجائے حکمت	۲۶۶



- ۲۰۵ مذہب دشمنی کا مہنگا تجربہ
- ۲۰۷ پھر کس بازار
- ۲۰۸ قرآن پاک کے نسخے
- ۲۱۰ ملی تشخص کی خاطر
- ۲۱۲ بچوں کے اسلامی نام
- ۲۱۳ اہل تصوف کے حلقے
- ۲۱۴ آزادی کا مفہوم
- ۲۱۷ کارخانے کی رہائشی کالونی
- ۲۱۹ عائلی زندگی کے مسائل
- ۲۲۰ کام چوری
- ۲۲۱ روس میں سیاسی قیدی نہیں ہوتے
- ۲۲۲ مسلمان ڈاکٹر کی حسرت

## نواں باب

- ۲۲۵ قفقاز کے افرادیت پسند
- ۲۲۷ جاپانی ستیاح
- ۲۲۸ ایمان کی آزمائش
- ۲۳۱ ظاہر پر معرٹنے والا نوجوان
- ۲۳۲ اساتذہ کی شفقت
- ۲۳۲ طلبہ تنظیمیں
- ۲۳۴ دوبارہ میڈناگورسک

۳۳۵	جاپانی چھتری، سرمایہ افکار	۵۰۶
۳۳۸	باشغیری مسلمان	۵۰۶
۳۳۸	فیکٹری مینجر سے ملاقات	۵۰۶
۳۳۹	مقالہ لکھنے کا مرحلہ	۵۰۶
۳۴۲	تقسیم اسناد کی تقریب	۵۱۶
۳۴۲	ہم وطنوں کی ریشہ دوانیاں	۵۱۶
۳۴۴	پارٹی میں شمولیت	۵۱۶
۳۴۵	اشتراکی چالیں	۵۱۶
۳۴۷	لو آپ اپنے دام میں صیاد آگئے	۵۱۶
۳۵۰	ترقی پسندوں کا برہنہ رقص	۵۱۶
۳۵۳	شراب خانہ خراب کا شاخصانہ	۵۱۶

## دسواں باب

۳۵۹	غربت کے اندھیرے	۵۲۶
۳۵۹	لینن گراڈ کی سیر	۵۲۶
۳۶۰	ہوس کے مارے طلبہ	۵۲۶
۳۶۲	عجائب گھروں کی سیر	۵۲۶
۳۶۵	قیدی مسجد	۵۲۶
۳۶۷	الوداعی اجتماع	۵۲۶
۳۷۰	ماشقند کے دو چہرے	۵۲۶
۳۷۲	اپنے وطن میں	۵۲۶
۳۷۴	انقلاب کے تیور	۵۲۶



## پیش لفظ

از قاضی حسین احمد یکرٹری جنرل جماعت اسلامی پاکستان

پاکستان میں روس کے دو ناقابل فراموش سفر نامے لکھے گئے ہیں۔ مدتوں پہلے روزنامہ ”ڈان“ کے اُس وقت کے مدیر اعلیٰ، الطاف حسین مرحوم نے اپنے اخبار میں قسط وار شائع کیا تھا، دوسرا اب ادارہ معارف اسلامی لاہور شائع کر رہا ہے۔ یہ سفر نامہ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی ریشا در کے رکن شاہ محمود خاں نے قلم بند کیا ہے۔ ملت کے ان دونوں دردمند دانشوروں نے اپنے اپنے انداز میں ہاں کی فلاکت زدہ مسلمان اقلیت کی تصویر کشی کی ہے۔ عظیم صحافی نے اشارات و علائم میں چند جھلکیاں دکھا کر خاموش محقق نے بہت بڑے کینوس پر کئی حقیقت پسندانہ مناظر پیش کر کے۔ ایک نے پلکوں کو نرم آلود کیا تھا۔ دوسرا آنکھ کو خوبانہ فشانے کی دعوت دے رہا ہے۔

شاہ محمود خان افغان مہاجر ہیں جنہوں نے انجینئری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے چھ سال روس میں گزارے ہیں۔ اس طویل قیام میں انہیں متاثر کرنے کے لیے بہت کچھ دکھایا گیا اور اس سے کہیں زیادہ خود ان کی چشم بینا نے دیکھا جس سے وہ اپنے طور پر متاثر ہوئے۔ ان کا یہ سفر نامہ دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہونے کے باعث ایک معروضی مطالعہ بن گیا۔ ہے جو دلچسپ بھی ہے اور حقائق افروز بھی۔

کرمین کے کار فرماؤں کا دعویٰ ہے کہ اشتراکی نظام نے اس قلمرو میں غربت کا خاتمہ کر دیا ہے اور تیسری دنیا میں ان کے وظیفہ خوار سنی سنائی پر کان دھرنے کے نہ صرف اس اداغے باطل کو عین صداقت گردانے لگتے ہیں بلکہ دوسرے ممالک کے عوام کو بتاتے نہیں تھکتے کہ



”روٹی، کپڑا اور مکان“ حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اشتراکی انقلاب ہے جو غربت کو مٹا کر مساوات لائے گا۔

شاہ محمود خان نے روس کے گاؤں بھی دیکھے ہیں اور شہر بھی۔ انہیں بڑے بڑے شہروں میں بھی غربت کے اندھیرے نظر آئے جس میں لاتعداد گھرانے ایسے جھونپڑوں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے جہاں چوپائے بھی نہیں رہ سکتے۔ دیہات کا نقشہ کچھ سوا تھا۔ مزدور اور کسان زندگی بھر روس کو ”سپر پاور“ بنانے کے لیے قربانی کرتا رہتا ہے مگر جوانی کی کمر توڑ محنت کا انعام فقط سینتیس روپل ماہانہ پنشن کی صورت میں ملتا ہے جس سے وہ اپنے چھوٹے بچوں کی دو وقت کی روٹی بھی پوری نہیں کر سکتا۔ بوڑھی عورتیں بیس پچیس روپل ماہانہ کی مزدوری تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ مساوات کے افسانوں کی حقیقت یہ ہے کہ سول اور فوجی افسروں کی پنشن اس کے مقابلے میں ڈھائی سو روپل سے کم نہیں ہوتی اور اعلیٰ افسروں کی پنشن تو ہزار روپل ماہانہ یا اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ افسروں کی اولاد کی تعلیم و تربیت کے مصارف بھی سرکاری ادا کرتی ہے۔ پنشن کا یہ تفاوت تنخواہوں کے تفاوت کا آئینہ دار ہے۔ یہ عدم مساوات ایک غیر جانبدار حساس مبصر کے دل و دماغ پر جو تاثر چھوڑتا ہے اسے شاہ محمود خان کی زبان سے سنیے :-

”روس کے بین الاقوامی کلبوں میں، جہاں عیش و عشرت کا ہر سامان موجود ہوتا ہے، روسی دانشور دنیا بھر کے پسماندہ ممالک کے طلبہ کو سوشلسٹ انقلاب لانے کی تدبیریں بتاتے تھے۔ میں ایک جانب یہ تقریریں سنتا اور دوسری طرف روسی معاشرے میں غربت کے ہر طرف پھیلے ہوئے مناظر دیکھتا تو میرا دل خود بخود اس انقلاب سے بیزار ہو جاتا“

اس ماحول کی کوکھ سے غنڈہ گردی نے جنم لیا ہے اور جنسی بے راہروی اور دوسری اخلاقی بیماریاں پیدا ہوئی ہیں۔ پُر امن شہریوں کے لیے رات کے وقت بازاروں اور پبلک مقامات پر گھومنا پھرنا خطرے سے خالی نہیں۔ عام لوگ شام کے بعد گھروں سے باہر کم کم ہی نکلتے ہیں۔ غنڈوں نے کمزوروں کے حقوق کی حفاظت کے بہانے خفیہ ٹولیاں بنا رکھی



ہیں۔ کیا چھوٹے کیا بڑے، کیا مرد کیا عورتیں، اکثر لوگ اپنی محدود میوں کا علاج نشے سے کرتے ہیں شراب نوشی عام ہے چرس اور بھنگ کے شکار بچے مارے مارے پھرتے ہیں عورتیں بھی کچھ کم پریشان نہیں۔ شراب کے ایک جام کے عوض عزتوں کے سودے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ معاشرے کی یہ اخلاقی گراؤٹ حکومت کے لیے پریشان کن بھی ہے اور اطمینان بخش بھی۔ پریشانی زرعی و صنعتی پیداوار میں کمی کے باعث ہے لیکن اطمینان اس وجہ سے ہے کہ عوام اپنا داخلی کرب بھلانے کے لیے جن مشاغل میں گئے رہتے ہیں وہ انہیں سرکاری پالیسیوں پر تنقید کی جرات سے محروم کر دیتے ہیں۔

آغوش بخودی میں پناہ لینے پر مجبور ہونے سے قبل بعض لوگ ملک سے فرار کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس سخت گیرانہ نظام میں شادی کا میا بی نصیب ہوتی ہے۔ ”روس سے نکل بھاگو، باقی ہر جگہ خیریت ہے“۔ یہ صدا ہر دل میں گونجتی ہے، اور اس پر عمل کچھ کوشش نوجوان لڑکیاں غیر ملکی طلبہ سے شادی کی التجا کر کے، دوسرے لوگ غیر ملکی سفارتخانوں میں سیاسی پناہ کی درخواست کے ذریعے کرتے ہیں۔ طلبہ بوجہ اس پیش کش کو عارضی تعلقات کی حد سے بڑھانے کے روادار نہیں ہوتے، اور سفارت کاروں سے میل جول پر اتنی پابندی ہے کہ عام آدمی کی ان تک رسائی محال ہے۔ غرض دل کی تمنا دل ہی میں رہ جاتی ہے۔

مسلمان اقلیت کا جدا گانہ تشخص ختم کرنے کے لیے سُرخ سامراج نے یوکرین سے لے کر وسط ایشیا تک آبادیوں میں جو اکھاڑ پچھاڑ کی، اس کی داستان بھی شاہ محمود خان نے وہاں کے باقی ماندہ مسلمانوں سے سنی، لیکن ان کا کہنا ہے کہ خود روسی نسل کے وہ لوگ بھی اشتراکی حکومت کے ظلم و ستم سے بچ نہیں پاتے جو اس کے کارپردازوں کی کسی طرح ناراضگی مول لے بیٹھیں انہیں عقوبت و تعذیب کے کم و بیش دیسے ہی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جو زاروں کے عہد میں معنوی کا منقہ تھے۔ ایک تاریخی قید خانے کے سامنے ایک روسی کے جذبات ان لفظوں میں ڈھلے۔

”ہم نے زاروں کے انجام سے عبرت حاصل نہیں کی۔ اپنے مخالفوں کو معاف کرنا ہمارے نزدیک حماقت ہے۔ سائبریا کے بیگار کیمپوں میں انسانیت پر ہونے



و اے مظالم بھی شاید کبھی تاریخ کے صفحات پر نظر آئیں گے اور انیوالادور موجودہ دور کے زاروں کی سیہ کاریوں کی نشاندہی کے لیے یادگاریں اور عجائب گھر تعمیر کر لگائے۔

قدرتی طور پر اس افغان مہاجر کے سفر نامے میں جگہ جگہ اُن کے ہم وطنوں کا ذکر آیا ہے جو ظاہر شاہ کے دور حکومت میں اشتراکی نظریات سے وابستگی کی بنا پر تعلیمی وظائف پاکر روس گئے تھے۔ وہ "خلقی" اور "پرچی" کہلانے پر فخر کرتے اور ایک دوسرے کو کامریڈ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ سردار داؤد نے ظاہر شاہ کو معزول کر کے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لی تو ان "ترقی پسند" طلبہ کے تیور اور بھی تیکھے ہو گئے اور وہ کہنے لگے ہمارا ملک اب کمیونسٹ حکمران کے زیر تسلط آگیا ہے اب ہم دشمنوں کو مزا چکھا دیں گے۔ روسی ذرائع ابلاغ نے بھی نئے سربراہ حکومت کی آمد کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور اسے افغانستان میں "سرخ روشنی لانے والا ہیرو" قرار دیا، لیکن چند ہی سال بعد کرملین نے اپنے اس ممدوح کو راہ سے ہٹانے کے لیے ایک گھناؤنی چال چلی۔ اس سازش کا منصوبہ ماسکو کے اشارے پر کابل کے روسی سفارت خانے میں تیار ہوا اور پرچیم پارٹی کے ایک اہم لیڈر میر اکبر خیبر کو گوئی مار کر ہلاک کر دیا گیا تاکہ سردار داؤد پر ہاتھ ڈالنے کا بہانہ مل سکے۔ یوں سردار داؤد، ترہ کئی اور امین سبھی روس کے مہرے ہونے کے باوجود یکے بعد دیگرے مقتول ہوئے۔ بالآخر روس کی ایک لاکھ باقاعدہ فوج افغانستان پر اپنے جدید ترین اسلحہ سے حملہ آور ہوئی اور کارمل کو اپنا گونیہ لنگ بنا کر وسط ایشیا کے دوسرے ممالک کی طرح اس ملک سے بھی اسلام کی بیخ کنی کرنے لگی۔

یہ اس سفر نامے کا عبرتناک تتمہ ہے جس کا آغاز روس یا تہرا کے شوق بے پایاں سے ہوا تھا۔ شاہ محمود خان روسی زبان پر بھی عبور رکھتے ہیں اور انہوں نے اس سپر پاور کے حالات کا مطالعہ چھ سال تک بہت قریب کیا ہے۔ انقلاب روس کی پہلی حکومت جس محل میں قائم ہوئی اس کے عجائب گھر کی دتا دیندوں نے ان پر منکشف کیا کہ اس حکومت کا پہلا صدر ایک انتہا پسند یہودی تھا۔ وزیر اعظم لینن کی بیوی بھی یہودی تھی۔ اس حکومت کی اولین پارلیمنٹ کے ۵۴ میں سے ۴۴ ارکان یہودی تھے اور دستور ساز مجلس کے سربراہ بھی یہودی تھا۔ یہ حقائق سرخ سامراج کی مسلم دشمنی کے اسباب پر معنی خیز روشنی ڈالنے والے ہیں۔



اس سیاسی پس منظر میں روس کی کچلی ہوئی مسلمان اقلیت کی اسلام سے والہانہ عقیدت ایک معجزے سے کم نہیں۔ یہ بد نصیب اقلیت اپنی حالت کو بدترین غلامی سے تعبیر کرتی ہے اور اس دن کی منتظر ہے جب اسلام دنیا پر غالب آجائے گا اور غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ اس اندھیرے میں افغان قوم کی سرفروشانہ جدوجہد سے روشنی کی ایک کرن پھوٹی ہے جسے روس کا ہولناک جنگی ساز و سامان ظلمت کے دینر پردوں میں چھپانے کی دیوانہ وار کوشش کر رہا ہے، کون کہہ سکتا ہے قدرت کو کیا منظور ہے !!

آخر میں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہمارے ایک رفیق جناب عبدالہادی احمد صاحب نے اس کتاب کی زبان درست کرنے اور اسے حسین پیرائے میں پیش کرنے میں غیر معمولی محنت سرانجام دی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

## پہلا باب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### آغازِ سفر

ستمبر ۱۹۷۱ء کی بات ہے، افغان حکومت نے پولی ٹیکنیک انسٹیٹیوٹ کابل کے ۲۱ فارغ التحصیل طلبہ کو روس میں اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دیے۔ منتخب ہونے والوں میں میرا نام بھی شامل تھا۔ یہ وہ دور تھا جب کابل یونیورسٹی میں روس کی معاونت سے چلنے والی سولسٹ تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ روس جانے کے لیے ایسے طلبہ کو ترجیح دی جاتی تھی جن کا کمیونسٹ پارٹی "خلق" یا "پرچم" سے تعلق ہوتا تھا۔ ہمارے کچھ ساتھی اہم سیاسی اور حکومتی شخصیات سے تعلق کی بنا پر چنے گئے، لیکن اکثریت ایسے طلبہ کی تھی جو قومی اور ملی اقدار کی مخالفت کا خصوصی "اقتیاز" رکھتے تھے۔ ان کا تعلق ایسے گھرانوں سے تھا جو اسلام کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ملک کی غریبی پر شرمندہ رہتے اور نماز پڑھنے کو رجعت پسندی خیال کرتے تھے۔

اگرچہ کابل یونیورسٹی کی غالب اکثریت راسخ العقیدہ مسلمان طلبہ پر مشتمل تھی، لیکن تخت شاہی الحادزدہ اقلیت کا حامی اور پشت پناہ تھا، چنانچہ اعلیٰ تعلیم کے لیے صرف ایسے لڑکوں کو منتخب کیا جاتا تھا، جن کے بارے میں یقین ہو جاتا کہ ان میں مذہب کے "جراثیم" نہیں ہیں۔ روس جانے والے طلبہ کے نام آخری منظوری کے لیے روسی سفارت خانے بھیجے جاتے تھے۔ وہاں سے "پسندیدہ" ناموں ہی کی منظوری ملتی تھی۔ پھر بھی کچھ لڑکے ایسے ہوتے تھے جن کو ہلکت



اور امتیازی نمبروں کی وجہ سے نظر انداز نہ کرنا دشوار ہوتا تھا۔ کم از کم میرے ساتھ یہی معاملہ ہوا۔ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مجھے خالصتاً میرٹ کی بنیاد پر منتخب کیا گیا۔

روس جانے سے پہلے روس کے بارے میں میری معلومات دوستوں کی متضاد آراء پر مشتمل تھیں۔ کچھ لوگ اس سفر کو ہمارے لیے باعثِ سعادت خیال کرتے تھے۔ ان کے خیال میں ہم خوش قسمت تھے جو ”سرخ جت“ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے جا رہے تھے۔ یہ سوچ روسی لابی کے لوگوں کی تھی، مگر اپنی جگہ وقعت رکھتی تھی، اس لیے کہ ان میں سے کچھ خود روس سے ہو کر آئے تھے۔ بعض دوست بالکل مختلف تصویر دکھاتے تھے۔ وہ روسی معاشرے کو تہذیب و انسانیت سے غاری قرار دیتے تھے جہاں انسان کو بوجھ لادینے والے جانور کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ مجھے اکثر تلقین کرتے کہ میں وہاں نہ جاؤں، ورنہ اپنے دین و مذہب اور تہذیب و تمدن سے بیگانہ ہو جاؤں گا۔ میں اُن سے کہتا تھا کہ مجھے وہاں جانے دیں، تاکہ اُن کے دعوے کی تصدیق یا تکذیب کر سکوں۔ سچی بات تو ہے کہ روس یا توہمہ کا شوق اتنا غالب آچکا تھا کہ ہم نے روس کی مخالفت میں بولنے والوں کی بات پر کان دھرنا ہی چھوڑ دیا اور زیادہ وقت ان لوگوں کے ساتھ گزارنے لگے جو ہمیں روس کے متعلق افسانوں سے بھی زیادہ دلفریب باتیں سنایا کرتے تھے۔

### روس براستہ لنڈا بازار

روس جانے والوں میں سے اکثر امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے وہ سفر کی تیاری کا خصوصی اہتمام کر رہے تھے۔ کابل کے بازاروں میں موجود تعیش کی تمام چیزیں جمع کی جا رہی تھیں۔ کچھ لوگ لنڈا بازار میں امریکی اور انگریزی ”ملبوسات“ خرید رہے تھے۔ ایک روز میری ملاقات اپنے ایک ”ہوٹے والے“ ہم سفر سید حسن سے ہوئی۔ انہوں نے مجھے ایک بہت بڑا سوٹ کیس کھول کر دکھایا جو امریکہ اور جاپان کی پرانی اور نئی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ میرے پوچھنے پر کہنے

۱۔ پرانے کپڑے اور دیگر پرانا سامان فروخت کرنے والوں کا بازار مراد ہے۔ لاہور میں یہ بازار اسی نام سے مشہور ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ پہلے اس بازار میں ایک عمارت بھی دو منزلہ نہ تھی۔ (ادارہ)



گئے :

”روس کے لیے زار راہ تیار کر رہا ہوں۔ ذرا دیکھنا کوئی چیز کم تو نہیں!“  
میں اتنا بوجھ اٹھانے کے حق میں نہ تھا، اس لیے قدرے بے نیازی سے کہا :  
”بھئی اتنا بوجھ کیوں اٹھا کر رہے ہو؟ میں نے تو کچھ نہیں خریدا۔“

انہیں میری بات کا اعتبار نہ آیا۔ کہنے لگے :

”یار، کیوں بنا رہے ہو۔ بھلا ممکن ہے کوئی شخص روس جا رہا ہو اور خریداری نہ کرے!“  
میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہم روس جا رہے ہیں، جہاں ان چیزوں کی فراوانی  
ہوگی اور سستی ملیں گی۔“ انہوں نے میری دلیل کا مذاق اڑاتے ہوئے نہایت پرمغز لیکچر دیا جس کا  
خلاصہ کچھ یوں تھا :

”روس ایک اشتراکی ملک ہے جہاں لینن کے اصولوں کے مطابق بھاری مشینری اور اسلحے  
کی صنعتیں لگائی گئی ہیں۔ سامانِ تعیش تو وہاں تیار نہیں ہوتا۔ روزمرہ اشیاء کی بے حد کمی ہے۔ پھر  
ہیں یہ بات بھی نگاہ میں رکھنی چاہئے کہ ہمیں جو وظیفہ ملے گا، وہ بہت کم ہوگا۔ اس میں اشیائے  
ضرورت خریدنے کی قطعی گنجائش نہ ہوگی۔“

سید حسن کی باتوں نے مجھے قائل کر دیا؛ چنانچہ اگلے روز میں نے بازار کا رخ کیا۔ چند جوڑے  
کپڑے، قلم، صابن اور کچھ دوسری چیزیں خرید لیں۔ میرے کچھ ساتھی تو کابل کے پورے کسٹری  
بازار کو روس منتقل کرنا چاہتے تھے۔ وہ روزانہ بازار جاتے اور امریکی پتلونیں اور کوٹ خریدتے  
ان کا خیال تھا کہ جب روس پہنچیں گے، تو یہی لنڈے کی چیزیں وہاں سونے کے بھاؤ بکیں گی۔  
ہمارے چند بھائی روس سے کچھ ادھر ہی قسم کی توقعات وابستہ کیے بیٹھے تھے۔ ان کا  
خیال تھا روس میں انہیں اتنا بھاری وظیفہ بھی ملے گا جو ان کے اور ان کے اہل خانہ کے تمام  
معاشی مسائل حل کر دے گا۔ روانگی سے دو روز پہلے ایسے ہی ایک صاحب کے گھر جانا  
ہوا۔ ان کے والد صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو بات بات پر اپنی تنگ دستی کا رونا روتے  
اور اپنے بیٹے کے روس کے سفر کو اپنے معاشی مسائل کا حل قرار دیتے تھے۔ ان کا بیٹا بھی اتنا  
خوش فہم تھا کہ اپنے والد کو یقین دلارہا تھا کہ روس پہنچ کر وہ ان کے نام مئی آرڈر بھیجنا شروع



کر دے گا۔ اس کا خیال تھا کہ روس میں اسے آنا وظیفہ مل جائے گا جس سے وہ اپنا گزارہ کرنے کے علاوہ اپنے والدین کو بھی معقول رقم بھیج سکے گا۔

## الوداع میری دلنواز وادیوں!

یہ ستمبر کی ایک صبح تھی۔ کابل کے ہوائی اڈے پر اعزہ و اقارب نے ہیں پُریم آنکھوں سے رخصت کیا۔ افغانستان کی قومی فضائی کمپنی ”آریانہ“ کے جہاز نے شمال مغرب میں ہماری منزل کی طرف بڑھنا شروع کیا تو میرے تصورات کی پرواز بھی شروع ہو گئی۔ مشرق اور مغرب کے درمیان ایک جست کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ جہاز نے کابل شہر پر ایک چمک لگایا۔ شہر کی گلیاں اور مسجدوں کے مینار زبانِ حال سے یہ کہتے سنائی دے رہے تھے کہ ہمیں دیکھ لو، ہمارے سراپا کو نگاہوں میں بھر لو۔ شاید تم لوٹو تو ہم پر قرن بیت چکے ہوں۔ پھر کابل کے شمال میں ملگے پہاڑوں کی ترائیوں میں بستیوں کے نقش ابھرنے اور مٹنے لگے۔

فضا میں جا کر اس جغرافیائی حقیقت کا سراغ لگا کر افغانستان کی سرزمین سر بلند پہاڑوں اور عینق وادیوں سے پٹی ہوئی ہے۔ نرم ملائم انگوروں اور خوبانیوں کے باغوں سے ڈھکی ہوئی وادیاں اور ان کے اطراف میں ایستادہ پہاڑوں کا غیر ختم سلسلہ — ایسا لگتا تھا جیسے ان وادیوں میں دستِ قدرت نے دھینے چھپار کھے ہوں اور ان کو چاروں طرف سے فصیلوں سے محفوظ کر دیا ہو۔ ان وادیوں میں بستیاں تھیں، بستیوں میں گھر تھے، مسجدیں تھیں، راستے تھے، چراگاہیں تھیں اور مویشیوں کے ریوڑ اور گتے تھے۔ ہر چیز جنت نگاہ بن کر دل و دماغ کو مسح و کمرہ رہی تھی۔

میرے ہم سفر اپنی اپنی دھن میں مست تھے۔ بعض ایک دوسرے سے محو گفتگو اور کچھ خوابوں اور سرابوں میں ڈوبے ہوئے۔ جن کی نظریاتی وابستگی روس سے تھی وہ پرجوش تھے، ان کے چہرے شاداب تھے۔ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان کر رمز و کنائے میں باتیں کر رہے تھے۔ وطن سے دور جانے کی اداسی کا ان کے چہروں پر نام و نشان تک نہ تھا۔ میرے لیے منظر قابلِ رشک نہ تھا۔ اس لیے میں نے جہاز سے پیچھے رہتی ہوئی سرزمین کو اکیلے



ہی الوداع کہا۔ الوداع میری دلتوانہ دادیو! الوداع میرے حسین وطن! اے

## سیکولر ہم سفر

میرے ساتھ والی نشست پر ۳۵، ۳۶ برس کا ایک افغان بیٹھا ہوا تھا۔ طور اطور سے کوئی نو دو تلیا معلوم ہو رہا تھا۔ جتنی دیر وہ خاموش بیٹھا رہا، عافیت رہی مگر جب اُس نے بولنا شروع کیا تو رے کے بغیر بولتا رہا۔ میرے لیے اس کے ہر سوال کا جواب دینا مشکل ہو گیا۔ ہر موضوع پر بے تکان گفتگو کی۔ میں نے کئی بار ہوں ہاں کر کے ٹالنے کی کوشش کی، مگر وہ جب مجھے خاموش پاتا تو ٹھہکا کر دے کہ کہتا :

”سو گئے؟“ سنیے میں کیا کہہ رہا ہوں.....!“

موسیقی کے بارے میں میری رائے پوچھی۔ جب معلوم ہوا کہ اس جانب اس سلسلے میں کوئی ذوق نہیں تو خاصے ناراض ہو کر مجھ پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے یوں فہمائش کی :

”کتنی بد نصیبی کی بات ہے کہ دنیا خلاؤں میں پروانہ نہ رہی ہے، مگر ہم ابھی تک اپنے دنیائے سبت میں محصور ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ موسیقی روح کی غذا ہے!“

اس کے بعد موصوف نے فنِ موسیقی پر طویل لیکچر دیا۔ آلاتِ موسیقی کے بارے میں معلومات ہم پہنچائیں۔ یہ بتایا کہ کابل ریڈیو کے تمام فنکار اور گلوکار اس کے قریبی دوست ہیں۔ کچھ گانے والوں اور گانے والیوں کے نام لیے۔ اس کے بعد پشتو گانے اور موسیقی کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا کہ تختونوں کو موسیقی جیسے فنِ لطیف سے کوئی تعلق نہیں۔ پختون جہالت اور پسماندگی کے شکار ہیں۔ آخر میں تان اس پر ٹوٹی کہ ہماری قوم کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہب ہے، چونکہ پختون ابھی تک مذہب سے چمٹے ہوئے ہیں اس لیے وہ ترقی نہیں کر سکتے۔

میں اس کی بات پر حیران ہوا، اس سے پوچھا، کیا وہ مذہب پر یقین نہیں رکھتا؟ تو اس نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا !

”نہیں، میں سیکولر ہوں۔ مذہب تو رجعت پسندوں کا ڈھونگ ہے۔“



اس کے بعد کچھ دیر تک میں اس کے سوالوں کے جواب میں ہوں ہاں کہہتا رہا، لیکن آخر ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ میں اپنی رجعت پسندی پر شرمندہ نہ ہو سکا وہ اپنی "ترقی پسندی" کے آسمان سے کیسے اترتا۔! تھوڑی دیر کے بعد جہاز نے دریائے آمو کو پار کر لیا۔ مذہب اور سیکولرزم کے درمیان ہل کھاتی ہوئی آبی زنجیر پیچھے رہ گئی۔ اب میں "ترقی پسندوں" کے دیس میں پہنچ گیا تھا۔ نگاہوں کے سامنے منظر تبدیل ہو گئے۔ جہاز سے نیچے کی زندگی نہایت منظم نظر آنے لگی تھی۔ قدرتی رنگوں میں تصنع کی ملاوٹ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

### پہلا منظر

تھوڑی دیر میں تاشقند کے ہوائی اڈے پر اترے۔ دل نے کہا یہ اپنی سرزمین ہے۔ اپنی تاریخ کا دفن، مگر ہوائی اڈے سے قیام گاہ تک ہمیں چاروں جانب سے اجنبی چہروں نے گھیرے رکھا۔ ہوائی اڈے سے باہر دیکھا، افغانوں سے ملتے جلتے چہرے، دلکش خدو خال والے لوگ دکھائی دیے۔ مردوں کے سروں پر ٹوپیاں تھیں جبکہ اکثر عورتیں بے پردہ تھیں، مگر تھیں شلوار قمیص ہیں۔ سبھی مرد، سبھی عورتیں ایک جیسا لباس پہنے ہوئے، مجھے تو ان کے چہروں سے یوں لگا جیسے وہ مشینی ردبوٹ ہوں، جو دوسروں کے لیے مفید ہوتے ہیں، مگر خود کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ میرے ایک ترقی پسند ساتھی نے میرا شانہ دبا یا :

”دیکھو غریب اور امیر سبھی ایک سا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اب ان کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہا“

ہم دونوں ہم وطنوں کی سوچ کتنی مختلف تھی۔ میں نے اختلاف کا اظہار کر ہی دیا :

”مگر یہ بھی تو دیکھو ابھی تک یہاں کی عورتیں مشرقی وضع قطع کا لباس پہنے ہوئے ہیں“

میرے ہم سفر کے لہجے میں تلخی گھل گئی : ”خدا کی پھٹکار ہو ان پر جو ابھی تک فرسودہ قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ انقلابی قوتوں نے انہیں جہالت کی دلدل سے نکالنے کی بہت کوشش کی، یہ اپنی بوڑھی ہندیب کو مقدس سمجھتے ہیں“

میں بحث کو طول نہ دینا چاہتا تھا اس لیے خاموش ہو گیا۔ آئندہ برسوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ روس کے محکوم مسلمان اپنے ملی تشخص کی بقا کے لیے کتنی سخت جدوجہد کر رہے ہیں۔

ہوا کہ روس کے محکوم مسلمان اپنے ملی تشخص کی بقا کے لیے کتنی سخت جدوجہد کر رہے ہیں۔



کھڑے ہیں۔

## اندر سے رجعت پسند

دوپہر کے کھانے کے لیے بلاوا آیا۔ میز پر جمع ہوئے تو ایک مسئلہ آن کھڑا ہوا حلال اور حرام کا۔ انواع و اقسام کے کھانے تھے، مگر ہر ڈش میں گوشت کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا، تاہم ساتھیوں کو اس پر تکلف دعوت میں شریک ہو کر کوئی خاص خوشی نہ ہوئی تھی۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ گوشت مردار ہوگا، خنزیر کا بھی ہو سکتا ہے اور ذبح بھی غیر اسلامی طریقے سے کیا جاتا ہے۔ میں نے اس مسئلے کا حل یہ سوچا کہ خشک روٹی چبانے لگا۔ ایک صاحب نے زیادہ حاضر دماغی کا ثبوت دیا، مجھنی ہوئی مچھلی سے رجوع کیا کہ وہ ہر حال میں اور ہر مقام پر حلال ہوتی ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے مچھلی کی قابیں خالی ہو گئیں۔ اس موقع پر میرے جلیے حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے وہ ہم سفر جو خود کو سیکولر اور کمیونسٹ کہتے تھے، گوشت کے مسئلے پر شرعی اور غیر شرعی طریقوں کے نہ صرف قائل نکلے، بلکہ انہوں نے مشکوک کھانوں کی طرف نگاہ تک نہ اٹھائی، مچھلی، مکھن اور چائے تک محدود رہے۔ یوں "ترقی پسند" بھی اندر سے "رجعت پسند" نکلے۔ ہوٹل سے باہر نکلے تو میں نے باہر لان کے قریب پانی کا نل دیکھ کر اپنے ساتھیوں کو توجہ دلائی کہ یہاں وضو کر کے ظہر کی نماز ادا کر لی جائے، لیکن انہوں نے مجھے یوں گھورا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کر دی ہو۔ ان کی تہدیدیں نظریں مجھے بتا رہی تھیں کہ حرام گوشت نہ کھانے کا یہ مطلب نہ لو کہ ہم نماز کے بھی قائل ہو گئے۔ پھر یہ روس کی سرزمین ہے جہاں انسان کا سر صرف انسان کی عظمت کے آگے جھکتا ہے، خدا کی عبادت یہاں پسندیدہ کام نہیں ہے۔

تاشقند سے ہمیں امریکی ساخت کے بوئنگ ۷۰۷ سے اتر کر روسی ساخت کے ٹی یو ۴۴ طیارے میں بیٹھنا پڑا۔ ماسکو تک کا سفر بہت تیز رفتاری سے طے ہوا۔ معلوم ہوا ٹی یو طیارے اڑھائی ہزار کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے اڑ سکتے ہیں، اس تیز رفتاری کی غایت شاید یہ بھی تھی کہ مسافر اس کی سیٹوں کے درمیان تنگ فاصلے کی تکلیف کم سے کم وقت برداشت کریں۔ آگے پیچھے قطاروں کے بیچ میں فاصلہ اتنا کم تھا کہ میں ٹانگیں سکڑ کر بیٹھا رہا اور



دعا مانگتا رہا کہ جلد سے جلد سفر کرے۔ میرے دوسرے ساتھیوں کا بھی یہی حال تھا۔ میرے تو جسم میں ٹیسس اٹھنے لگیں۔

سورج غروب ہوا تو ماسکو کی حدود میں داخل ہوئے، مگر ہوائی اڈے پر اترنے کے لیے ہمیں طویل انتظار کرنا پڑا۔ اتنی دیر میں پورا شہر تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ ہمیں کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ ہم کون سے ہوائی اڈے پر اترے۔ واضح ہو کہ ماسکو کے متعدد فوجی اور سول ہوائی مستقر ہیں، شہر پر طائرانہ نگاہ بھی نہ ڈالی جاسکی۔ یوں تو لاکھوں برقی قمقمے روشن تھے، لیکن یہ اہتمام تاریکی کے احساس کو ختم نہ کر سکا۔ طویل سفر سے ہماری حالت خستہ ہو چکی تھی۔ اکثر ساتھیوں کی طرح میرا سر بھی چکرا رہا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی راستے بھر تلی کی تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد بے ہوش پڑے تھے۔ انہیں سٹرچر کے ذریعے جہاز سے اتار لیا گیا۔

### ہتھوڑے اور درانتی کے دیس ہیں

ہوائی اڈے کے باہر روشنیوں کا ہجوم تھا۔ ہر سو بڑے بڑے سائے بورڈ اور نیون سائے جگمگا رہے تھے۔ سرخ رنگ کی قد آدم تصویریں، سرخ لباس میں لپٹے ہوئے نعرے اور ماٹو اور سرخ ہی رنگ کے پرچم تیار ہے تھے کہ ہم سرخ انقلاب کے ملک میں پہنچ چکے ہیں۔ روشنیوں کی چمکا چوند میں ہوائی اڈے کی عمارتیں بڑی خوش نما اور چمکدار لگ رہی تھیں۔

لیبارے سے باہر نکلے تو سرد ہوانے ہمارا استقبال کیا۔ کابل میں ستمبر کے دنوں میں برائے نام خنکی ہوتی ہے۔ صبح جب ہم چلے تھے تو کوئی گرم کپڑا پہنانا اڑھا، مگر اب حالت یہ تھی کہ آرام گاہ تک پہنچتے پہنچتے سردی سے دانت بجنے لگے۔ سبھی نے کبل کھول کر اڑھ لیے۔ سردی کے بعد ایک اور مصیبت ہماری منتظر تھی۔ ہوائی اڈے کی انتظار گاہ میں کوئی ہمارے استقبال کو موجود نہ تھا۔ استقبال کی زیادہ فکر نہ تھی، اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہم کسی رہنما کے بغیر ہوائی اڈے سے باہر نکل ہی نہ سکتے تھے۔ ہمیں تو اپنی قیام گاہ بھی معلوم نہ تھی اور نہ عملاً اس کو تلاش کرنے کے اہل تھے۔ روس میں کوئی شخص آزاد مرضی سے کسی ہوٹل میں قیام نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے ایک خصوصی دفتر سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ روسی شہری بھی اس پابندی



مستثنیٰ نہیں، ہم تو ایک غیر ملک کے لوگ تھے۔

ہم اتنی دیر تک اپنے میزبانوں کے منتظر رہے کہ چارے کے دوسرے تمام سفر اپنی اپنی منزلوں کی طرف چلے گئے۔ مارے سردی کے برا حال تھا۔ باہر سے آنے والے ہر شخص کو ہم اپنا رہنما خیال کرتے، مگر وہ اپنی دھن میں مست دوسری طرف چلا جاتا تو ہم پھر باہر دیکھنے لگتے۔ رات گزرتی جا رہی تھی، ہماری مایوسی انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ باہر ایک موٹر گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ پھر انتظار گاہ کا دروازہ کھلا۔ ایک صاحب اندر آئے۔ یہی انداز میں تعارف کرانے کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ ہمیں ہماری منزل تک پہنچانے آئے ہیں۔ ہم ان سے پوچھنا چاہتے تھے کہ اس تاخیر کا کیا سبب تھا؟ مگر اپنے میزبان کی سرد مہری دیکھ کر ہمت نہ ہوئی۔ باہر آئے، کئی موٹریں ہمیں لینے آئی تھیں۔ باہر کی سرد ہوا کے مقابلے میں گاڑی کا ماحول بہت آرام دہ تھا۔ اس وقت مجھے ”دریہ آید درست آید“ کا صحیح مفہوم معلوم ہوا۔ گاڑی بلند و بالا عمارتوں کے درمیان کشادہ سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک فلک بوس عمارت کے سامنے میں ہمیں اترنے کے لیے کہا گیا۔ ہمارے میزبان کی ٹھٹھری ہوئی مسکراہٹ بھی مزہ دے رہی تھی۔ عمارت کیا تھی، روس کی ترقی کا اظہار تھی، تاکہ پہلے ہی مرحلے پر ہمارے سر اشتراکیت کی ”عظمت“ کے سامنے جھک جائیں۔ یہ حسین بلند و بالا اور کشادہ عمارت روس کی مشہور یونیورسٹی فامی کے ہاسٹل کی تھی۔ اس کی تعمیر ایسی مہارت سے کی گئی ہے کہ دور سے دیکھنے والے کو یہ ایک بہت بڑی اور کھلی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے میزبان ہمیں یہ بتا کر رخصت ہوئے کہ آپ کے قیام کا انتظام اسی عمارت کی پندرہویں اور سولہویں منزل میں کیا گیا ہے۔

سبک رفتار لفٹوں نے ہمیں اپنی قیام گاہوں تک پہنچا دیا۔ ہر کمرے میں دو آدمیوں کے رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ کمرے میں بستر، کبل اور ضروریات کی چیزیں موجود تھیں۔ نرم بستر دیکھ کر طبیعت لپجائی، میں اپنے ساتھی کا انتظار کیے بغیر ہی لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میرا ساتھی بھی آگیا۔ اُس نے بھی بستر پر لیٹنے کو سب سے بڑی آسائش سمجھا۔ کچھ دیر سنانے کے بعد ہم دوسرے ساتھیوں کو دیکھنے کے لیے باہر نکلے۔ ہر ایک کو بھوک کا تذکرہ کرتے پایا۔ یہی



طلب تھی۔ انسان بہت ناشکر ہے، کسی ایک آسائش پر کبھی قناعت نہیں کرتا۔ اب کھانا کھلانے والے میزبان کی تلاش ہوئی، مگر یہ تلاش بے سود ثابت ہوئی۔

### پرائے دیس میں اپنے

جو لوگ افغانوں کے رہن سہن سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ چائے ہمارے معاشرے کا ایک اہم ”ستون“ ہے۔ ایک دو وقت کھانا نہ بھی ملے تو ہم صبر کر سکتے ہیں، لیکن چائے سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ جب کھانے کا انتظام نہ ہو سکا تو چائے کا کیا ہوتا، مگر مجھے خوش قسمتی سے اس نعمت غیر مترقبہ سے زیادہ دیر تک جدائی نہ پہنی پڑی۔ میرے کمرے سے متصل کمرے میں ایک افغان جوڑا مقیم تھا۔ خاتون سر پہ سرخ رومال باندھے ہوئے کوریڈور سے گزریں تو ان کی نظر ہم دوساتھیوں پر پڑ گئی۔ ہم خستہ حال تو تھے، مگر اپنے خدوخال سے پہچانے گئے، وہ ہماری خیر خبر پوچھنے آئیں، تو جاتے ہوئے چائے کی دعوت دے گئیں۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو شاید ہم تکلف کرتے، مگر اس وقت ہمیں یہ دعوت تائیدِ غیبی معلوم ہوئی۔

ابھی ہم تیار بھی نہ ہوئے تھے کہ خاتون کے شوہر ہمیں لینے آ گئے۔ ان کا نام زیور خان تھا۔ دونوں میاں بیوی پی اتچ ڈی کرنے آئے ہوئے تھے۔ زیور خان نے قرائن سے معلوم کر لیا کہ ہم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا، لہذا ہمیں روس کی سسر بہن پر افغان چائے کی عشرت سے پہلے کھانے کا لطف بھی حاصل ہو گیا۔

زیور خان اور ان کی بیگم نے ہمیں روس کے بارے میں بیش قیمت معلومات بہم پہنچائیں۔ انہوں نے ہمیں نصیحت کی کہ خود کو صرف تعلیم تک محدود رکھیں۔ اپنے آپ کو ان ترغیبات سے دور رکھیں جو روس کے ہر مسافر کا دامن بکڑھیتی ہیں۔ اس وقت تو یہ نصیحت ہماری سمجھ میں نہ آ سکی، لیکن آنے والے دور میں ہمیں قدم قدم پر یہ بات یاد آتی رہی۔ رات گئے تک تبادلہ خیالات کے بعد اجازت ملی اور ہم اپنے کمرے میں پہنچے اور ایسے بے سدھ ہو کر سوئے کہ صبح دیر سے آنکھ کھلی۔

اٹھنے پر ہم نے فیصلہ کیا کہ خدا کے حضور سربسجود ہو کر اس سے اپنی زندگی کے نئے سفر



میں رہنائی کی دعا کروں، مگر عجیب مقام تھا، جہاں قبلے کی سمت کسی کو معلوم نہ تھی۔ سورج کچھ سمتوں سے اندازہ لگا کر خدا کے دربار میں حاضر ہو گیا۔ اس موقع پر قرآن پاک کا یہ ارشاد خود بخود یاد آگیا :

”مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں۔ جس سمت تم پھرو گے خدا کو ادھر ہی پاؤ گے۔ اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے“ (بقرہ . ۱۱۵)

### کھانے کا صبر آزما انتظار

نماز کے بعد باہر نکلا۔ دوسرے ساتھیوں کے گروں میں گیا۔ رات کی نیند نے سب کو تھکن دُر کر دی تھی، لیکن رات کو اکثر لوگ بھوکے سوئے تھے اس لیے سب کھانے کی خواہش رکھتے تھے۔ جب سہم یہاں آئے تھے کسی نے ہمیں پوچھ کر نہ دیا تھا۔ اس ملک کے طور طریقے ابھی تک ہماری سمجھ میں نہ آ سکے تھے۔ ہماری بے قراری بڑھ رہی تھی۔ ہمارے جو ساتھی پہلے بھی ”سرخ جنت“ کے مزے لوٹ چکے تھے، ہمارے حوصلے بڑھ رہے تھے کہ اتنے بے صبر بھی نہ بنو، صبر کرو کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

ایک صاحب جو گزشتہ ایک روز میں سوشلزم پر کئی بار لیکچر دے چکے تھے، کہنے لگے : ”اشتراکی ملک میں سرمایہ دار ملکوں جیسی عیاشی کی امید تو نہ رکھو کہ آنکھ بعد میں کھلتی ہے صاحب کے لیے چائے پہلے آجاتی ہے۔ یہاں سب لوگ صبح آٹھ بجے کام پر جاتے ہیں۔ ہوٹل بھی آٹھ بجے سے پہلے نہیں کھلتے۔ آٹھ بجے تک انتظار کرو، کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا“

ہم منہ اندھیرے ناشتہ کرنے والے لوگ ”سرمایہ داری“ کا الزام اپنے سر لینے کو بخوشی تیار تھے۔ خصوصاً وہ لوگ جو رات کے بھوکے تھے خاصے مضطرب تھے۔ آخر ہم سے آٹھ بجے کا انتظار بھی نہ ہو سکا۔ ایک ایک کر کے نیچے اتارنے لگے۔ ہوٹل کے باہر اپنے میز بانوں کا انتظار کرنا زیادہ آسان معلوم ہوا۔ وہاں بے تابی سے ٹپٹے ہوئے ہم دل میں شرمابھی رہے تھے کہ دیکھنے والے کیا کہہ رہے ہوں گے! ہر شخص ہمیں اپنی طرف دیکھتا اور یہ کہتا سنائی دیتا تھا۔ کیوں! بارہ گھنٹے کی بھوک بھی نہ سہہ سکے۔ کیا علم کے پیاسوں کے یہی لچھن ہوتے ہیں!



سورج کی کہ میں زمین پر اتنے میں تو کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی ٹولیاں فٹ پاتھوں پر چلنے لگیں۔ ان کے چہرے کہ خست اور بے جان تھے۔

خدا خدا کر کے آٹھ بجے۔ سارے ساتھی ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ہم سب کسی لطیفہ غیبی کے منتظر تھے۔ انتظار کرنے والوں میں نوجوانوں کے علاوہ دو جہانگیرہ فضلہ بھی تھے۔ کابل یونیورسٹی کے پروفیسر آقائے وردگ جنہوں نے خارنوف یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا اور پی ایچ ڈی کرنے دوبارہ روس آئے تھے۔ ان کے علاوہ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کابل کے شعبہ تعلیم و تربیت کے سربراہ جناب فیض محمد بھی تشریف لائے تھے۔ ان کا ارادہ بھی ڈاکٹر کرنے کا تھا۔ دونوں استاد بھوک سے بے تاب نوجوانوں کے حوصلے بڑھاتے رہے۔ انہیں یقین تھا کہ ابھی کوئی نہ کوئی آجائے گا، مگر جب نو بج گئے تو ہم ان کی تسلی سے بھی مایوس ہو گئے۔ دس گیارہ۔ بالآخر بارہ بج گئے۔ ہم اپنی قیام گاہوں میں بیٹھے یہ سوچ رہے تھے کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں بھوکا مارنے کے لیے ہی بلایا گیا ہو! ہم جب دلاسہ دینے والوں کی طرف دیکھتے تو وہ بھی گھبرا کر نگاہیں دوسری طرف پھیر لیتے تھے۔ تنگ آکر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہوسٹل کے وارڈن کے پاس چلیں۔

وارڈن نے خاصی توجہ سے ہماری بات سنی اور تھوڑی سی رد و قدح کے بعد پارٹ کوم (مقامی کمیونسٹ پارٹی) اور رائی کوم (علاقائی کمیونسٹ پارٹی) کو ٹیلی فون پر ہماری پلٹا کہہ سنائی۔ وارڈن صاحب کو ہر دو مقامات سے حوصلہ شکن جواب ملا۔ وارڈن کو ہدایت کی گئی کہ وہ غیر متعلقہ باتوں کے لیے پارٹی کا وقت ضائع نہ کریں۔ اگر انہیں ہم (غیر ملکیوں) سے زیادہ ہمدردی ہے تو وزارتِ سیاحت یا وزارتِ خارجہ سے رابطہ قائم کریں۔

خدا جانے یہ وارڈن کی مساعیٰ جمیدہ کا نتیجہ تھا یا دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کا اثر، دو بجے کے قریب ایک افغان طالب علم حبیب الرحمان مجھ سے ملنے آیا۔ اس کا ایک بھائی جلال آباد میں میرا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ میں حبیب الرحمان سے غائبانہ طور پر پہلے ہی متعارف تھا۔ وہ بعد میں کابل یونیورسٹی فیکلٹی آف فارمیسی میں پروفیسر لگایا۔ ہم ایک دوسرے سے کیا ملے کہ وقت کا اہم مسئلہ یعنی بھوک نہن سے اتر گیا۔ اتنے میں کسی ساتھی نے باہر سے آواز دی :



”بارک ہو، کھانا کھلانے والے آپہنچے ہیں۔ باہر آ جاؤ، ہم سب ہوٹل جا رہے ہیں۔“  
میں نے حبیب الرحمان کو ساتھ لیا اور چل پڑا۔ ہاسٹل کے باہر گائیڈ نے ہمیں ٹھوس لہجے  
میں تنبیہ کی :

”نظم و ضبط سے پانچ پانچ کی ٹولیوں میں چلو۔ وہ سامنے کچھ ہی دور ہوٹل ہے، میں  
وہاں آپ لوگوں کا انتظار کروں گا۔“

یہ کہہ کر گائیڈ صاحب چلے گئے اور ہم ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ان کے بتائے  
ہوئے راستے پر چل پڑے۔ لڑکے بھوک سے اتنے بے تاب ہو رہے تھے کہ ہر ایک دوسرے  
سے آگے جانا چاہتا تھا، مگر حبیب الرحمان نے ہمیں صبر و ضبط کی تلقین کی۔ چند منٹ کے بعد  
ہم ہوٹل کے برآمدے میں اپنے گائیڈ سے ملے۔

دروازے پر ہم سب کو ایک ایک قرطاس طعام تھا یا گیا جس پر ”یاک“ لکھا ہوا تھا۔  
حبیب الرحمان نے ہمیں سمجھایا کہ روس میں ہر کام منظم انداز میں ہوتا ہے۔ ”یاک“ کی تیاری میں  
وقت لگتا ہے۔ اس نے کہا :

”اپنے پر مٹ (قرطاس طعام) سنبھال کر رکھنا۔ جس کے پاس یہ نہ ہوگا، اسے کھانا  
نہیں ملے گا۔“

ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بڑی بڑی میز پر کھانا پہلے ہی سے چنا ہوا تھا۔ خشک  
روٹی، مکھن، چائے اور چینی کے علاوہ کوئی دوسری چیز موجود نہ تھی، مگر یہ دعوت اس وقت  
بادشاہوں کی ضیافتوں سے بڑھ کر معلوم ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں کھانا کم تھا یا کھانے والوں نے  
کچھ زیادہ سرعت دکھائی، چند منٹوں میں میز پر صاف ہو چکی تھیں۔ دیکھنے والوں کو ہمارے  
نزدیکے پن پر ہنسی تو آئی ہوگی، مگر بھوک نے ہمارے احساسِ ندامت کو خاصا کم کر دیا تھا۔ ابھی ہم وہیں  
بیٹھے تھے کہ گائیڈ آگیا۔ اس نے ہمیں حکم دیا :

”تمام برتن مقررہ جگہوں پر رکھ دو اور باہر چلے جاؤ۔“

ناچار حکم کی تعمیل کی اور گائیڈ کے ہمراہ باہر آئے۔ راستے میں ایک دوسرے صاحب ہمارے  
گائیڈ سے آئے۔ ان کے درمیان شاید روسی زبان میں کوئی خفیہ بات چیت ہوئی۔ اس کے



بعد نووارد ہماری طرف آیا۔ اس نے ہماری خیریت دریافت کی۔ پھر دیر سے آنے پر اظہارِ ندامت کیا۔ ہمیں تب معلوم ہوا کہ ہماری رہنمائی کا فریضہ انہیں سونپا گیا تھا، لیکن وہ تقریباً سولہ گھنٹے کی تاخیر سے ہم تک پہنچ سکے تھے۔ نئے گائیڈ نے کام کی زیادتی کا رونا رویا اور بتایا کہ دنیا کے کونے کونے سے طلبہ آئے ہوئے ہیں۔ ان سب کی نگہداشت ایک مشکل کام ہے۔

## ناشتہ اور لنچ ایک ساتھ :

نئے گائیڈ نے ہمیں دوپہر کے کھانے کے لیے نئے قرطاس دیے۔ معلوم ہوا کہ ہم نے ابھی ابھی جو کھانا نوش جان کیا تھا، وہ صبح کا ناشتہ تھا۔ دوپہر کا طعام ابھی ہمارے میزبانوں پر قرض تھا۔ رات کو دوبارہ بھوکا رہ جانے کے خوف نے ہمیں یہ پیش کش قبول کر لینے پر آمادہ کر دیا۔ چند منٹ بعد ہم دوبارہ ہوٹل میں داخل ہو چکے تھے۔ اس بار ہمیں پلیٹیں ہاتھ میں تھادی گئیں اور قطار میں چلتے ہوئے اپنا کھانا خود نکال کر میزوں پر جانے کی ہدایت دی گئی۔ ہال کے ایک کونے میں بڑے بڑے برتنوں میں مختلف قسم کے کھانے موجود تھے۔ گوشت کے مختلف شوربے اور قورے سبزی اور روٹی وغیرہ۔ ہر شخص اپنی پلیٹ میں ضرورت کے مطابق کھانا نکالتا اور آگے بڑھتا جاتا تھا۔ میز پر پہنچنے سے پہلے ایک خاتون کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ وہ ہماری پلیٹیں دیکھ کر اطمینان کر لیتی کہ ایسا کھانا ڈال لیا گیا ہو جس کی قیمت قرطاس طعام میں دی گئی قیمت سے زیادہ ہو۔ اگر کسی نے زیادہ ہاتھ دکھائے بھی تو ناکام رہا۔ منتظم فوراً اٹھتی، پلیٹ کو برتن میں الٹ کر اشارہ کرتی، فلاں برتن سے لے لو، تاکہ قیمت کی حد نہ ٹوٹے۔ اس پابندی نے خاصا پریشان کیا۔

کھانے کی میز پر پہنچے، تو پرانی بحث پھر چھڑ گئی۔ گوشت کھایا جائے یا چھوڑ دیا جائے، بعض ساتھیوں نے صرف سبزی پر قناعت کی تھی، جو گوشت لے آئے تھے، ان کا موقف یہ تھا کہ اگر روس میں حرام حلال کی تمیز کی گئی تو زندہ کیسے رہیں گے۔ ایک "ترقی پسند" نے یہ کہہ کر گوشت کے شوربے سے رجوع کر لیا :

"یہ بہر حال گوشت ہے، جس چیز کا ہو صحت بخش ضرور ہو گا۔"



چوبیس گھنٹے پہلے تاشقند میں جو چیز سب کے لیے حرام تھی، ماسکو پہنچ کر ”حلال“ ہو گئی۔ میں نے سبزی پر اکتفا کیا۔ اگلے روز میں افغان سفارت خانے جانے کی ہدایت ملی۔ ان دنوں ماسکو میں ظاہر شاہ حکومت کے سفیر جنرل عارف تھے۔ جنرل صاحب نے رسمی انداز میں تقریر کی۔ ہمیں روس میں ہماری ذمہ داریوں سے آگاہ کیا اور کہا: ”آپ لوگ یہاں اپنے ملک کے سفیر بن کر آئے ہیں، اپنے ملک کی بھرپور نمائندگی کریں“ انہوں نے یقین دہانی کرائی کہ سفارت خانہ ہر شکل میں ہماری رہنمائی کرے گا۔ سفارت خانے کے کلچرل اتاشی نے ہمیں انصاف مقامات و منازل سے آگاہ کیا جہاں ہمیں اپنے کورس مکمل کرنے تھے۔

## ماسکو کی ایک جھلک

روس کا دار الحکومت ماسکو بہت خوبصورت شہر ہے۔ آٹھ سو برس پرانی تاریخ رکھنے والے اس عظیم الشان شہر کی فلک بوس عمارتیں اور خوبصورت باغات اور پارک قدرتی اور مصنوعی حسن کے جیل امتزاج کا عکس پیش کرتے ہیں۔ اس شہر کو مدتوں روس کا پایہ تخت رہنے کا فخر حاصل رہا۔ انقلاب اکتوبر (۱۹۱۷ء) میں ماسکو انقلابی کمیونسٹوں کا مرکز رہا۔ اگست ۱۹۴۱ء میں یہاں جرمنوں اور روسیوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں روسی فوج فتح یاب رہی۔ اس طرح ماسکو کو ”سہرے ستارے“ کے اعزاز اور لینن کے ”سیکٹڈ آرڈر“ نامی پرچم سے نوازا گیا۔

اسی لاکھ آبادی کے شہر میں پچاس کے قریب بڑے اور چھوٹے عجائب گھر موجود ہیں۔ عظیم الشان ہوٹل ہیں جن میں ”روسیا“ پورے یورپ میں سب سے بڑا ہے جس میں چھ ہزار مہمانوں کے قیام و طعام کا بندوبست ہے۔ سینما ہال اور اسپرہاؤس ہیں جن کا تعمیراتی حسن دل و نگاہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ شہر کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اتنی زیادہ آبادی کے باوجود کہیں بھی ہجوم دکھائی نہیں دیتا۔ بعض مقامات تو بالکل سناں نظر آتے ہیں۔ بٹرکوں پر ٹریفک کا وہ ہجوم نہیں ہوتا جو بڑے شہروں کا معمول ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ لوگوں کے پاس انفرادی گاڑیوں اور کاروں کی تعداد محدود ہے۔ کاریں زیادہ تر سرکاری افسر استعمال کرتے ہیں۔ عام مسافروں کی آمد و رفت کے لیے بسیں ہیں یا زیر زمین چلنے والی ریل میٹرو۔ آٹوبس، ٹرامیں اور ٹرلیاں بھی ہیں، لیکن



لوگ میٹرو کے سفر کو آرام دہ اور ارزاں ہونے کی وجہ سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میٹرو کے تقریباً ایک سو شیشوں کے ذریعے دور دراز کے علاقے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔

ماسکو میں قیام کے دوران ہمیں جن مختلف مقامات کی سیر کرائی گئی، ان میں ماسکو کی مشہور لومونوف یونیورسٹی بھی تھی۔ دریائے ماسکو کے کنارے وسیع اور پر شکوہ عمارتوں کا سلسلہ یورپی طرز تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ جب روسی کہتے ہیں کہ ماسکو میں سب کچھ اشتراکی منصوبے کے مطابق بنایا گیا ہے، تو کچھ غلط نہیں کہتے۔ ماسکو شہر میں جتنی بھی نئی عمارتیں بنی ہیں وہ ایک دوسری سے الگ تھلگ ہیں۔ رہائشی عمارتوں کے ایک ایک بلاک میں پچاس خاندانوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہر عمارت کے ساتھ ایک سرسبز و شاداب پارک بنایا گیا ہے جہاں گھاس کے ٹھیلیں تختوں کے علاوہ گہرے سبز رنگ کے درخت اور پودے جھومتے ہیں۔ ان پارکوں میں گھومنے پھرنے والوں کے لیے فٹ پاتھ، روشیں اور لکڑی کی کرسیاں ایسے سلیقے اور نفاست سے ترتیب دی گئی ہیں کہ چھونے سے میل ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ تفریح کے لیے دوسرے سامان بھی ہیں۔ سینما ہال، تھیٹر، ٹائٹ کلب اور رقص گاہیں کثرت سے ہیں۔ تفریح گاہوں میں زیادہ ہجوم نوجوانوں کا ہوتا ہے۔

### ہر سو سرخی

تیسرے روز ہمارے میزبان ہمیں سرخ چوگان (ریڈ سکوائر) دکھانے لے گئے۔ ۶۹۵ میٹر لمبائی اور ۱۳۰ میٹر (اوسطاً) چوڑائی رکھنے والے اس چوک سے کئی تاریخی یادیں وابستہ ہیں۔ ۱۶۷۱ء میں اسی مقام پر زار روس کے حکم پر باغی تحریک کے قائد سٹیفن رازین کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا پھر یہیں پر ۱۶۹۸ء میں پیٹر اول نے اپنی ٹہنی بہن شہزادی صوفیہ کے حامی فوجیوں کو سزائے موت دی۔ اسی مقام پر کمیونسٹوں نے خون ریز جنگ لڑی۔ اس لحاظ سے اس مقام کا نظارہ ہمارے لیے درس عبرت بھی تھا۔

زاروں کے عہد کے مظالم کو نمایاں کرنے کے لیے یہاں بہت سی یادگاریں بنائی گئی ہیں۔ میدان سرخ میں وہ خونی چوترا بھی موجود ہے جس پر سینکڑوں انسانوں کا لہو گرایا گیا تھا، اس چوترا کے قریب سے گزریں تو وحشت و بربریت کی تصویر نگاہوں میں پھرنے لگتی ہے۔ ہر



سال یکم مئی اور سات نومبر کو ریڈ سکوائئر میں فوجی پریڈ ہوتی اور روس کی فوجی قوت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

کریملن کے محلات اور دفاتر میدان سرخ سے متصل ہیں۔ سرخ رنگ کی یہ خوبصورت عمارتیں زاروں کے عہد میں تعمیر کی گئی تھیں، جو زیادہ تر عبادت گاہیں تھیں۔ کریملن کا علاقہ مکون کی شکل میں دریائے ماسکو کے شمال میں واقع ہے۔ زاروں کے دور میں بنائے گئے بلند مینار آج بھی اپنے حسن میں بے مثال ہیں۔ ان کی ہیئت میں اگر کوئی فرق آیا ہے تو وہ سرخ رنگ کے بڑے بڑے ستاروں اور سرخ ہی رنگ کے پرچموں کا ہے، جن کی موجودگی یہ اعلان کرتی معلوم ہوتی ہے کہ اب کریملن زاروں کا نہیں، لینن اور اس کے ماننے والوں کا ہے۔

## لینن کی لاش کا تقدس

میدان سرخ اور کریملن کے سنگم پر یا قوتی رنگ کے قیمتی پتھر سے بنے ہوئے ایک خوبصورت کمرے میں لینن کا جسدِ خاکی رکھا ہوا ہے۔ جدید روس کے بانی کی حنوط شدہ لاش کی ایک جھلک دیکھنے لوگ دور دور سے آتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص کو آنے کی اجازت ہے۔ یہاں صرف وہی لوگ آ سکتے ہیں جن کے پاس خصوصی اجازت نامے ہوں۔ بیرونی ممالک سے آنے والے اعلیٰ احکام اور سفارتی نمائندے پھولوں کی چادریں چڑھانے آتے ہیں۔ کمرے کے اندر جانے سے پہلے یہیں خصوصی آداب بتائے گئے:

ا۔ جن کے سروں پر ٹوپیاں ہیں، وہ ٹوپیاں اتار لیں۔

ب۔ کوٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکال لیے جائیں۔

ج۔ لینن کے تابوت کے سامنے خاموش کھڑے رہیں اور کوئی بھی ایسی حرکت نہ کریں جس سے کامریڈ لینن کا تقدس مجروح ہوتا ہو۔

ایک غیر مذہبی ملک میں یہ پابندیاں مجھے عجیب تو لگیں، لیکن کوئی صاحب یہ نہ بتا سکے کہ لینن کے عقیدت مند لینن کے تابوت کے سامنے جاتے ہوئے اپنے سیکولر مذہم کو کہاں چھوڑ آتے ہیں؟ ہر چیز کے تقدس کی نفی کرنے والے لینن کی حنوط شدہ لاش کو آسمانی صحیفے کی طرح



مقدس کیوں سمجھتے ہیں؟

کرمیلین میں زاروں کے عہد کے مزاروں اور یادگاروں کی حالت بہت خستہ ہو چکی ہے، لیکن قدیم دور کے جن مشاہیر کو اشتراکی پسند کرتے ہیں ان کی یادگاروں اور آثار کی خصوصی حفاظت کی جاتی ہے۔

زار پیٹر اور ملکہ کیتھرین کے دور کے آثار اور ان کے خاندانوں کے افراد کی قبریں پتروپاولووکا کرلیسٹ اور دوسرے مقامات پر صحیح سالم دکھائی دیتی ہیں۔ ان قبروں کی حفاظت کا خصوصی انتظام کیا گیا ہے۔ زائرین اور سیاحوں کو ان کے بارے میں تمام تر تفصیل بتائی جاتی ہیں اور ان کا ذکر نہایت احترام سے کیا جاتا ہے، لیکن روس کے پانچ کروڑ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے ہر نقش، ہر نشان کو مٹا دیا گیا ہے۔ اولیائے کرام کے مزاروں کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ مساجد، امام باڑے اور مزار — ہر چیز بڑے اہتمام سے تباہ کر دی گئی ہے۔

### کرمیلین کا تاریخی چہرہ

لینن کا جسدِ خاکی دیکھنے کے بعد ہم کرمیلین کے اندرونی حصے کو دیکھنے گئے۔ ایک ایک عمارت سے انسانی عظمت ٹپکتی ہے۔ قدیم بیناروں، برجوں اور گنبدوں کا حسن ابھی تک مٹ نہیں پڑا۔ کبھی یہی گنبد اور کلس عبادت گاہوں پر الٹا دہکتے، آج ان کے سائے میں سرکاری دفاتر اور عجائب گھر بن چکے ہیں۔ کرمیلین کا ہر بڑا دروازہ اپنی مستقل تاریخ رکھتا ہے۔ ان دروازوں کے اندر روس کے سب سے مقتدر ادارے سپریم سوویت کے اجلاس ہوتے ہیں۔ کرمیلین کے عظیم الشان شاہی محل میں عوامی اجتماعات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کرمیلین میں عظیم الشان لینن لائبریری ہے جس میں ستر لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ علم کے متلاشی اس لائبریری میں آکر عموماً مایوس ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ کتابوں کے انتخاب میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ایسا مواد جس میں اشتراکیت کی تعریف و توصیف نہ ہو، لائبریری میں جگہ نہیں پاسکتا۔ کرمیلین کے مختلف مناظر پر اچلتی سی نگاہ ڈالنے کے بعد ہم گنام سپاہی کی قبر پر گئے۔ پھر کرمیلین کے احاطے میں آتش جاوید دیکھی۔



## عجائب گھر میں ببرک کارمل

اگلی صبح ہمیں مرکزی لینن عجائب کی سیر کرائی گئی۔ بعد میں ہم نے فوجی عجائب گھر بھی دیکھا۔ ایک روسی کائیڈ ہمارے ساتھ تھا۔ وہ نہایت تیزی سے رٹی رٹائی زبان میں مختلف چیزوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ لینن کے نام پر بننے والے عجائب گھر میں لینن کی زندگی کے تمام قابل ذکر پہلوؤں کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ تصاویر کے ذریعے دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیوں کی تاریخ واضح کی گئی ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں کمیونسٹ اخبارات و جرائد شائع ہوتے ہیں، ان کے نمونے اور تراشے یہاں موجود تھے۔

میں نے افغانستان میں کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں دی گئی معلومات کو خصوصی دلچسپی سے دیکھا۔ تصاویر اور اخباری تراشوں میں زیادہ نمائندگی ”پرچم پارٹی“ کو دی گئی تھی۔ کائیڈ نے ہمیں مختلف افغان کمیونسٹ لیڈروں کے مختلف حالات بتاتے ہوئے ببرک کارمل کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ میں بتایا گیا کہ ببرک کارمل ہی افغان کمیونسٹ تحریک کا اصل رہنما ہے۔ میوزیم میں ببرک کارمل کے اخبار ”پرچم“ کا پورا فائل موجود تھا۔ ہمارے بعض دوست عجائب گھر میں کارمل کی تصاویر دیکھ کر جذباتی ہو گئے۔ افغانوں کی بے لبری کو طعنہ دینے لگے کہ وہ اپنی قوم کے عظیم رہنماؤں کی قدر نہیں کرتے، مگر دوسرے ممالک میں ان کی کتنی عزت کی جاتی ہے!

فوجی عجائب گھر میں روسی تاریخ کے واقعات تسلسل سے تصویروں اور مختلف مجسموں کے ذریعے دکھائے جاتے ہیں۔ تمام مناظر بڑے موثر تھے۔ خصوصاً دوسری جنگ عظیم کی تصویر کشی ایسے دردناک مناظر سے کی گئی تھی کہ دیکھ کر مغرب کے مہذب انسان کی وحشت و بربریت پر حیرت ہوتی تھی۔ روسیوں کو اپنی آزادی کے تحفظ کی خاطر کتنی قربانیاں دینی پڑیں۔ شہلہ کی فوجوں نے بے گناہ لوگوں کے خون سے کس طرح ہولی کھیل! اس موضوع پر ہزاروں تصویریں شہادتیں پیش کی گئی تھیں۔ کاش اس میں بخارا، تاشقند اور خوقند کے محاصروں اور بے گناہ مسلمانوں کے قتل و قتال کا ذکر ہوتا تو تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آتا۔

میوزیم کے اندر دستاویزی فلم دکھانے کا بھی انتظام ہے۔ مختلف اقسام کا ہلک اسلحہ بھی



وہاں نمائش کے لیے رکھا تھا۔ ان مناظر کو دیکھ کر انسان کے دل میں تہذیب جدید کی جارحیت سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

## کامرائیوں کی نمائش

قومی اقتصادی کامرائیوں کی نمائش گاہ

\_\_\_\_\_ قابل دید جگہ ہے۔ اسے روس کا سب سے بڑا عجائب گھر کہا جاسکتا ہے۔ پانچ سو پچاس ایکڑ پر پھیلی ہوئی یہ نمائش پہلی بار ۱۹۵۹ء میں لگی تھی۔ اس نمائش گاہ میں نمائشی چیزوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ ہر سال اس میں کسی نہ کسی نوع کی تجدید کی جاتی ہے۔ نمائش کا بڑا مقصد یہ ہے کہ دیکھنے والوں کو روس کی سائنسی، صنعتی، زرعی اور دوسرے شعبوں کی ترقی کے بارے میں تازہ ترین معلومات فراہم کی جاسکیں۔

نمائش گاہ میں روس کی خلائی فتوحات کے نمونے رکھے گئے ہیں۔ یہاں میٹر وکے ریلوے اسٹیشن کے پاس، جس کا نام ہی نمائش گاہ کے نام پر VDNKH رکھا گیا ہے، تین سو فٹ بلند مینار بنایا گیا ہے۔ یہ خلائی دریافت کی یادگار ہے۔ نمائش گاہ میں داخل ہوتے وقت ایک مرد اور عورت کے بڑے بڑے مجسمے نظر آتے ہیں، جو روس کی اجتماعی زرعی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن نمائش گاہ کی خصوصی دلچسپی کا مرکز وہ حصہ ہے جس کا اہتمام سوویت یونین کی سائنسی اکادمی نے کیا ہے۔ اس حصے میں روس کے اولین خلائی جہاز ”سپٹنک“ خلائی راکٹوں ”یونگ“ اور خلائی گاڑیوں ”دوستک“ اور ”دوسخود“ کے نمونے بھی رکھے گئے ہیں۔ دنیا کے اولین خلائی رور د یوری گاگارین کی قد آدم تصویریں جابجا تبسم کناں ہیں۔ ایک مصنوعی سیارے کے نمونے کے پاس اولین خلائی مسافر کتیا کی متعدد تصاویر اور مجسمے موجود ہیں۔

”ایٹم برائے امن“ کے ہال میں ایٹمی قوت کے مختلف استعمال اور فوائد دکھائے گئے

ہیں۔ صنعت و صرفت کے پیولین میں مشینوں کے تقریباً پانچ ہزار نمونے اور صنعتی پیداوار کے اٹھارہ ہزار نمونے رکھے گئے ہیں۔

ایک ہال میں روس کی مختلف قومیتوں کی زندگی کے مختلف پہلو دکھائے گئے ہیں۔ یہاں ایک



نظر میں انسان روس کے تمام باشندوں کے ملبوسات کے نمونے دیکھ سکتا ہے۔ مختلف دستاویزی نمونوں سے شہری اور دیہی علاقوں کی ترقی کے مختلف مناظر دکھائے گئے ہیں۔ معاشرتی زندگی کے متنوع پہلوؤں میں رقص و سرود کے نمونے اور آلات بھی رکھے گئے ہیں۔ شوروی اتحاد کی ہر ریاست کی زرعی اور صنعتی ترقی کیلئے الگ الگ جگہ مخصوص کی گئی ہے۔

نمائش گاہ کی سیر نے ہمیں تھکن سے چور کر دیا حالانکہ ہم اس کے تمام حصے بھی نہ دیکھ سکے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس کے اندر ہی تھیٹر، اوپن ایئر کنسرٹ، رقص گاہ، ریسٹوران اور متعدد کیفے بھی موجود ہیں۔

## میٹرو

ماسکو شہر میں جس چیز نے میرے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے وہ زیر زمین چلنے والی ریل گاڑی، میٹرو METRO ہے۔ میٹرو کے تقریباً ایک سو ریلوے اسٹیشن ہیں اور اس کی مجموعی لمبائی دو سو کلومیٹر سے بھی زیادہ ہے۔ ہر اسٹیشن پر تقریباً دو منٹ کے وقفے سے چلنے والی ٹرینیں سبک رفتار اور نہایت منظم ہیں۔ صرف دس کوپکٹ کرایہ دے کر جب تک جی چاہے میٹرو میں سفر کر سکتے ہیں۔ میٹرو کا سفر چونکہ سستا اور آرام دہ ہے، اس لیے ماسکو کے زیادہ شہری اور باہر سے آنے والے اسی کے ذریعے سفر کر سکتے ہیں۔ میٹرو کے اکثر اسٹیشن کسی نہ کسی ہیرو یا انہم واقعے سے منسوب ہیں۔ اس لیے اسٹیشنوں کے نام یاد رکھنے آسان ہیں۔ ریلوے اسٹیشن نہایت صاف ستھرے بنائے گئے ہیں۔ کہیں کوڑے کرکٹ یا گندگی کا وجود تک نظر نہیں آتا۔ جہاں روزانہ لاکھوں افراد سفر کریں، صفائی کا ایسا اہتمام قابل تعریف بات ہے۔ پندرہ روز کی "ماسکوگر دی" کے بعد ہمیں اپنے اصل مقصد کی طرف توجہ دینے کا موقع ملا۔ ہمارے میزبانوں نے ہمیں بتایا کہ ہم ماسکو کی سیر کا اپنا "کوٹھ" پورا کر چکے ہیں۔ اس لیے اب اپنی اپنی منزل کی طرف روانگی کی تیاری کر لیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے مختلف گروپ مختلف شہروں



کے تعلیمی اداروں میں بھیجے جائیں گے۔ ہم پانچ ساتھیوں کو ابتدائی کورس کی تکمیل کے لیے ہاکو جانا تھا اور اگلی صبح میں اپنے ایک ساتھی طالب علم عبدالرحیم کے ہمراہ ہاکو روانہ ہو گیا۔ ہمیں جنوب میں طویل سفر کرنا پڑا۔ ہاکو آذربائیجان کا صدر مقام ہے۔ یہ بحیرہ کیسپین کے مغربی ساحل پر واقع ہے اور اس کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے۔

ہاکو کا سفر میرے لیے ایک جذباتی تجربہ تھا۔ آذربائیجان کی سرزمین صدیوں اسلامی تمدن کا گہوارہ رہی ہے۔ میں اس مقام پر جا رہا تھا جہاں قدم قدم پر ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ کے نقش دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں ریل کے ٹکٹوں کے علاوہ دس دس روپل سفر خرچ کے طور پر دیے گئے۔ ایک روسی گائیڈ نے ریلوے اسٹیشن تک ہماری رہنمائی کی اور ریل میں پہلے سے مخصوص شدہ نشستیں بتا دیں۔

ہم نے اپنا سامان رکھنے کے بعد آس پاس کا جائزہ لیا۔ ہر مسافر کو الوداع کہنے کے لیے اُس کا کوئی نہ کوئی عزیز آیا ہوا تھا۔ شوہروں سے جدا ہونے والی بیویاں اور بچوں کو الوداع کہنے والی مائیں آنسوؤں کے نذرانے پیش کر رہی تھیں۔ جیسے ہی ریل نے حرکت کی، ہاتھوں سے ہاتھ الگ ہو گئے۔ کچھ دیر تک ہم نے پیچھے رہتے ہوئے لوگوں کو دیکھا، پھر شہر کی آبادی کے نظارے میں محو ہو گئے۔ شہر کی حدود سے نکلے تو ریلوے لائن کے اطراف میں بیروزی کے پھولوں نے ہرا ہرا کر ہمارا استقبال کیا۔ آگے بڑھے تو دیہاتی آبادیاں دوسرا ہی نقشہ پیش کرنے لگیں۔ مکانات، گلیاں، پگڈنڈیاں اور لہلہاتے کھیت، ہر چیز افغانستان کے دیہات اور قصبوں کے مشابہ دکھائی دیتی تھی۔ کچے پتے مکانات اور لوگوں کے کملائے چہروں پر غربت کی پرچھائیاں۔ ماسکو سے کیسے مختلف مناظر نگاہوں کے سامنے گزرنے لگے۔

## مہمان نواز لوگ

اس نظارے سے فارغ ہوئے تو ڈبے میں بیٹھے ہوئے ہمسفروں سے جان پہچان پیدا کی۔ وہ نہایت اشتیاق سے ملے اور ہم بہت جلدی گھل مل گئے۔ زبان کی اجنبیت بھی زیادہ دیر تک حائل نہ رہ سکی۔ ہمارے ہمسفروں میں ایک آدھ ساتھی ایسا مل گیا جو ہماری زبان (فارسی) میں



بھی شد بد رکھتا تھا۔

سبھی مسافر متواضع اور خلیق تھے۔ خصوصاً ہمارے قریب کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ وہ کھانا کھاتے وقت ہمیں زبردستی اپنا مہمان بنالیتے تھے۔ جتنا انکا کرتے ان کا اصرار اتنا ہی بڑھ جاتا۔ دعوت قبول کر لیتے، تو ان کے چہرے پر حقیقی مسرت کے آثار نمودار ہو جاتے۔ وہ ہمارے ہاتھ دیاد با کر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ یہ محبت اتنی بڑھی کہ پیاس گھنٹے کے طویل سفر کے دوران ایک موقع بھی ایسا نہ آیا، جب ہم کوئی چیز اپنی جیب سے لے کر کھاتے۔ شاید وہ ہمارے حالات سے آگاہ تھے۔ ہمارے پاس سفر خرچہ بالکل محدود تھا۔ دس روپل فی کس! اور بس۔ یہ خدا کی طرف سے غیبی مدد تھی کہ ہماری مسکینی کا بھرم رہ گیا، ورنہ ہم دس روپل میں مشکل تین وقت کا کھانا ہی کھا سکتے۔ اگر یہ میزبان نہ ملتے تو راستے میں فاقہ کرنا پڑتا۔

### اجنبی سرزمین پر

دو روز بعد ہم نے باکو کی سرزمین پر قدم رکھا۔ گاڑی ملگجی شام کے اندھیرے میں ریلوے اسٹیشن پتہ پہنچی۔ جیسے ہی گاڑی پلیٹ فارم پر رکی، ہمارے ہم سفروں نے اپنا سامان اٹھایا اور تیزی سے گاڑی سے نکلنے لگے۔ راستے میں ہمیں ضیافتوں سے نوازنے والے، صرف ایک آدھ مسکراہٹ بخشتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ روس میں کسی اجنبی کو عارضی مہمان تو بنایا جاسکتا ہے، لیکن مستقل تعلق مصیبت بھی بن سکتا ہے۔ ہمارے کسی ساتھی نے اتنی رہنمائی بھی نہ کی کہ منزل کا راستہ ہی بتا دیتا۔

ریلے اسٹیشن سے باہر نکلے تو ہمیں منزل کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ باہر رات کسی دلدراز و شیرازہ کی طرح اپنی زلفیں کھول چکی تھی۔ پتہ فارسی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ اس لیے کوئی شخص ہماری مشکل حل نہ کر سکا۔ ٹیکسی ڈرائیوروں سے رابطہ قائم کیا، مگر جس سے فارسی بولنے کی کوشش کرتے، وہ نفی میں سر ہلا کر آگے بڑھ جاتا۔ بالآخر ایک رکشہ ڈرائیور ایسا مل گیا جو فارسی زبان جانتا تھا۔ اجنبیت کے سمندر میں شناسائی کا جذبہ نظر آتا تو اس سے لپٹ گئے۔ رکشہ والا غیر ملکی طلبہ کے ہاسٹل سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے ہمیں ہاسٹل پہنچا دیا۔



## کمرِ آمادگی ہاسٹل

ہاسٹل کے باہر خاصی دیر تک متذبذب کھڑے رہے کہ کوئی باہر آئے اور یہیں اندر چلنے کی دعوت دے، اور جب خاصی دیر تک باہر کھڑے رہنے کے باوجود کوئی باہر نہ آیا، تو ہم نے بلا اجازت ہی ہاسٹل میں گھسنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہاسٹل کئی منظر نہ تھا۔ اندر گئے تو بھی کوئی پرسان حال نظر نہ آیا۔ پہلی منزل پر اچھی طرح گھوم چکے، ہر شخص کو روک کر اپنی آمد کی اطلاع دی، مگر کسی کو اتنے ”اہم واقعے“ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسی عالم میں ایک خالی کمرہ نظر آیا، جو آرام دہ کرسیوں اور صوفوں سے آراستہ تھا، تو ہم نے اپنا سامان وہاں رکھ کر فیصلہ کر لیا کہ رات اسی جگہ گزار لیں گے، لیکن ابھی ہم ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ ایک تنومند شخص وہاں آدھکا اور اس نے ہمیں بلا توقف باہر کیا۔

تھکن سے میرا حال برا تھا۔ باہر نکل کر ہمیں نے تو فرش کو بستر بنا کر آرام کرنے کا پروگرام بنایا اور عبدالرحیم سرچھپانے کے ٹھکانے کی تلاش میں سرگرم رہا۔ (عبدالرحیم ۱۹۷۹ء تک وزارت معدنی کے شعبہ قدرتی گیس و نیل مزار شریف میں انجینئر رہے) تھوڑی دیر بعد آکر اُس نے مجھے خوش خبری سنائی کہ ایک کمرے میں کئی طلبہ اکٹھے مطالعہ کر رہے ہیں، چلو ان سے ملے ہیں ہم وہاں گئے، لیکن کسی نے ہماری طرف توجہ نہ کی اور ہماری ہمت نہ پڑی کہ ان سے اپنی پریشانی بتاتے۔ کرسیوں پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ نیند سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں، لیکن اجنبی طلبہ کے سامنے لیٹنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد طلبہ ایک ایک کر کے جانے لگے اور کمرہ بالکل خالی ہو گیا۔ ہم نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کرسیوں پر ہی لیٹ گئے۔ عین اس وقت وہی شخص جیسے ہماری بوسونگھ کر یہاں بھی آگیا۔ غالباً وہ ہاسٹل کا چوکیدار تھا۔ اس نے پھر ہمیں وہی حکم دیا کہ نکلو باہر! مگر اب ہمارا پیمانہ صبر بے پناہ ہو چکا تھا۔ ہم نے طے کر لیا تھا کہ جب تک وہ ہمیں اٹھا کر باہر نہیں پھینکے گا، باہر نہ جائیں گے۔ ہم نے اسے اشاروں میں بتایا:

”بہت دور سے آئے ہیں، بہت تھکے ہوئے ہیں۔ رحم کرو، مہربانی ہوگی۔“

اب چوکیدار کا دل کچھ سوجھا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“

”افغانستان سے“ — یہ ہمارا عاجزانہ جواب تھا۔



وہ باہر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد نہ جانے کہاں سے ایک افغان طالب علم کو بلا لایا۔ اس طالب علم کی ”قومی حمیت“ شاید بنید کے غلبے کی وجہ سے سو گئی تھی۔ کھڑکی کے باہر سے ہی فارسی میں ہماری آمد کا مقصد پوچھا اور پھر چوکیدار کو یہ بتاتے ہوئے کہ یہ افغان ہی ہیں واپس لوٹ گیا۔ چوکیدار نے ہمیں بکمال مروت کرسیوں پر آرام کرنے کی اجازت دے دی۔ ادھر چوکیدار باہر نکلا، ادھر ہم نے دروازہ بند کیا اور کرسیوں کے بجائے بڑی بڑی میزوں پر لیٹ گئے۔ رات یوں گزر گئی۔

## سُرخ دیس کے آداب

اگلی صبح ہماری ملاقات ہاسٹل کے ایک ذمہ دار، آقائے فدائی سے ہو گئی۔ وہ آذربائیجان کے باشندے تھے، فارسی بڑی روانی سے بولتے تھے، پھر بھی ان کا لہجہ بتاتا تھا کہ فارسی ان کی مادری زبان نہیں، محنت سے سیکھی گئی ہے۔ آقائے فدائی ہمیں بنیادی نصاب کے نگرہ ان کے پاس لے گئے۔ اُن صاحب نے یقین دہانی کرائی کہ بہت جلد ہمیں ہوسٹل میں جگہ مل جائے گی، لیکن اس یقین دہانی کے باوجود ہم شام تک کس میسرے کے عالم میں ادھر ادھر پھرتے رہے۔ شام کے وقت ہماری ملاقات چند افغان طلبہ سے ہوئی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہمارے پاس سامان رکھنے کی جگہ بھی نہیں، تو وہ ہمیں ساتھ لے گئے۔ لیسین منگل نامی طالب علم کے کمرے میں ہمارے اعزاز میں باقاعدہ دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ لیسین انجینئرنگ کے پانچویں سال کے طالب علم تھے اور عنقریب تعلیم سے فارغ ہو کر وطن واپس جانے والے تھے۔

جتنے بھی افغان طلبہ ہمارے میزبان تھے، سب اپنے آپ کو کسی نہ کسی کمیونسٹ گروپ سے منسوب کیے ہوئے تھے اور باری باری بڑے فخر سے بتا رہے تھے کہ ان کا تعلق ”خلق“ یا ”پرچم“ سے ہے۔ میرے لیے یہ امر باعث تعجب تھا۔ اس لیے کہ اُس وقت تک کابل میں کوئی شخص ان پارٹیوں سے اپنی نسبت کا اقرار فخریہ انداز میں نہ کرتا تھا۔ مذکورہ پارٹیوں سے تعلق رکھنا قانونی طور پر معیوب نہ تھا، لیکن جتنے لوگ بھی ان میں شامل تھے ان کی اکثریت کی شہرت اچھی نہ تھی۔ زیادہ تر لوگ اخلاق باختہ تھے۔ شراب کے رسیا اور ہوا افوں کے



اڈوں پر گھومنے والے یا مادر پدر آزاد۔ ان کی اکثریت کو والدین نے گھروں سے نکالا ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہاں جو ناخوب تھا، یہاں وہی خوب ہے۔

کھانے کے بعد دھواں دھار انداز میں نظریاتی مباحث چھڑ گئے۔ ہمارے سینئر ساتھی شاید ہمارا امتحان لے رہے تھے۔ اس دوران میں ہر شخص کے سامنے شراب کا جام رکھ دیا گیا۔ میں نے معذرت کی، تو میری طرف چند رحم دلانہ، طنزیہ نگاہیں اٹھیں، بہر حال مجھے معاف کر دیا گیا۔ اکثر افغان بھائی ”ترقی پسندی“ کی اس شیرھی پر قدم رکھ چکے تھے۔ میرے لیے یہ بات کسی حد سے کم نہ تھی کہ میرے وطن کے چنے ہوئے لوگ، جنہیں دانشور کہا جاتا ہے، اتنی جلدی اپنے ملک کا رنگ بھول گئے اور دوسروں کے رنگ میں رنگے گئے!

محفل کا رنگ جمانے کے لیے ایک صاحب نے شراب کا جام بلند کیا اور محفل سے کچھ یوں خطاب کیا :

”انقلابی ساتھیو! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے وطن، فلاکت زدہ اور پسماندہ وطن افغانستان کے نام پر یہ جام اٹھاؤں۔ اسے جہالت میں ڈوبے ہوئے معاشرے رجعت پسند ملاؤں اور امریکی دلاؤں کے نام منسوب کر دوں جو افغانستان کی آزادی، خوش حالی اور ترقی کے دشمن ہیں۔ آئیے ہم لینن کے وطن میں یہ عہد کریں کہ جب تک مذہب کے ٹھیکیداروں اور سامراجی ایجنٹوں کا خاتمہ نہیں ہوتا، ہم چین سے نہ بیٹھیں گے۔“

شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے ہمارے ترقی پسند میزبان نے ہمیں تلقین کی :

”یہاں آئے ہو تو ذہنوں سے رسم و رواج کا ہر نقش کہن مٹا دو۔ ملاؤں نے مذہب کا ڈھونگ اس لیے رچا رکھا ہے کہ تمہیں انقلاب سے دور رکھیں۔ جام اٹھاؤ، یہ رنگین محفل عیش و عشرت کے لیے نہیں، ان بے نواؤں کی یاد میں منعقد کی گئی ہے جن کے تن پر کپڑا نہیں ہے اور جن کو رہنے کے لیے چھت بھی نصیب نہیں ہوتی۔“

یہ تقریر مجھے اور عبدالرحیم کو متاثر نہ کر سکی۔ شراب پینے کا یہ نہایت بھونڈا جواز تھا۔ سب نے ہمیں کچھ حقارت اور کچھ رحم سے دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں، کوئی بات نہیں، ابھی تو گرفتار ہو آہستہ آہستہ ہماری ڈگر پر آ جاؤ گے۔



پھر شراب کا دور چلا، تو ایسا چلا کہ "انقلاب" کی ساری باتیں دھری رہ گئیں۔ شراب نے ایسی کرامت دکھائی کہ چند لڑکے ہی ایسے رہ گئے جو نشے میں آکر بھی نہ بہکے، ورنہ باقی تپے قابو ہوتے چلے گئے۔ ایسی دھینگا مشی شروع ہوئی کہ میز کے سارے برتن فرش پر آگرے شیشے کے برتن چھنا چھن ٹوٹنے لگے۔ مجھے اس صورت حال سے اس قدر کراہت محسوس ہوئی کہ میں نے عبدالرحیم صاحب کا ہاتھ پکڑ کر باہر کا رخ کیا۔ کسی نے ہمارے جانے کی پروا تک نہ کی۔ وہ رات ہم نے ایک افغان طالب علم کے ہاں گزاری۔

## آنسوؤں سے وضو کیا

علی الصبح میں بیدار ہو گیا۔ اپنے میزبان طالب علم کو جگایا۔ وہ میرے اتنے سویرے جاگئے پر بہت حیران ہوا۔ میں نے کہا، "تمہیں تکلیف دے رہا ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے مصلیٰ دے دو، صبح کی نماز پڑھ لوں، رات بھی نماز قضا ہو گئی تھی۔" وہ میری بات سن کر بہت ہنسا۔ کہنے لگا، "بھئی یہ روس ہے۔ اس ملک میں آئے ہو تو یہاں کے آداب سیکھو۔ یہاں آنے والے تو اپنے ملکوں کی جاہلانہ رسمیں بھولنے کے لیے آتے ہیں۔ تم بھی یہاں وہی کچھ کر دو جو لوگ کرتے ہیں، وہ نہ کر دو جو افغانستان میں کیا کرتے تھے۔"

اس لڑکے کی باتیں سن کر میں بے حد خوف زدہ ہو گیا۔ خدا کی گرفت کا احساس کچھ اس قدر بڑھا کہ میں کانپنے لگا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر رُکھا ہوا سیلاب بہہ نکلا۔ میں کانپتا اور روتا رہا اور یہ منظر میرے بے دین میزبان کو بھی متاثر کر گیا۔ اس نے میرے ساتھ یہ تعادون کیا کہ ایک دوسرے افغان طالب علم ابو الحسن کے پاس پہنچا دیا جو غالباً اس وقت ایران میں مہاجر ہے۔ اس کے کمرے میں جاتے ہی اس سے کہنے لگا،

"بھئی یو، تمہارا ہم مشرب آگیا، اسے سنبھالو!!"

میں نے سلام کیا۔ جواب ملا، "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔"

کمرے پر نگاہ ڈالی۔ صبح مغنوں میں ایک مسلمان طالب علم کی قیام گاہ دکھائی دی ایک کونے میں صاف ستھری درزی، اس پر نفیس اور نرم مصلیٰ پڑا ہوا۔ قریب ہی وضو کا لونا۔ الماری میں جزدان میں لپٹا ہوا قرآن پاک کا نسخہ سب سے بلند جگہ پر رکھا ہوا۔ فارسی زبان میں کچھ دینی کتابیں بھی موجود تھیں۔ یہ نوجوان مجھے اندھیرے میں روشنی کی کرن معلوم ہوا۔ اس نے مجھے لونا بھر کر پانی دیا



اور وضو کرنے کی جگہ دکھائی۔

مسک کے اعتبار سے وہ شیعہ تھا، لیکن اس کا دل نورِ ایمان سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے اسے گزشتہ شب کی مجلسِ طرب کی روداد سنائی۔ میری بات سن کر اس نے بڑی حوصلہ شکن باتیں کہیں کہنے لگا روس میں دین پر عمل کرنا دھکتے انگاروں پر چلنے سے زیادہ مشکل ہے۔ اسی طرح برائی اور بے حیائی سے باز رہنا بھی محال ہے۔ تم ہمیشہ اپنے کمرے میں نماز پڑھو، کسی گمراہ بندے میں نہ پڑو اور سب کے ساتھ اچھے تعلقات رکھو، ورنہ تمہارا جینا دو بھر ہو جائے گا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جو طلبہ عیش و عشرت کے دلدادہ ہوں، روسی حکومت کے نزدیک وہی پسندیدہ ہوتے ہیں۔ جنہیں وطن کی ہر چیز سے نفرت ہو، ہر رسم، ہر قدر کے دشمن ہوں اور شراب اور بھائی کے طلبگار ہوں، ان کی یہاں بڑی قدر کی جاتی ہے۔ میں نے ابوالحسن سے سوال کیا کہ ایسی عیالوں کے باوجود کیا یہ لوگ تعلیم کے لیے وقت نکال سکتے ہیں؟ اس نے جواب دیا :

”یہ لوگ تعلیم حاصل کرنے نہیں، وطن فروشی کی تربیت حاصل کرنے آتے ہیں تم دیکھو گے کہ ان کو اپنے شعبوں اور مضامین کے بارے میں بنیادی معلومات بھی حاصل نہیں ہیں، لیکن روکیوں کے یہ لاڈلے، ہر سال پاس ہوتے ہیں جب امتحانی مقالے کا مرحلہ آتا ہے، تو دوسروں سے سکھوا لیتے ہیں۔“

مجھے ہاسٹل میں تیسرے روز جگہ ملی۔ اچھا خاصا آرامگاہ، جس میں میری ضروریات کا اکثر سامان موجود تھا۔ ہمارا انسٹی ٹیوٹ ہاسٹل کے قریب ہی تھا۔

## اساتذہ

ہمارے زیادہ تر اساتذہ آذربائیجانی تھے۔ ان کی مہربانی اور شفقت ہمیشہ ہمیں حاصل رہتی تھی۔ البتہ فیکلٹی کے ڈین جو روسی تھے، اُن سے ہمیشہ خوف محسوس ہوتا تھا۔ کچھ تو اس لیے کہ ان کے چہرے کی ساخت ایسی تھی کہ جسے دیکھ کر طالب علم خوفزدہ ہو جاتے، دوسرے وہ ہر غیروسی سے تحقیر آمیز برتاؤ کرتے تھے۔ دوسروں سے ملتے وقت ان کے انداز سے ہمیشہ یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی شخص بہت بلندی سے کسی بہت چھوٹی سی چیز کو دیکھ رہا ہو۔ بولتے وقت



ان کا لہجہ انسان کو تھرا دیتا تھا۔

طبیعات، ریاضی اور ڈرائنگ کے اساتذہ آذربائیجانی تھے، جبکہ کیمیا ایک فرہر اندام روسی خاتون پڑھاتی تھیں، لیکن وہ ڈین کی مکمل ضد تھیں بخوش اخلاق، عالی ظرف اور ہر وقت مسکراتی ہوئی۔ تاریخ اور روسی زبان کے استاد بھی روسی تھے۔ وہ بھی بہت اچھے تھے، لیکن روسی زبان کی معلمہ ہمارے دلوں میں اپنے لیے جذبہ احترام نہ پیدا کر سکیں۔ یہ نوجوان آرمینی خاتون بہت لیے دیئے رہتی تھیں اور غیر ملکیوں سے ان کا سلوک اچھا نہ تھا۔

## ہم سبق

ہمارے ساتھ کئی دوسرے ممالک کے طلبہ بھی زیر تعلیم تھے۔ ان میں زیادہ تر لبنان، شام، الجزائر اور دیت نام سے تعلق رکھتے تھے۔ لبنان کے طلبہ محنتی تھے۔ اپنے وقت کا اکثر حصہ مطالعے میں صرف کرتے تھے، جبکہ شامی طلبہ کی اکثریت الحاد زدہ تھی۔ شعائر اسلامی کا مذاق اڑاتے اور نماز روزے کا اہتمام کرنے والے طلبہ پر پھتیاں کتے تھے۔ مجھے زیادہ پسند دیت نامی طلبہ آئے۔ وہ جمانی طور پر کوتاہ قد تھے، مگر ان کی انفرادیت اور ہر جگہ اپنے قومی تشخص کو قائم رکھنا ایسی خصوصیات تھیں جن سے وہ تمام طلبہ میں امتیاز رکھتے تھے۔ پھر ان کی اکثریت فرض شناس تھی۔ ایک ابھرنے والی قوم کے تمام اوصاف ان لڑکوں میں موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر یہ حقیقت ماننے میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا کہ امریکہ جیسی سپر طاقت نے بھی دیت نامیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔

افریقہ، یورپ اور لاطینی امریکہ سے آئے ہوئے طلبہ کی اکثریت شراب نوشی اور اخلاق سونو مشاغل میں مصروف رہتی تھی۔ مقامی طلبہ ایسے لڑکوں کے مخالف تھے خصوصاً جب روسی لڑکیاں غیر ملکی طلبہ کے ساتھ رقص میں شریک ہوتیں، تو روسی طلبہ سخت غصے میں آجاتے اور اکثر طلبہ کے درمیان اس مسئلے پر جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔



## غیرت زندہ ہے

آذربائیجان کے لوگ نہایت غیور ہیں۔ قومی توقیر کا احساس ان میں زندہ ہے۔ وہ اپنے رٹکیوں کو کسی صورت میں غیروں کے ساتھ آزادانہ اخلاط کی اجازت نہیں دیتے۔ عام ردی مردوزن کے آزادانہ میل جول کے سلسلے میں خاصہ ”لبرل“ ہیں، لیکن باکو میں روس کے غیر مسلم علاقوں کے مقابلے میں رقص و سرور کی محفلیں کم جتنی ہیں۔ جہاں مخلوط رقص گاہیں موجود ہیں وہاں آذربائیجانی عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ رقص کرتی ہیں۔ مرد اپنی عورتوں کو نامحرموں کے ساتھ رقص کرتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اشتراکی نظام ساٹھ سال کی مسلسل جدوجہد کے باوجود لوگوں کے دلوں سے اسلام کا نقش نہیں مٹا سکا۔

مقامی باشندے بالعموم اور آذربائیجانی اساتذہ بالخصوص ہمارے ساتھ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ وہ اپنے گھروں پر ہمارے لیے ضیافتوں کا اہتمام کرتے اور ہمیں اپنی گھریلو زندگی کا مطالعہ کرنے کے مواقع فراہم کرتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارا احساس اجنبیت ختم ہوتا چلا گیا۔ یہاں مقامی لوگوں کی ایک بڑی تعداد فارسی بولتی ہے۔ خود آذربائیجانی بھی فارسی سے ملتی جلتی زبان ہے لیکن چونکہ روسی حکومت روسی زبان کے ساتھ ہر جگہ ترجیحی سلوک اور مقامی زبانوں کی حوصلہ شکنی کرتی ہے اس لیے آذربائیجانی روسی زبان کے اثرات بھی تیزی سے قبول کر رہی ہے۔ اگر یہی صورت حال رہی تو کچھ عرصے کے بعد آذربائیجانی مکمل طور پر روسی زبان میں جذب ہو جائے گی۔

آذربائیجان ایرانی سرحد پر واقع ہے اس لیے لوگوں کی اکثریت ریڈیو ایران کی فارسی اور آذربائیجانی نشریات سنتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کی اکثریت آج بھی مسلمان ہے اور خود کو ملت اسلامیہ کا جزو لاینفک سمجھتی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اہل تشیع کی ہے، اس لیے ان کا جھکاؤ فطری طور پر ایران کی طرف ہے، لیکن آذربائیجان کے شیعہ حضرات وسیع النظر اور غیر متعصب ہیں۔ جس شیعہ مسلمان سے مجھے ملنے کا موقع ملا اس نے شیعہ سنی اتحاد کی بات ضرور کی۔ وہ کہتے تھے: ”سنی اور شیعہ دونوں کا ایک ہی سرشہ ہے“



## اسلام سے عقیدت

آذربائیجان میں کئی مسلمانوں سے ملاقات کرنے کے بعد مجھے سختہ یقین ہو گیا کہ کیونترم نے لوگوں کے سر جھکا دیئے ہیں، لیکن وہ ان کے دلوں کو مسخر نہیں کر سکا۔ وہ آج بھی اسلام سے والہانہ محبت رکھتے اور کیونترم کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ یہاں کے مسلمان بین الاقوامی مسلم برادری کے ساتھ اپنے رشتہ اخوت پر بھی فخر کرتے ہیں۔ حالات کے جبر نے انہیں مسلم دنیا سے کاٹ رکھا ہے، لیکن دنیا بھر میں کہیں مسلمانوں کو کامیابی نصیب ہو تو اس پر انہیں خوشی ہوتی ہے اور مسلمانوں کے دکھ کو وہ اپنا دکھ سمجھتے ہیں۔ اپنی حالت کو وہ بدترین غلامی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس دن کے منتظر ہیں جب اسلام دنیا پر غالب آجائے گا اور غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ مایوسیوں کے گرداب میں بھی انہوں نے اپنا رشتہ اسلامی اصولوں سے نہیں توڑا۔ چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت بھی کی جاتی ہے۔ ان کے ہاں شادی بیاہ کے اکثر رسوم و رواج اسلامی اصولوں کے مطابق ہیں۔ مردوں کی تدفین بھی اسلامی طریقے سے کی جاتی ہے۔ میں یہاں اس سلسلے میں اپنے ذاتی مشاہدات پیش کر رہا ہوں :

ہمارے ہسپتال کے قریب ایک خاتون کا شیر خوار بچہ فوت ہو گیا۔ مسلمان طلبہ کے بارے میں پوچھتی ہوئی وہ ہمارے پاس پہنچ گئی۔ اس نے ہم سے بڑی عاجزی سے خواہش ظاہر کی کہ ہم اس کے بچے کو اسلامی طریقے کے مطابق دفن کریں۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہاسٹل کی انتظامیہ کو اس کا پتہ چل گیا تو ہمارے حق میں اچھا نہ ہوگا، مگر ایک تڑپتی ہوئی ماں کی التجا نہ ٹھکرائی جاسکی۔ میں نے کچھ مسلم طلبہ کو ساتھ لیا، بچے کی لاش کو کفن میں لپیٹا، جنازہ پڑھایا۔ بعد میں جنازے کے ساتھ ہم قبرستان گئے۔ تدفین کے بعد سب طلبہ نے بچے کی لحد پر قرآنی آیات کی تلاوت کی۔ ہم نے خاتون کے لیے دعا کی کہ خدا بچے کو اس کی شفاعت اور مغفرت کا ذریعہ بنائے۔

ہم ابھی قبرستان میں تھے کہ پولیس پہنچ گئی۔ وہ شاید ہماری نگرانی یا حفاظت کے لیے آئی تھی۔ میرا خیال تھا، خاتون کو پولیس کے آنے سے خوف محسوس ہوگا، لیکن اس نے ہمارا بار بار شکر یہ ادا کیا۔ وہ کہتی جاتی تھی :



”اپنے کلیجے کا ٹکڑا مٹی میں دبا کر جا رہی ہوں، تب بھی خوش ہوں۔ میری خوشی بیان سے باہر ہے اس لیے کہ دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے میرے مسلمان بھائی میرے دکھ میں شریک ہوئے اور میرے بچے کی تدفین صحیح اسلامی طریقے پر ہوئی“

## قرآن پاک کی محبت

ہم اشیائے صرف خریدنے بازار جاتے، تو مسلمان دکاندار (اس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے)، ہمارے ساتھ پر خلوص برتاؤ کرتے۔ یہاں تک کہ بعض چیزوں کی قیمت لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ جب ہم اصرار کر کے قیمت دینا چاہتے تو کم کر لیتے۔ اس دوران میں جب ان سے بات ہوتی تو معلوم ہوتا کہ وہ مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمان سمجھ کر یہ حسن سلوک کر رہے ہیں۔ ان کے احسان کے بدلے جب ہم ان کے شکریہ گزار ہوتے، تو وہ اسلامی رشتے کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے:

”ہم مسلمان ہیں، اس لیے ایک دوسرے کے بھائی ہیں اگر ہماری جان بھی اپنے بھائی کے کام آجائے تو دریغ نہ کریں گے“

وہ ہم سے قرآن پاک اور دینی کتابیں مانگتے تھے۔ جب ہم معذرت کرتے تو سفید کاغذ پر قرآنی آیات کھوا لیتے۔ آیات کریمہ کو چومتے، آنکھوں سے لگاتے اور پاک جگہ میں رکھ دیتے۔ مسلمان دکانداروں سے ہمارا تعلق اتنا بڑھ گیا کہ جب بازار میں کوئی چیز نہ ملتی (روس میں اکثر اشیائے ضرورت کیاب رہتی ہیں) تو وہ پوری کوشش کر کے ہمیں مہیا کرتے تھے۔ ایک دن میں ٹیکسی میں کہیں جا رہا تھا۔ اچانک ڈرائیور نے ٹیکسی کا ٹرانسپیرینس دیا۔ ریڈیو پر اذان نشر ہو رہی تھی۔ روس میں آنے کے بعد پہلی مرتبہ یہ فردوس گوش صدا سنی۔ میں حیران رہ گیا۔ اپنی حیرت رفع کرنے کی خاطر میں نے ڈرائیور سے پوچھا:

”یہ اذان کہاں سے نشر ہو رہی ہے؟“

اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جب اذان ختم ہوئی تو اس نے کلمہ طیبہ پڑھا۔

پھر مجھ سے مخاطب ہوا:

”یہ اذان ریڈیو تہران سے نشر ہوتی ہے۔ اکثر مسلمان اسے سنتے ہیں“



جب میں نے اس سے پوچھا کہ آیا وہ نماز بھی پڑھتا ہے، تو اس نے اسی سے سرفی میں ہلایا اور کہا، مجھے نماز پڑھنے کا شوق تو ہے، لیکن نماز پڑھنا جانتا نہیں۔

آذربائیجان میں لوگوں کے دلوں سے اسلام کے نقوش مٹانے کی بہت کوششیں کی گئیں۔ اسلام کی محبت کا دم بھرنے والے ہزاروں لوگوں کو ختم کر دیا گیا، ان کا جینا دو بھر کر دیا گیا۔ نماز پڑھنا قرآن پاک کی تلاوت کرنا لائق تعزیر جرم ٹھہرا، مگر اسلام کی چنگاری ہے کہ برابر دلوں میں سلگ رہی ہے۔ اسلام رگوں میں دوڑنے والے لہو کی طرح موجود ہے۔ لوگوں کے نام اسلامی ہیں۔ رسوم فروا ج اسلامی ہیں۔ باکو میں اسلامی طریقے سے ذبح کیا ہوا گوشت فروخت ہوتا ہے۔ دیہات میں رمضان کے پورے روزے رکھے جاتے اور تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ علاقے کی اکثر مساجد یا تو مسمار کی جاچکی ہیں یا ان پر پولیس کا پہرہ ہے۔

روسی حکومت اس بات کا پورا اہتمام کر رہی ہے کہ باہر سے قرآن پاک کا کوئی نسخہ ملک میں نہ آ سکے۔ جو سیاح اور طالب علم اپنے ساتھ قرآن پاک لاتے ہیں، انہیں صرف ذاتی مطالعے کی اجازت دی جاتی ہے اور ان پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اس نسخے کو (بلا کم و کاست) جلاتے وقت ساتھ لے کر جائیں۔ قرآن پاک کا کسی روسی شہری کے پاس پایا جانا بہت بڑا جرم ہے جس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ ذرائع ابلاغ رات دن اس کوشش میں مصروف ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل اسلام سے منہ موڑ لے۔ پرانی نسل کے مسلمان پہلے ہی ختم ہو چکے ہیں، نئی نسل نے اشتراکیت کے سائے میں آنکھ کھولی ہے، لیکن روسی حکومت کے اسلام سے خوف کا یہ عالم ہے کہ جب پتہ چلتا ہے فلاں گھر میں بچوں کو قرآن کی تعلیم دی جاتی یا نمازیں ادا کی جاتی ہیں، تو ایسے والدین سے ان کے بچے چھین لیے جاتے ہیں۔

ایک مشہور روسی مفکر بولگا کوف کہتا ہے: ”دین کے ساتھ مسلسل جنگ اور عداوت مارکسزم کے مبارزین کی بقا کی ضامن ہے۔“

مشہور روسی ماہر طبیعیات ایگنرینڈ سولنڈنیشن نے اشتراکی نظام کے خلاف اعلان بغاوت کرتے ہوئے روسی حکومت کے نام اپنے خط میں لکھا ہے: ”کیا تم نے کبھی ان لوگوں کے بارے



میں سوچا ہے جن کو محض اس "جرم" میں جلا وطن کر دیا گیا ہے کہ وہ مذہبی رجحانات رکھتے تھے؟

## اسلامی تحریک

باکو میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ حال ہی میں مسلمانوں میں ایسی تحریک ابھری ہے، جس کا مقصد مسلمانوں کو احساسِ قرباں دلانا اور آزادی کی جدوجہد پر ابھارنا ہے۔ علی اوف نامی ایک صاحب اس تحریک کے قائد تھے۔ وہ مسلمانوں میں جدوجہد کا قرینہ پیدا کرتے اور دینی ہوائی چنگاریوں کو سلگاتے تھے۔ علی اوف کے ایک پر جوش حامی نے مجھے بتایا کہ ان کا لیڈر اشتراکیت کے لیے خطرے کا الارم بن گیا ہے۔ وہ پوچھتا ہے :

"ہمارا قرآن ہم سے کیوں چھین لیا گیا؟ دینی مدارس کیوں مقفل کر دیے گئے؟ ہمیں اپنی تہذیب و ثقافت سے منہ موڑ کر روسی تہذیب اپنانے کا حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟ علی اوف کی آواز میں بڑا اعتماد اور جوش ہے۔ وہ کہتے ہیں :

"یہ ہماری سرزمین سے اسلامی تہذیب کا ہر نشان مٹا دینا چاہتے۔ ہمارے دلوں سے اللہ تعالیٰ کے مقدس نام کو کھرچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے، اسلام ہماری گلوں میں لہو بن کر دوڑ رہا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں شہوانی خواہشات کا غلام بنا کر، کیونز م کے اندھیروں میں دھکیل دیں، مگر جب تک اس سرزمین پر ایک مسلمان بھی زندہ ہے، اسلام کا نام زندہ رہے گا۔"

## مذہبی آزادی کا ڈھونگ

مختلف مذہبی اقلیتوں کے بارے میں روسی متضاد پالیسی پر کار بند ہیں۔ سب سے زیادہ دشمنی اسلام سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کیونسٹ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ جب بھی مسلمانوں سے نرمی برتی گئی، وہ اسلامی تعلیمات سے استفادہ کر کے نہ صرف خود اشتراکیت کے خلاف محاذ کھول لیں گے، بلکہ روسیوں میں بھی بغاوت کے جراثیم پیدا کر دیں گے۔ اقلیتوں کے بارے میں روسی پالیسی کا دوسرا متضاد پہلو یہ ہے کہ جب بھی انہیں اندرونی یا بیرونی طور پر کسی خطرے



کاسا منا ہوا، مذہب کے خیر خواہ بن گئے، مگر ادھر خطرہ ملا، ادھر یہ پالیسی پھر اُسی مقام پر پہنچ گئی اور مذہبی طبقوں پر قیامت ڈھائی جانے لگی۔

بالشویک انقلاب کے بعد جب کمیونسٹوں کو داخلی طور پر مشکلات درپیش تھیں، اگر مسلمان اس وقت کوئی اجتماعی تحریک اٹھا دیتے، تو شاید انقلاب کامیاب نہ ہوتا۔ اس صورت حال میں لینن نے مسلمانوں کو ”نوید“ دی :

”زارتم لوگوں پر ظلم ڈھارہا تھا اور تم مذہبی آزادی سے محروم تھے۔ ہم تمہارے عقائد کا احترام کرتے ہیں۔ آج سے تم اپنے عقائد کے مطابق عمل کرنے کے سلسلے میں آزاد ہو۔“

لیکن جب لینن نے داخلی مسائل کو حل کر لیا۔ انقلاب کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں تو بلا توقف مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا اور علانیہ کہا :

”مذہب بورژوائیت کا آلہ کار ہے۔ اس کی بیخ کنی ضروری ہے۔“

اس کے بعد دوسری جنگ عظیم کے دوران روسیوں کو مسلمانوں کے تعاون کی دوبارہ ضرورت پڑی تو انہوں نے مساجد اور مدارس کے مقفل دروازے کھول دیے۔ سابقہ غلطیوں کی معافی مانگی۔ ایک بار پھر یہ خوش خبری سنائی گئی کہ آئندہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں دخل نہ کی جائے گی، لیکن جنگ کے شعلے سرد پڑے، تو روسی اپنے تمام وعدوں سے پھر گئے۔ جنگ کے بعد مسلمانوں کا زبردست قتل عام ہوا۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ جنگ کے دوران وہ جرمنی کے آلہ کار تھے۔ جنگ کے دوران کھولی ہوئی مساجد پھر بند کر دی گئیں۔ صرف چند مساجد ایسی چھوڑ دی گئیں جن میں اشتراکی ایجنٹوں اور آلہ کاروں کو ”امامت“ اور ”خطابت“ کے فرائض سونپے گئے۔ جو باہر سے آنے والے کے لیے ”مذہبی آزادی“ کے مظاہرے کرنے کے لیے نمازیں پڑھانے اور خطبے دیتے ہیں۔

ان نمائشی اور نام نہاد ملاؤں کو یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات کو منہج کر کے پیش کریں۔ وہ اشتراکی افکار پر اسلام کا ٹھپہ لگاتے ہیں۔ اپنی نمائشی تقاریر میں یہ ”ثابت“ کرتے ہیں کہ سوشلزم دراصل اسلام ہی کا دوسرا روپ ہے۔ مسلمانوں کو نہ صرف



قرآن پاک کے نئے نسخے حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ ان کے پاس پرانے نسخے مل جائیں، تو چھین کر بھاری سزائیں دی جاتی ہیں۔ مساجد اور مدارس کے بارے میں واضح احکامات ہیں کہ روس کی حدود میں آئندہ کوئی نئی مسجد تعمیر ہوگی نہ کسی پرانی مسجد کی مرمت کی جائے گی۔

## اسلام زندہ معجزہ ہے

ایک تاجک طالب علم محمد شریف نے بتایا کہ تاجکستان کا صدر مقام در شہنبہ مساجد اور اسلامی مکاتب سے یکسر محروم ہو چکا ہے، حالانکہ یہ کبھی اسلامی تہذیب کا مرکز تھا اور یہاں سینکڑوں عالی شان مساجد موجود تھیں۔ یہیں آذربائیجان کے دیہات میں جانے کے کئی مواقع ملے، بظاہر یہ تعلیمی نوعیت کے دورے تھے، لیکن ان موقعوں پر یہیں یہ دکھایا جاتا کہ دیکھ لو یہاں ہندسب کا کوئی نشان موجود نہیں۔ لوگ پورے جند بے اور ولولے سے اشتراکی اصولوں پر عمل کرتے اور اجتماعی زرعی فارمنگ اور کارخانوں میں قومی خدمات انجام دیتے ہیں۔ سب خوش ہیں، کسی کو کوئی شکایت نہیں۔ یہیں اپنے انٹرکٹرز کی باتیں سن کر ہنسی آ جاتی تھی۔ اس لیے کہ عام لوگوں کی نگاہوں میں روسیوں کے لیے نفرت صاف پڑھتی تھی۔ ”روسی غارت گر اور لیٹھے ہیں“ ”وہ بے حیا اور کافر ہیں“ — ایسے فقرے اکثر سنائی دیتے تھے۔ میں نے کئی مزدوروں اور کسانوں سے ایسی باتیں خود سنیں۔ وہ روسیوں کی نگاہیں بچا کر ہمیں ایسی باتیں بتاتے جن سے روسی دعووں کی قلعی کھل جاتی تھی۔

ہم دیہی علاقوں کے تعارفی دوروں پر جاتے تو آسانہ ہمارے ساتھ ہوتے، گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے لوگ ہماری ان استانیوں کو بڑی نفرت سے دیکھتے جو شلوار قمیص میں ملبوس ہونے کے بجائے چست سکرٹ میں ملفوف ہوتی تھیں۔ کئی مرتبہ لوگوں نے یہ جان کر کہ ہم مسلمان ہیں، رکاوٹوں کی پردا کیے بغیر ہم سے گرمخوشی سے معافی اور معانقے کیے۔ وہ ہمارے احوال دریافت کرتے اور ہمیں اپنے درمیان دیکھ کر ان کے چہروں پر بے پناہ رونق آ جاتی تھی۔ جب ہم اپنے استاد یا گائیڈ کے اشارے پر آگے بڑھتے تو مددگار ان کے ہاتھ ہٹے ہوئے دکھائی دیتے



تھے۔ میں اپنے لادین اور ترقی پسند طالبعلم ساتھیوں کو اس طرف متوجہ کرتا، تو وہ اس کا جواب نہ دے پاتے۔

ایک روز جب ہم مسلمانوں کی بستی میں سے گزر رہے تھے۔ کچھ لوگ ہم سے ہاتھ ملارہے تھے، جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم مسلمان ہیں، تو وہ ہمارے ہاتھوں کو چومتے اور محبت سے دباتے تھے۔ میں نے اپنے ایک بلخ افغان ساتھی سے کہا :

”کیا تم ان جذبات کی توجیہ پیش کر سکتے ہو؟“

وہ خود بھی اس صورتِ حال سے خاصا متاثر ہو چکا تھا۔ بے اختیار بولا :

”خدا کی قسم! دنیا کی کوئی طاقت اسلام کو نیست نابود نہیں کر سکتی۔ ساٹھ برس سے انہی لوگوں کے دل و دماغ کیونزیم کے ”سرخ پانیوں“ سے دھوئے جا رہے ہیں، لیکن اسلام کے ”سبز داغ“ جوں کے توں ہیں۔“

میں اس کی بات پر منہسا اور مذاقاً اسے چھیڑا :

”تو اسلام کی حقانیت پر تم بھی ایمان لے آئے؟“

اس سے پہلے وہ کئی بار کہہ چکا تھا، اسلام میں فرسودہ روایات کے سوا کچھ نہیں ہے، مگر آج کے واقعے نے اسے اس قدر متاثر کیا تھا کہ میرے سوال کے جواب میں جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا :

”اسلام بیسویں صدی کا زندہ معجزہ ہے۔“

راستوں پر چلتے ہوئے مجھے کوئی بچہ مل جاتا تو میں اس کا ہاتھ تھام کر اس سے پوچھتا :

..... ”مسلمان؟“ یہ لفظ سن کر معصوم بچوں کے چہروں پر ایک خاص رنگ پیدا ہو جاتا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے اور ثبوت میں جلدی سے کلمہ طیبہ پڑھتے یا قرآن پاک کی کوئی آیت سنا دیتے تھے۔

کئی بار لیکچروں میں روسی استاد آذربائیجان کی تہذیب کا ذکر چھیڑ دیتے، تو ہمیں باور کرانے کی کوشش کرتے کہ بلاشبہ کبھی یہ علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں رہا ہے۔ انہوں نے ہزاروں کھے تعداد میں مسجدیں بنائی تھیں، لیکن جب لوگ ان کی غلامی سے آزاد ہو گئے تو عبادت چھوڑ دی



مسجدوں سے منہ موڑ لیا۔ آج وہی مساجد تھیسروں، رقص گاہوں اور کھیل کے میدانوں میں تبدیل کر دی گئی ہیں اور لوگ وہاں تفریح کے لیے آتے ہیں۔ اب انہیں فارغ وقت میں عبادت میں نہیں، کھیل کود اور دوسرے مشاغل میں مزا آتا ہے۔ ”استادیہ باتیں کرتے تو میرا وہی افغان ساتھی نفی میں سر ہلاتا اور بڑبڑانے لگتا تھا۔

## قصاب کے اوزاروں سے آپریشن

مشہور روسی ریاضی دان ایوانو پیچ کے قول کے مطابق کمیونزم اپنے نظریات کی تنفیذ کے لیے جبر کا جو راستہ اختیار کرتا ہے، اس سلسلے میں اس منطق کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ ”ڈاکٹر قصاب کے اوزاروں سے بھی مریض کا کامیاب آپریشن کر سکتا ہے۔ یہی نظریہ مارکس اور اینگلس کا ہے۔ اپنی باہمی خط و کتابت میں دونوں نے اس بات کا عزم ظاہر کیا ہے کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد جبر و تشدد اور انسان کشی ناگزیر ہوگی۔ اگرچہ روس میں جبر کا طوفان قہم گیا ہے، لیکن عوام کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ جس طرح یوگوسلاویہ کی کمیونسٹ پارٹی کے سابق ممبر میلوا نے جیلاس نے کہا ہے :

”کمیونسٹ انقلاب معاشرے میں موجود طبقات کے تصادم سے برپا ہوتا ہے اس لیے لازماً جو طبقہ ابھرتا ہے اسے لامحدود اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔“

آج کے روس کا یہی منظر ہے حکمرانوں کے لامحدود اختیارات اور محکوموں کی لامحدود بے اختیاری۔

## شراب کا سیلاب

ہم نے باکو میں اخلاقی انحطاط کی لحاظ بہ لحاظ پھیلتی ہوئی لہر کا مشاہدہ بھی کیا۔ شراب معاشرے میں عام کی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ جنسی انار کی کا سیلاب سا اٹھ آیا ہے۔ عوام اس صورت حال سے سخت پریشان ہیں۔ شریف خواتین رات کے وقت گھروں سے باہر نہیں نکلتیں کہ عیاش روسی افسر بیٹیوں کی طرح ان کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ پولیس اس بد امنی کو روکنے میں ناکام ہو چکی



ہے۔ بڑے لوگ مزے کرتے ہیں، انہیں ہر اسائش حاصل ہے، لیکن غریب طبقہ بری طرح پس رہا ہے۔ حالات کی تصویر اندر سے میخاروف کے الفاظ میں یوں ہے :

”روسی معاشرہ بے پناہ بد بختیوں کا سامنا کر رہا ہے۔ عمر رسیدہ لوگوں سے سخت بے رحمی برتی جاتی ہے۔ انہیں بہت کم پنشن ملتی ہے۔ بیمار ہوں تو کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ آبادی کا غالب حصہ شراب کا رسیا ہے۔ غربت کا سیلاب لوگوں کو بہائے لیے جارہا ہے۔ ان کی تنخواہیں بے حد کم ہیں۔ کروڑوں عورتیں سخت جسمانی مشقت کرتی ہیں، تب ان کے بچوں کو دو قے کھانا نصیب ہوتا ہے۔ پندرہ لاکھ نظر بند افراد سے بے گار لی جاتی ہے“

میری آنکھوں نے جو تصویر دیکھی، وہ اس پر وپگنڈے سے قطعی مختلف تھی جس کو روسی ذرائع ابلاغ دنیا بھر میں پھیلاتے ہیں۔ کروڑوں انسان دائم الخمر ہیں۔ اس میں مردوں اور عورتوں کی تفریق نہیں۔ غم و اندوہ کی حکمرانی ہے اور لوگ غموں سے فرار کے لیے شراب کا سہارا لیتے ہیں۔ آپ کسی شرابی سے پوچھیں کہ وہ شراب کیوں پیتا ہے؟ اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوگا ”غم و الم سے نجات پانے کے لیے“ غریب کارکن اور مزدور کبھی کبھار رستورانوں میں جاتے ہیں، تو چائے کے بجائے شراب پی لیتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس شراب خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے وہ مختلف طبی اداروں میں جا کر جیتے جی اپنی لاشوں کا سودا کر لیتے ہیں۔ اس طرح جو رقم ملتی ہے اس کی بھی شراب پی جاتے ہیں جو لوگ زیادہ پی لیتے ہیں، بے اختیار رونے لگتے ہیں شراب خانوں میں، چکیوں اور چیخوں کی آوازیں اکثر سنائی دیتی ہیں۔ بعض لوگ اس عالم میں حکومت کے خلاف واہی تباہی بکنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مزید آفتوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔

دن بھر سخت مشقت کرنے والے مزدور شام کو بوجھل دلوں اور مر جھلے ہوئے چہروں کے ساتھ واپس آتے ہیں تو سر شام ہی شراب پی کر کسی کونے میں پڑ جاتے ہیں۔ اگلی صبح ان پر پھر اداسیاں لے کر طلوع ہوتی ہے۔ جو بچے والدین کی شفقت سے محروم ہیں، وہ بھی مختلف قسم کے نشوں میں مبتلا ہیں۔ شراب، چرس اور بھنگ کے شکار بچے جگہ جگہ



آوارہ گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو عورتیں اپنی عائلی زندگی سے مطمئن نہیں یا جنہیں اپنے عزیزوں اور شوہروں کی رفاقت حاصل نہیں ہوتی، وہ اپنی محرومیوں کا علاج شراب خانہ خراب سے کرتی ہیں۔ ایسی عورتیں دوسری اخلاقی بیماریوں میں بھی مبتلا ہوتی ہیں۔ شراب کے ایک گلاس کی خاطر عزتوں کے سودے کرتی پھرتی ہیں۔

اخلاقی بیماریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ حکومت بھی پریشان ہے۔ کارخانوں اور زرعی اداروں کی پیداوار متاثر ہوئی ہے۔ لیکن سرکار کے لیے قابل اطمینان بات یہ ہے کہ لوگ اپنے داخلی کرب بھلانے کے لیے شراب اور دوسری غیر اخلاقی حرکتوں کا سہارا لے لیتے ہیں، انہیں سرکاری پالیسیوں سے اختلاف کرنے کا ہوش نہیں رہتا۔ اسی پر اشتراکی نظام کی بقا کا انحصار ہے۔

### ڈسپلن کے نام پر۔

ڈسپلن کے نام پر پابندیوں کا ایسا جال تیار کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس سے نکل نہیں سکتا۔ سب سے بڑی پابندی اظہارِ خیال پر ہے۔ کسی صنعتی ادارے کے مزدوروں کو ایک ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر کہیں چند مزدور بیٹھے گپ شپ لڑا رہے ہوں اور اوپر سے ان کا کوئی افسر آجائے، تو ان کے اوسانِ خطا ہو جاتے ہیں وہ بات کرنا بھول جاتے ہیں۔ افسر اپنے ماتحتوں کی یہ ہیئتِ کدائی دیکھ کر بے حد خوش ہوتے ہیں۔ میں نے ایک کارخانے کے ذمہ دار افسر سے سوال کیا کہ مزدوروں میں اپنے افسروں کا ایسا خوف کیوں ہے؟ تو اس نے مجھے عجیب و غریب جواب دیا :

”آنی بڑی آبادی کو ڈسپلن کے بغیر کیسے یک جا رکھا جاسکتا ہے اور ڈسپلن

کے لیے جبرِ بنیادی ہتھیار ہے“

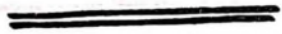
۱۹۲۰ء میں برٹنڈرسل نے لینن سے ملاقات کے بعد کہا تھا :

”لینن خود پرست، متعصب، تنگ نظر اور آزادی کے مفہوم سے نا آشنا“

محض تھا“



عظیم برطانوی فلسفی کے یہ الفاظ لینن کے حق میں درست تھے یا غلط، مگر کسی بھی روسی صنعتی ادارے کے سربراہ کو دیکھیں، تو اُس کے یہی خدو خال اور یہی اوصاف نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ماتحت افسروں کے ساتھ انتہائی کمرخت لہجے میں بات کرتا اور بات بے بات ان کی توہین کر دیتا ہے۔ چھوٹے افسر اپنا غصہ اپنے ماتحتوں پر نکالتے ہیں۔ اس نظام نے بااختیار لوگوں میں رعونت پیدا کر دی ہے اور عام لوگوں کو بندہ دل اور کم ہمت بنا دیا ہے۔





## دوسرا باب

### امیر شہر، غریب لوگ

گزشتہ اوراق میں باکو شہر کے قیام کا ذکر آیا ہے۔ مناسب ہو گا کہ اس شہر کے مختصر تاریخی اور جغرافیائی حالات بتا دیے جائیں۔ باکو جمہوریہ آذربائیجان کا صدر مقام ہونے کے علاوہ تیل کی صنعت کے لیے مشہور ہے۔ آذربائیجان کا علاقہ بحیرہ کیسپین کے مغرب میں واقع ہے۔ باکو روس کا پانچواں بڑا شہر ہے۔ تیل کی بے شمار ریفائنریوں اور کنوؤں کے علاوہ یہاں بحری جہازوں کی صنعت نے بڑی ترقی کی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں بجلی کی مشینری اور کیمیائی اشیاء کے کئی کارخانے ہیں۔

اس شہر کی تعمیر بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ خلیج یا کو کے گرد گولائی میں بنی ہوئی عمارتیں اتنی خوبصورتی سے بنائی گئی ہیں کہ یہ شہر پریوں کا دس معلوم ہوتا ہے۔ بحیرہ کیسپین کے راستے سوویت یونین میں سب سے پہلے باکو پہنچتے ہیں۔ یہاں کا موسم معتدل اور روس کے دوسرے علاقوں کی نسبت گرم ہے۔ باکو میں بارش کم ہوتی ہے، لیکن زراعت اور آبپاشی کے جدید طریقوں نے خشک علاقے کو سرسبز و شاداب بنا ڈالا ہے۔ شہر کو بحیرہ کیسپین میں واقع تیل کی صنعت کی تنصیبات سے طویل پلوں کے ذریعے ملایا گیا ہے۔ سمندر میں نفتیائی گورد کا سٹیل سے بنا ہوا مصنوعی جزیرہ بھی خوب ہے۔ مضبوط ستونوں پر قائم یہ بستی گہرے سمندر میں بنائی گئی ہے۔ بستی میں مزدوروں کے لیے رہائشی مکانات، ہسپتال، متعدد سکول، لائبریری، ڈاک خانہ اور ایک عجائب گھر بھی تعمیر کیا گیا ہے، تاہم اتنے امیر شہر میں لوگوں کی غربت کے مناظر بھی جا بجا



دکھائی دیتے ہیں۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں گھومتے مرد اور عورتیں تصویر کا دوسرا رخ دکھاتے ہیں۔

بحیرہ کیسپین سے جو تیل نکالا جاتا ہے وہ خاص جہازوں کے ذریعے ساحل تک لایا جاتا ہے۔ نقل و حمل کے دوران تیل کا کچھ حصہ پانی میں گر جاتا ہے۔ یہ تیل سطح آب پر پھیل جاتا ہے جس سے پانی کا رنگ بدلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس حصے میں ٹھیلیاں اور دوسرے سمندری جانور بھی مر جاتے ہیں۔ ساحل کے قریب کے علاقوں میں جائیں تو تیل کی بوضوح محسوس ہوتی ہے، لیکن یہاں کے لوگ اس بو سے مانوس ہو گئے ہیں اور وہ ساحلی تفریح گاہوں پر سیر کرنے کے لیے بڑے شوق سے آتے ہیں۔

باکو شہر کی دکانوں پر اشیائے ضرورت کے علاوہ غیر ملکی سامانِ تعیش بھی ملتا ہے۔ زیادہ تر دکاندار مسلمان ہیں۔ وہ کاروبار بڑی دیانتداری سے کرتے ہیں۔ اپنے گاہکوں سے ان کا سلوک نہایت مشفقانہ ہوتا ہے خصوصاً جب انہیں معلوم ہو جائے کہ ایک غیر ملکی مسلمان ان کی دکان پر آیا ہے، تو وہ اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ لیکن دین میں زیادہ بحث و مباحثہ پسند نہیں کیا جاتا۔ عموماً وہی قیمت بتائی جاتی ہے جو مناسب ہو، پھر اس میں کمی بیشی نہیں کی جاتی۔ دکاندار زیادہ تر آذربائیجانی زبان میں بات کرتے ہیں۔ اس زبان کو اسلامی کہا جاتا ہے۔

## اسلام کا گھر

آذربائیجان میں اسلام تقریباً تیرہ سو برس پہلے آیا۔ اگرچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں یہاں مسلمان مبلغین پہنچ چکے تھے، لیکن اموی خلیفہ ہشام کے دور میں یہ علاقہ باقاعدہ اسلامی خلافت کے زیرِ نگیں آیا۔ تیسری صدی ہجری میں یہاں بنو ساج کی خود مختار حکومت قائم ہو گئی۔ ۴۳۹ھ میں سلاجقہ کا اقتدار آذربائیجان تک پھیل گیا۔ دسویں صدی ہجری میں یہ علاقہ ترک کی اور ایران کے درمیان متنازعہ فیہ بن گیا۔ یہ کش مکش بہت پھیلی۔ بالآخر جنوبی آذربائیجان ایران میں شامل ہو گیا اور شمالی علاقے پر روس نے دستِ طمع دراز کیا۔ ۱۸۰۶ء میں باکو اور شمالی آذربائیجان پر روس کا قبضہ ہو گیا۔



۱۹۱۷ء میں بالشویک انقلاب کے بعد آذربائیجان میں ایک انقلابی تحریک نے آزادی کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ ۱۹۱۸ء میں آزادی کے متوالوں نے خود مختار حکومت کا اعلان کیا جسے آزاد دنیا کے متعدد ممالک نے تسلیم کر لیا۔ خود روس کی کمیونسٹ حکومت نے بھی اسے تسلیم کر لیا اور اس کی آزادی خود مختاری اور سالمیت میں مداخلت نہ کرنے کا اعلان بھی کر دیا، لیکن روس سونے کی اس چڑیا سے زیادہ دیر تک مفارقت گوارا نہ کر سکا۔ ۲۷ اپریل ۱۹۲۰ء کو سرخ افواج نے آذربائیجان پر حملہ کر دیا۔ کہا گیا، آذربائیجان کی مجلس انقلاب نے استدعا کی تھی، لیکن اس کا اصل مقصد تیل کے چشموں پر قبضہ کرنا تھا۔ یوں ۲۸ اپریل ۱۹۲۰ء کو آذربائیجان کی آزادی کا شعلہ مستعجل بجھ گیا اور سوویت جمہوریہ آذربائیجان وجود میں آگئی۔

## علی حسن سے ملاقات

ایک روز میں بازار میں کچھ ضروری خریداری کر کے ہاسٹل واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی اور بات چیت ہو گئی۔ یہی کوئی چالیس کے قریب سن ہو گا۔ مجھے وہ شکل و صورت سے بھلے گئے۔ ابھی ان سے بات کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ خود انہوں نے مخاطب کر لیا۔ سب سے پہلا فقرہ وہی تھا، جو یہاں میں کئی بار سن چکا تھا:

”کیا تم مسلمان ہو؟“

میں نے کہا: ”الحمد للہ!“

میری بات سن کر ان کے چہرے پر لبثاشت دوڑ گئی اور فوراً میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر مجھے ساتھ لیے ہوئے اس طرح چلنے لگے، جیسے ہم برسوں کے آشنا ہوں۔ مجھے ان کی بے تکلفی پر حیرت بھی ہوئی اور قدرے پریشانی بھی۔ ایک اجنبی ملک (وہ بھی روس) میں کسی اجنبی سے سرراہے آشنائی مہنگی پڑ سکتی ہے۔ انہوں نے شاید میری پریشانی بھانپ لی۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ بھی میری طرح مسلمان ہیں اور ان کا نام علی حسن ہے۔ میں چونکہ آذربائیجانی سے نابلد تھا، اس لیے میں مجبوراً روسی زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنانا پڑا۔ انہیں اس بات پر بہت لال ہو کر کہ ہم دونوں ”کفر کی زبان“ (روسی) بول رہے ہیں۔



میں نے علی حسن سے کہا: ”اسلام ایک عالمگیر دین ہے، اس لیے اس کی کوئی مخصوص زبان نہیں۔ جس زبان کو بھی مسلمان بولتے ہوں، وہی اسلامی زبان ہے۔ مگر وہ کسی طور روسی زبان کو اسلامی زبان ماننے پر تیار نہ ہوئے۔ میں نے ان سے پوچھا، کیا وہ فارسی نہیں جانتے؟ تو انہوں نے بتایا کہ وہ ٹوٹی پھوٹی فارسی بول سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری زیادہ تر گفتگو فارسی میں ہوئی۔ علی حسن نے بتایا کہ آذربائیجان کے اکثر باشندے فارسی جانتے ہیں۔ انہوں نے بڑے فخر سے کہا:

”فارسی کے مشہور شاعر نظامی گنجوی بھی آذربائیجان کے رہنے والے تھے۔“  
 علی حسن نے مجھ سے افغانستان کے دینی حالات پوچھے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ وہاں ہزاروں عالی شان مساجد ہیں جہاں پانچ وقت خدا کا پاک نام بلند ہوتا ہے اور لوگ اپنے مذہبی معاملات میں بالکل آزاد ہیں، تو وہ بہت خوش ہوئے۔

### چند گھنٹے ایک مسلمان گھرانے میں

کچھ دیر تک ساتھ چلنے کے بعد جب میں اپنے ہاسٹل کے قریب پہنچ گیا اور میں نے علی حسن صاحب سے اجازت چاہی، تو انہوں نے ملتیجیانہ لہجے میں مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ میں نے بہت معذرت کی، یہ بھی کہا کہ میں مقامی لوگوں سے رابطہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے، مگر ان کے پیہم اصرار سے مجبور ہو گیا۔ پھر مجھے روس میں کسی مسلمان کے گھر جانے کی آرزو بھی تھی۔ جب ہم چلنے لگے تو علی حسن نے مجھے ہدایت کی کہ میں ان سے چند قدم پیچھے رہ کر چلوں۔ میں سمجھ گیا وہ چاہتے تھے کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں ان کے گھر جا رہا ہوں۔ اس مرحلے پر میرے دل میں پھر شک گزرا۔ روسی کہتے ہیں:

”اگر تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو اپنے آپ پر بھی یقین نہ کرو اور اپنے باپ پر بھی بھروسہ نہ کرو، ہو سکتا ہے، وہ تمہاری جاسوسی پر مامور ہو۔“

لے یہ ۱۹۷۱ء کا واقعہ ہے۔ تب افغانستان آزاد تھا۔ افسوس! آج وہاں کے حالات آذربائیجان سے بھی بدتر ہو چکے ہیں۔



راستے میں چلتے ہوئے کئی بار دماغ نے کہا، لوٹ چلو مگر، دل کشاں کشاں علی حسن کے پیچھے لیے جاتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک عمارت کی تیسری منزل پر واقع ایک خوبصورت فلیٹ میں کھڑے تھے۔ علی حسن نے مجھے اپنی اہلیہ اور دو خوبصورت معصوم بچوں سے متعارف کرایا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ گھر کی سجاوٹ میں مجھے خالص اسلامی مذاق نظر آیا۔ کرسیاں صوفہ سیٹ اور چینی قالین کے علاوہ ٹیلی وژن سیٹ بھی تھا۔ دیواروں پر آرٹسٹری چینی بھی موجود تھیں، مگر کسی چیز سے بھی بے جا اسراف یا غیر ضروری نمائش کا احساس نہ ہوا۔ تھوڑی دیر میں گھر کے دوسرے افراد بھی آگئے۔ علی حسن صاحب کی دو بیٹیاں اور ایک غیر شادی شدہ بھائی مختلف تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم تھے۔ وہ بھی بڑے خلوص سے ملے۔

آذربائیجان کے اس مسلم گھرانے کے تمام افراد نے جس خلوص اور اسلامی اخوت کا مظاہرہ کیا اسے میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ ڈرائنگ روم کے تمام پردے گر گئے ہوئے وہ مجھے یوں گھیرے میں لیے ہوئے باتیں کر رہے تھے جیسے میں ان کا برسوں سے بچھڑا ہوا عزیز تھا۔ وہ افغانستان کے مسلمانوں کے بارے میں جزئیات تک پوچھتے اور آذربائیجان کے حالات کے ان دیکھے گوشے دکھاتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد علی حسن کی معتمد والدہ بھی تشریف لے آئیں۔ ان کے چہرے پر تقدس اور شفقت کا امتزاج تھا۔ بڑی محبت سے ملیں، مجھے دعائیں دیں۔ پھر کھانے پینے کی چیزیں لائی گئیں۔ علی حسن صاحب نے مجھے لذتِ کام و دہن کی دعوت دیتے ہوئے کہا :

”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو شراب پیش نہیں کر سکتا۔ ہماری روایات قدرے مختلف ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کے لیے ہمارے ہاں شراب پیش نہیں کی جاتی۔“

اس پر میں نے انہیں کہا :

”ہمارے دیس میں تو اس چیز کو سخت قابلِ نفرت خیال کیا جاتا ہے۔“

میری بات سن کر سب کے چہروں پر رونق آگئی۔ خصوصاً علی حسن کی والدہ بے حد خوش ہوئیں۔ مجھے حق کی راہ پر استقامت کی دعا دیتے ہوئے بولیں :

”بیٹا ! پہلے ہمارے معاشرے میں بھی شراب سے نفرت کا یہی عالم تھا، لیکن افسوس



ایسا "انقلاب" آیا کہ جو چیزیں ناپاک خیال کی جاتی تھیں آج وہی سب سے زیادہ پسندیدہ بھیرائی جاتی ہیں۔ ایسی آفت آئی ہے کہ اب مسلمانوں کے گھروں میں بھی شراب عام ہو رہی ہے۔ علی حسن دیوار پر آدیناں تصویر کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر بتایا: "یہ میرے والد ماجد کی تصویر ہے۔ وہ آج ہم میں نہیں۔ اگر زندہ ہوتے تو ایک مسلمان ملک کے مسلمان بھائی کو اپنے ہاں آیا ہوا دیکھ کہ کتنے خوش ہوتے۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ انہوں نے میری ایسی تربیت کی ہے کہ نیکی اور برائی میں فرق محسوس کر سکوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے بھی اپنے دادا جان کے راستے کو اپنائیں۔"

### عربی زبان پر پابندی

آذربائیجان کی سرزمین اسلامی دور میں علماء، فقہاء، دانشوروں اور شاعروں کا گہوارہ رہی ہے۔ جس دور میں پڑوسی ممالک میں وحشت و بربریت کا راج تھا، یہاں تہذیب و انسانیت کی عمل داری تھی۔ اب وہ حالت نہیں رہی۔ صدیوں کی محنت سے تعمیر شدہ معاشرہ پچھلے چند عشروں میں برباد ہو چکا ہے۔ علی حسن نے بڑی افسردگی سے کہا:

"ہمارا رشتہ ہمارے ماضی سے کاٹا جا رہا ہے۔ ہمارے علماء، ادیبوں اور شاعروں نے جو کچھ لکھا تھا وہ گمنامی کی گہرے ڈوب چکا ہے۔ اب یہاں روسی زبان کی حکومت ہے۔ عوام کا تعلق فارسی اور عربی سے کٹ چکا ہے اور روسی رسم الخط کے جبری اجراء نے مسلمانوں کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔"

انہوں نے مجھے چند پرانی کتابیں دکھائیں۔ یہ عربی، فارسی اور آذربائیجانی میں لکھی گئی تھیں۔ علی حسن نے بتایا کہ وہ ان کتابوں کی حفاظت اپنی جان سے بھی زیادہ کرتے ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اب ان کتابوں کی کوئی عملی افادیت باقی نہیں رہی۔ اس لیے کہ لوگ صرف روسی زبان ہی لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ میرے بچے بھی انہیں نہیں پڑھ سکتے، لیکن میں نے انہیں اپنے والد کی متبرک یاد کے طور پر محفوظ رکھا ہوا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے:

"یہ ہماری شریعت ہے۔ یہی ہماری دنیا اور یہی ہماری عاقبت ہے۔"



علی حسن کے یاس انگینر لہجے کے پیچھے مجھے عزم کی پرچھائیاں دکھائی دیں جب انہوں نے

کہا :

”روسی ساری تدبیریں کرنے کے باوجود ہمیں اسلام سے متنفر نہیں کر سکے۔  
اس محکوم ریاست کے نوے فی صد لوگ آج بھی اس آس پر زندہ ہیں کہ ایک  
دن آٹے کا جب ہم کفر کے اندھیروں سے نکل جائیں گے اور دوسری آزاد مسلم  
قوموں کی طرح ہم بھی اپنی مرضی کی زندگی گزاریں گے۔ پھر کوئی ہمیں قرآن پڑھنے  
سے نہ روک سکے گا۔“

علی حسن نے بتایا، باکو کے ہزاروں گھروں میں خفیہ طور پر نماز پڑھی جاتی ہے۔ جو لوگ  
بظاہر کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہیں، وہ بھی جب گھروں میں جاتے ہیں، تو خدا کے ذکر پر  
مصروف ہو جاتے ہیں چنانچہ گزشتہ دنوں ایک روسی رہنما نے تقریر کرتے ہوئے کہا :

”آذربائیجان کے کمیونسٹ روس کے وفادار نہیں ہیں، ان کی ایک جیب میں  
کمیونسٹ پارٹی کا شناختی کارڈ ہوتا ہے اور دوسری جیب میں قرآن۔“

علی حسن کے گھر سے جانے کو میرا جی نہ چاہتا تھا، لیکن ہاسٹل سے اتنی دیر غیر حاضر رہنا  
ٹھیک نہ تھا۔ جب میں نے اجازت مانگی تو سب نے دوبارہ ملاقات کا وعدہ لیا۔ پھر بڑی  
احتیاط سے گھر کے باہر کا جائزہ لے کر مجھے باہر نکالا گیا۔ علی حسن تو چاہتے تھے کہ مجھے ہاسٹل  
چھوڑ آؤں، مگر احتیاط کے پیش نظر میں نے انہیں باہر جانے سے روک دیا۔ ہاسٹل پہنچا، تو  
مجھے ڈر تھا کہ زیادہ دیر باہر رہنے پر جواب طلبی نہ ہو جائے، لیکن خیریت گزری کسی کے نوٹس  
میں یہ بات نہ آئی تھی۔

## قرآن موجب برکت ہے

قرآن پاک سے مسلمانوں کی عقیدت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ امتحان کے  
دنوں میں آذربائیجانی طلبہ منہ اندھیرے میرے کمرے میں آجاتے اور ملتجی ہوتے کہ میں چند  
لمحے کے لیے قرآن پاک ان کو دے دوں، پھر وہ مصحف پاک کو کھولے بغیر بوسہ دے کر



مجھے لوٹا دیتے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قرآن پاک کو چھونے سے بھی انسان امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ میں نے کئی طلبہ کو سمجھایا کہ قرآن پاک امتحان پاس کرانے کے لیے نہیں، دلوں میں انقلاب لانے کے لیے آمارا گیا ہے، لیکن وہ ہمیشہ کہتے: ”تم نہیں جانتے، اس لیے کہتے ہو۔ ہم قرآن کا معجزہ کئی بار اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں“

امتحان سے فارغ ہوتے تو چمکتے چہروں کے ساتھ پھر میرے پاس آتے اور پھر وہ قرآن پاک کو اٹھاتے، آنکھوں سے لگاتے اور بوسہ دے کر واپس رکھ دیتے۔  
دکانوں پر جانا ہوتا تو دکاندار مجھ سے بہت اکثر ایک آیت لکھوا کر پاس رکھ لیتے۔ میرے استفسار پر بتایا جاتا، قرآن باعث خیر و برکت ہے۔

### اشیائے ضرورت کی کمیابی

روس جا کر انسان کو جن مشکلات سے سابقہ ہوتا ہے، ان میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ بازار میں اشد ضرورت کی چیزیں بھی نہیں ملتیں اور ملتی ہیں تو انتہائی ناقص معیار کی۔ ہاگو میں جب بھی جوتا یا کپڑا خریدنے نکلا، گھنٹوں کی تلاش کے بعد بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔ پہلے پہل تو ناواقفی تھی، یہ سوچتا رہا، ابھی سارے بازار نہیں گھوما، شاید اچھی چیزیں کسی دوسرے بازار میں ہوں گی، لیکن جب پورے شہر کی خاک چھان ماری اور لوگوں سے خاصی معلومات بھی حاصل ہو گئیں، تو تپہ چلا کہ معیاری چیزیں صرف بلیک مارکیٹ میں ملتی ہیں۔ مگر وہ انتہائی مہنگی ہونے کے علاوہ مشکل الحصول بھی تھیں۔ شہر کے سٹوروں پر بچنے والے جوتے اتنے غیر معیاری تھے کہ انہیں پہننے سے تنگ پاؤں پھرنے زیادہ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ کپڑے کے خواب رنگ اور بھدی فٹنگ کو دیکھ کر مجھے اپنا غریب ملک یاد آ جاتا تھا کہ وہاں کی غیر ترقی یافتہ ٹیکسٹائل میں بھی عمدہ کپڑا تیار کرتی ہیں اور وہاں عمدہ جاپانی کپڑا بھی انتہائی سستے داموں مل جاتا ہے۔

غیر ملکی طلبہ روس میں جس چیز کو دیکھ کر سب سے زیادہ حیران ہوتے ہیں، وہ روسیوں کا لباس ہے۔ افریقہ اور لاطینی امریکہ کے غریب اور احساس کمتری کے شکار طلبہ جب اپنے ہم کلاس روسیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو فخر سے تن جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں یہی چیز روسی طلبہ اور



طالبات کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ کچھ روسی طلبہ محض اس لیے غیر ملکیوں سے روابط بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان سے امریکہ، فرانس یا اٹلی کی بنی ہوئی پتلونیں اور بوشرٹ خرید سکیں۔

یہ بات بہت اچھی ہے کہ روسی حکومت غیر ملکی مصنوعات کی درآمد کے خلاف ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ عوام میں غیر ملکی فیشن اپنانے میں مسابقت ہو، لیکن اسی اچھائی کا تاریک پہلو یہ ہے کہ روس کی ملیں اور فیکٹریاں عوام کے ذوق کا لحاظ کیے بغیر ”پیداوار بڑھانے“ میں لگی رہتی ہیں۔ روس کے اکثر لوگ روسی ملوں کے بنے ہوئے کپڑوں کو اسی لیے پسند نہیں کرتے کہ ان میں نفاس ہوتی ہے نہ تنوع۔ پھر روس کی ٹیلرنگ شاپس میں سلائی بھی بے حد ناقص ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے روسیوں کا ذوق سلیم بے حد مجروح ہوا ہے۔ اگر آپ کسی شخص کو انتہائی تیز رنگوں کے شوخ کپڑے پہنے ہوئے جاتے دیکھیں تو یہ سمجھنے کی کوشش نہ کریں کہ وہ کوئی منچلا طالب علم یا لالہ نوجوان ہے، ہو سکتا ہے یہی شخص یونیورسٹی میں پڑھاتا ہو۔ اس بے ذوقی کے باوصف اچھے لباس کی خواہش نہیں مرقی۔ کوئی شخص اچھا لباس پہنے ہوئے دکھائی دے، تو بے تکلف اس سے پوچھ بیٹھتے ہیں: ”سناؤ بھی، یہ کپڑے بیچو گے؟“

اب آپ لاکھ انکار کریں، غصے کا اظہار کریں، مگر وہ مسلسل اصرار کیے جائیں گے۔ بڑے بڑے لالچ دیں گے۔ اتنی بڑی رقم کی پیش کش بھی کر دیں گے کہ انسان اپنے گلے کے کپڑے اتار دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے بعض غیر ملکی طلبہ اور سیاح روسیوں کی اس کمزوری سے ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ کپڑے کی قیمت کے علاوہ ناجائز جنسی تعلقات بھی استوار کر لیے جاتے ہیں۔ جو لوگ اپنے کپڑے کسی قیمت پر فروخت نہ کریں، انہیں بھی بعض اوقات نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چوری اور مار پیٹ تو عام سی بات ہے۔

مالی کا ایک طالب علم، جو ہمارے ہاسٹل میں مقیم تھا، گھومنے کے لیے بازار گیا، تولے تن کے تمام کپڑوں سے محروم کر دیا گیا۔ اس کی جان تو بچ گئی، مگر شدید سردی کے عالم میں اسے برہنہ حالت میں ہاسٹل آنا پڑا۔ جس کے باعث وہ نمونیہ میں مبتلا ہو گیا اور کئی روز تک صاحب فراش رہا تھا۔



## روس میں چوری عام ہے

روس میں چوری کی وبا عام ہے۔ یوں تو بڑی بڑی وارداتیں ہوتی ہیں، لیکن میرے مشاہدے اور تجربے میں معمولی نوعیت کے واقعات ہی آئے۔ ہاسٹلوں میں نقب زنی کی سینکڑوں وارداتیں ہوتی ہیں۔ نقدی، ریڈیو، گھڑیاں، کپڑے اور سامان آرائش اڑا لیا جاتا ہے۔ چوروں نے اپنے فن میں ایسی مہارت حاصل کر رکھی ہے کہ روزِ روشن میں چوری کر کے لاپتہ ہو جاتے ہیں اور پھر ان کا سراغ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ ایک دفعہ جب میں کریمیا سے باکو واپس آیا تو ہاسٹل کے وارڈن نے مجھے نچلی منزل پر کمرہ دے دیا۔ اس کمرے میں میرے علاوہ دو طالب علم اور بھی تھے۔ ایک روز میں عصر کے وقت کمرے سے باہر نکلا، تو جاتے وقت اپنے ساتھیوں سے اپنے سامان کی دیکھ بھال کے لیے کہہ کر گیا۔ شام کے بعد واپس آیا تو ہاسٹل کی ایک ملازمہ نے مجھے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ وہ مجھے نصیحت کرنا چاہتی تھی کہ میں جب کمرے سے باہر جاؤ تو کھڑکی اچھی طرح بند کر کے جاؤں، کہیں ایسا نہ ہو کوئی شخص میری چیزیں اڑا لے۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

میرا اندازہ تھا کہ میرے ساتھی جاتے وقت کھڑکی کھلی چھوڑ گئے ہوں گے، کمرہ کھولا۔ اندر گیا، چیزوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ چار پائی کے نیچے رکھا ہوا میرا ٹیپ ریکارڈر غائب ہے۔ بہت پریشان ہوا۔ خاصی دیر ادھر ادھر تلاش کیا۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ شاید میرے روم میٹ باہر جاتے ہوئے میرا ٹیپ ریکارڈر کہیں رکھ گئے ہوں یا ساتھ لے گئے ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آ گئے، تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا، چلتے وقت وہ کھڑکی بند کر کے گئے تھے، لیکن ممکن ہے چٹخنی چڑھانا بھول گئے ہوں۔

میں پریشانی کے عالم میں ہاسٹل کی اسی ملازمہ کے پاس آیا۔ خیال تھا، شاید اس نے مجھے تنبیہ کرنے کی غرض سے ٹیپ ریکارڈر پاس رکھ لیا ہو گا۔ میری بات سنتے ہی بولی: ”دیکھا، میں نہ کہتی تھی کھڑکی بند کر کے جایا کرو۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا“۔ میں نے لاکھ کہا، کھڑکی بند تھی



صرف چٹخنی مٹی ہوئی نہ تھی، مگر اس نے اپنی منطق جاری رکھی کہ میں نے تمہیں سمجھایا تھا، مگر تم پراثر نہ ہوا۔ مجھے شبہ ہوا کہ اسی ملازمہ نے واردات نہ کی ہو! مگر اس سے کہنا مشکل تھا۔ سب نے رائے دی کہ پولیس سٹیشن میں رپورٹ کرو۔

چوری کی رپورٹ درج کرانے پولیس سٹیشن گیا تو پولیس سٹیشن کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مختلف شکایات کی رپورٹیں لے کر آنے والوں کا ہجوم تھا۔ اکثر شکایات چوری کی تھیں۔ مجھے خاصی دیر تک اپنی باری کا انتظار کرنا پڑا۔ اس اثنا میں پولیس کے دفعتے دار افسروں کا رویہ دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ لوگوں سے بڑی درشتی کے ساتھ سوال و جواب کرنے کے بعد ان کی رپورٹ درج کرتے۔ مجھے بھی جرح کا سامنا کرنا پڑا۔ پولیس افسر نے کہا رپورٹ تو درج کر لیتا ہوں، لیکن سامان کی بازیابی کی امید بہت کم ہے۔ اس نے مجھے ہدایت کی۔ آئندہ کے لیے اپنے سامان کی خود حفاظت کرو، پولیس افسر کی بات درست ہی نکلی، مجھے اپنا ٹیپ ریکارڈ نہ مل سکا۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ آیا پولیس نے اس کی بازیابی کے سلسلے میں کوئی کارروائی کی بھی یا رپورٹ درج کر کے معاملہ سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔

## ریاضی کے استاد

ریاضی کے استاد سیفورد آذربائیجانی مسلمان تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں مسلمان ہوں اور اسلام سے وابستگی پر مجھے کوئی شرمندگی بھی نہیں ہے، تو انہوں نے مجھے اپنے در و درل کا محرم بنالیا۔ وہ اپنی قوم کی حالت زار پر کڑھٹنے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی ترقی اور سر بلندی کے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ مجھے آذربائیجان کے ماضی اور حال کی تاریخ کے حوالوں سے بتاتے کہ مسلمانوں نے کس طرح اپنی آزادی کی خاطر قربانیاں دیں، اپنی سرزمین کے چتے چتے کی خاطر لڑائیاں لڑیں، لیکن آخر کار وہ مکر و فریب کے حربوں کے سامنے بے بس ہو گئے۔ انہوں نے بتایا، ۱۹۱۹ء میں کیونسٹ کانفرنس میں روسی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ تمام لوگ اپنے عقائد، مذہبی رسوم اور قومی روایات کے مطابق زندگی گزار سکیں گے، لیکن کمیونسٹوں نے مسلمانوں پر غالب آ جانے کے بعد کسی وعدے کا پاس نہ کیا۔



انہوں نے بتایا کہ روسی قبلے سے پہلے عربی یہاں کی سرکاری زبان تھی جو کمیونسٹوں کے آنکھوں میں کاٹنا بن کر چھیننے لگی۔ سب سے پہلا دار عربی زبان پر کیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں عربی رسم الخط کو ختم کر کے اس کی جگہ روسی زبان اور روسی رسم الخط کو قانونی حیثیت دے دی گئی۔ یہ آذربائیجان کا اسلامی تشخص ختم کرنے کا آغاز تھا۔ رسم الخط کی حد تک روسی اپنے منصوبے میں کامیاب ہو چکے ہیں، لیکن وہ لوگوں کے دلوں سے اسلام کے نقوش نہیں مٹا سکتے۔ آج بھی بہت سے لوگ عربی زبان سے آشنا ہیں اور وہ خاموشی سے اس زبان کو اپنی نئی نسل تک منتقل کر رہے ہیں۔ روسی اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ بھی ہیں۔ روس کے سرکاری مجلے ”مسائل فلسفہ“ میں مرونیف نامی اشتراکی دانشور لکھتا ہے :

”مسلمان جمہوریتوں کے قوم پرست عناصر اپنے مذہبی رسم الخط کے ساتھ بدستور وابستگی رکھے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ عوام میں لسانی تعصب پیدا کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو روسی تہذیب و تمدن سے اور زبان و ثقافت سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے افراد کی کوششیں روسی اقوام کی فلاح و بہبود سے متصادم ہیں۔“

### خوشامد کا بول بالا

روس میں ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دوسرے قلم کاروں کا کام بے حد آسان ہے۔ ان کے شعروں اور ادبی کاوشوں کے موضوعات پہلے سے مخصوص اور متعین ہیں۔ اس لیے انہیں زیادہ سوچ بچار کی زحمت سے ممکنہ حد تک بچایا جاتا ہے۔ پھر بھی اگر کسی ادیب اور شاعر کے ذہن میں خود سری کے جراثیم پیدا ہو جائیں، تو ایک ادھ مرتبہ ایسی تنبیہ کر دی جاتی ہے کہ دوسروں کے بھی کان ہو جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ مخصوص نظریے اور متعین موضوعات پر ہی طبع آزمائی کرتے ہیں، انہیں انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے۔ خصوصاً اسلامی علاقوں کے ادیبوں کو بڑے بڑے ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ ان کی موت کے بعد ان کے بڑے بڑے مجسمے تیار کیے جاتے ہیں اور سڑکوں، بازاروں کے نام ان کے ناموں پر رکھے ہیں۔ مثال کے



طور پر قرغیزستان کے شاعر علی توکو مباائف نے جب روس کے گن گاتے ہوئے کہا :  
 ”قرغیزستان کا اپنا کوئی وجود نہیں، ترکستان کے لوگ اپنے مسائل خود حل نہیں  
 کر سکتے۔ یہ صرف اور صرف روس کے اندر رہتے ہوئے اور روسی عوام کے تعاون  
 سے ہی ممکن ہے۔“

تو علی توکو مباائف کو شاعری کا بلند پایہ میڈل اور اعزاز دیے گئے، مگر اس سے کہیں  
 بڑے قرغیز شاعر جنہوں نے اپنے ضمیر کے خلاف کھنے سے گریز کیا، نہ صرف ایسے انعامات  
 سے محروم رہے، بلکہ انہیں مختلف قسم کے مصائب سے بھی گزرنا پڑا۔

آذربائیجان کے ایک شاعر نے ”دوہ کولوت“ کے نام سے کتاب لکھی جس میں موجودہ  
 حکومت کے بارے میں کسی قسم کی بات کہے بغیر آذربائیجان کی عظمت رفتہ اجاگر کی گئی تھی۔  
 حکومت کے علم میں یہ بات آئی تو اس کتاب کے مواد کا جائزہ لینے کے لیے باقاعدہ کمیٹی تشکیل  
 دی گئی۔ اس کمیٹی نے کتاب کے مصنف پر سخت تنقید کی۔ بعد میں ”پراودا“ نے اس رپورٹ  
 کی روشنی میں مذکورہ کتاب پر یوں تبصرہ کیا :

”ایک مصنف کی طرف سے دوہ کولوت کے نام سے انتہائی مضر کتاب شائع کی  
 گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا مصنف سیاسی  
 شعور سے بے بہرہ ہے اور اسے اپنی ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہیں ہے۔  
 ہمیں چاہئے کہ نظریاتی انحراف، بورژوائی نظریات اور قوم پرستی کے خلاف اپنی  
 جدوجہد میں شدت پیدا کریں۔“

بعد میں اس کتاب پر پابندی لگا دی گئی۔ معلوم نہیں کتاب کے مصنف پر کیا گزری۔

---

۱۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ روس میں کوئی نجی چھاپہ خانہ موجود نہیں۔ تمام کتابیں رسائل  
 اور اخبارات سرکاری مطابع میں چھپتے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں کوئی بات حکومت کے  
 خلاف تھی تو کبھی چھپ ہی نہ پاتی۔ اختلاف بعد میں اس بات پر پیدا ہوا کہ اس میں آذربائیجان  
 کے ماضی کا ذکر تھا۔ وہ ماضی جو مسلمانوں کا تھا۔



ازبکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری نیاکف نے ایک بیان میں مطالبہ کیا :  
 ” ان تمام قوم پرستانہ تخلیقات کو تلف کر دیا جائے جو بغیر مقصد کے تخلیق کی گئی  
 ہیں، ان کے بجائے روسی ادب کے شہ پاروں کو منظر عام پر لانا چاہئے۔ لوگ فرسودہ  
 تخلیقات کے بجائے روسی ادیبوں کے فنکاروں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اسی  
 لیے مختلف جمہوریتوں کے لوگوں نے روسی ادیبوں، لٹیکن، ٹالسٹائی، چیخوف اور  
 دوستووسکی کی کتابوں کے تراجم اپنی زبانوں میں کیے ہیں “

### تاجکوں پر ” مہربانی “

گزشتہ کچھ برسوں سے اسلامی مقبوضہ ریاستوں کے بارے میں روسی پالیسی کا ایک خصوصی  
 پہلو یہ رہا ہے کہ جمہوریہ تاجکستان کے عوام کو ایسی مراعات دی گئی ہیں جو دوسری اسلامی ریاستوں  
 کو حاصل نہیں۔ مجھے آذربائیجان میں متعدد مسلمانوں نے بتایا کہ تاجکوں کو دی جانے والی نام نہا  
 آزادیاں دراصل روسی حکومت کا پھندہ ہیں۔ چونکہ تاجک قوم افغانستان اور ایران کے پڑوس  
 میں آباد ہے۔ پالیسی وضع کرنے والوں کا خیال ہے کہ اس طرح افغانوں اور ایرانیوں کو رجھایا جا  
 سکتا ہے۔ بالخصوص ان تاجکوں میں بے چینی پیدا کی جاسکتی ہے جو ان ہمسایہ ممالک میں رہتے  
 ہیں۔ پھر جب روس نے علانیہ کہا کہ افغانستان کے زیادہ تر لوگ تاجک نسل سے تعلق رکھتے  
 اور اپنے ہم زبان روسی تاجکوں کے ساتھ متحد ہونا چاہتے ہیں، تو اس راز سے پردہ اٹھا۔ نیو  
 ٹائمز میں مشر مالکوف کے مضمون میں کہا گیا کہ ایران اور افغانستان میں روسی ماہرین کے مطابق ست  
 سے بارہ ملین تک تاجک آباد ہیں۔ بالکل اسی طرح کی بات ٹھلرنے کی تھی جب اس نے چیکو سلواکیہ  
 اور آسٹریا پر قبضہ جانے کا پروگرام بنایا تو اس کے جواز میں کہا تھا :

” چیکو سلواکیہ اور آسٹریا کے زیادہ تر باشندے جرمن نژاد ہیں اور آبائی وطن  
 کے ساتھ پھر سے متحد ہونا چاہتے ہیں “

۱۹۵۰ء میں تاجکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک ترجمان اخبار میں نعمت اللہروف کا ایک

مقالہ شائع ہوا جس میں مقالہ نگار نے ٹالین کے حوالے سے لکھا تھا :



”کامریڈ ٹالین تاجکوں کو وسط ایشیا کے قدیم ترین باشندے سمجھتا ہے۔“

تاجک — یعنی تاج کے مالک۔ یہ وہ قوم ہے جس میں فردوسی، رودکی، خیام،

اور حافظ شیرازی جیسی نابغہ روزگار شخصیات پیدا ہوئیں۔ یہ نری پور، زروانیست،

کہ ایران اور افغانستان نے تاجکوں کو اپنے پیچھے باندھ رکھا ہے۔“

تاجکوں کے ساتھ مہربانی کے سلوک کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ماضی میں بھی اس قوم پر آفتیں

نہیں توڑی گئی ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں تاجکستان میں حریت پسندوں کی جدوجہد کو جبر و استبداد سے کچلا

گیا یہاں تک کہ جمہوریہ تاجکستان کے وزیراعظم کو، جو کٹر کمیونسٹ تھا، وزارتِ عظمیٰ سے ہٹا دیا

گیا اور اس کے سینکڑوں ساتھیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔

## ایک لطیفہ

دوس میں ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ مجھے یہ باتکو میں ایک دوست نے سنایا تھا۔

اس سے روسی معاشرے کی اندرونی عکاسی ہوتی ہے۔ لطیفہ کچھ یوں ہے :

ایک آدمی نے خاصی عمر جنت میں عیش و آرام کرتے ہوئے گزار لی، تو اس کے دل میں

دورخ دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ منتظمین کو درخواست دی کہ اسے چند ہفتوں کے لیے سیر

ویاحت کرنے کی اجازت دی جائے، چنانچہ اس کے لیے دورخ کا دروازہ وا کر دیا گیا۔

دورخ اس کے اندازے کے بالکل برعکس نکلی۔ اندر جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ہر طرف رقص و سرود

کا بازار گرم ہے۔ خوبصورت دوشیزائیں مختلف سازوں کی دھنوں پر بدن کے مختلف زاویوں

کی نمائش کر رہی ہیں۔ سیر و تفریح کے لیے آراستہ پارک اور باغات ہیں۔ غرضیکہ ہر سورت گنجی چھائی

ہوئی ہے۔ اسے یہ ماحول اتنا پسند آیا کہ مقررہ وقت پر واپس جانے کے بجائے چند روز

دورخ ہی میں رہنے کی مزید اجازت مانگی۔ یہ درخواست بھی منظور کر لی گئی اور وہ کئی روز تک

دورخ کی ”پر لطف“ زندگی کے مزے لوٹتا رہا۔ اس شخص کو دورخ اتنا پسند آیا کہ اس نے

ہمیشہ کے لیے دورخ میں رہنے کی درخواست بھیج دی۔ اس درخواست کو بھی شرفِ قبولیت

حاصل ہوا، لیکن دورخ کا مستقل قیام قطعی مختلف ثابت ہوا۔ درخواست منظور ہوتے ہی



ماحول میں اچانک تبدیلی آگئی۔ نگران فرشتوں کی مہربان نگاہیں بدل گئیں۔ اُسے اٹھا کر آگ کے الاؤ میں لے گئے۔ آگ سے گھبرا کر بھاگا تو خوفناک سانپوں اور اژدہوں میں گھبر گیا۔ بچھو اور زہریلے کٹرے اسے کاٹنے لگے۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ چلا یا: "خدا را مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تو دوزخ میں جانے کی درخواست کی تھی۔ تم کہاں لے آئے؟"

جواب ملا: "یہی تو ہے دوزخ جہاں مستقل رہائش کیلئے تم نے درخواست دی تھی؟" پریشان حال شخص نے کہا: "پہلے تو دوزخ ایسا نہ تھا۔ اب اچانک اسے کیا ہو گیا؟" اسے بتایا گیا کہ تب تمہارے پاس سیاحت کا دینا تھا۔ اب مستقل شہریت کا پروانہ ہے۔ مستقل شہریت اختیار کرنے والوں کو دوزخ کے اصلی مزے چکھنے پڑتے ہیں۔

روس کی سیر و سیاحت کرنے والوں کو بھی ماحول کی زنگینیاں بہت پسند آتی ہیں، لیکن جن کو مستقل شہری ہونے کا اعزاز حاصل ہے، ان کی حالت زیادہ قابل رشک نہیں ہے۔ مجھے چونکہ اس "جنت" میں کئی برس گزارنے کا فخر حاصل ہوا اس لیے میں نے مستقل شہریوں کی زندگی کے ان دیکھے گوشے بھی دیکھ لیے۔

## آبادی کا تبادلو

روسی غلبے سے نجات پانے کے لیے مسلمانوں میں کئی تحریکیں ابھریں، لیکن قوت اور وسائل کی کمی نے انہیں پھنپنے نہ دیا۔ مسلمانوں کی مزاحمت کو مستقل طور پر ختم کرنے کا یہ انتظام کیا گیا کہ ان کی پوری آبادیاں جلادطن کر کے روسی علاقوں میں آباد کر دی گئیں۔ زیادہ سرکش قبائل کو سائبیریا کے برف زاروں میں منتقل کر کے ان کی جگہ روسیوں کو آباد کر دیا گیا۔ آبادی کے تبادلے کی ایک مثال قازقستان کی ہے۔

۱۹۱۱ء میں پورے قازقستان میں ۱۵,۳۴,۰۰۰ روسی النسل لوگ آباد تھے۔ ۱۹۱۷ء میں

۱۔ دنیا سے روس کا اصلی چہرہ چھپانے کے لیے اہتمام کیا گیا ہے کہ سیاحوں کو مخصوص شہروں کے علاوہ ہزاروں چھوٹے شہر، قصبے اور دیہات عام سیاحوں کے لیے ممنوعہ علاقے شمار ہوتے ہیں۔



بالشویک انقلاب آنے کے ساتھ ہی انتقالِ آبادی کا سلسلہ تیز ہو گیا اور صرف نو سال بعد ۱۹۲۶ء میں روسیوں کی آبادی تقریباً دگنی ہو گئی۔ اسی عرصے میں قازقوں کی آبادی ۳,۹۰,۰۰۰ سے کم ہو کر ۳,۰۹,۰۰۰ رہ گئی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پندرہ برس کے عرصے میں قازقوں کی آبادی میں کوئی اضافہ نہ ہوا تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ ہر پانچواں قازق نقل مکانی کر گیا۔ جب کہ اس عرصے میں ایک ملین سے زیادہ روسی وہاں آباد ہوئے۔

یہی حال دوسری مسلم آبادیوں کا ہوا۔ آذربائیجان میں ۱۹۲۲ء تک روسیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ ہاکو کے تیل کے کارخانوں میں چار روسی کارکنوں کے مقابلے میں صرف ایک آذربائیجانی رہ گیا۔ آذربائیجانی مزدوروں سے وہ کام لیا جاتا تھا جو روسی خود نہ کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں آذربائیجان کے تعلیمی اداروں میں روسی طلبہ کی تعداد مقامی طلبہ سے بڑھ گئی؛ چنانچہ اعداد و شمار کے مطابق غیر مقامی (روسی) طلبہ کی تعداد ۲۲,۸۰۰ کے مقابلے میں مقامی طلبہ (آذربائیجانیوں) کی تعداد ۲۰,۶۰۰ رہ گئی تھی۔ گزشتہ تین عشروں میں یہ تفاوت تیزی سے بڑھتا رہا ہے۔

### نوجوانوں کا دینی ذوق

آذربائیجان کے عوام حکومت کے خلاف ناراضی کا اظہار کھلم کھلا کرتے ہیں۔ خصوصاً نوجوان بہت بے باک ہیں۔ حالانکہ روسی معاشرے میں اظہار خیال پر کڑی پابندیاں ہیں اور اختلاف کو بغاوت سمجھا جاتا ہے۔ یہیں بہت سے آذربائیجانی طلبہ سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا، بہت کم کسی نے روس کی تعریف کی۔ ہر ایک حکومت کی برائی کرتا اور علانیہ طور پر اظہارِ ناراضی کرتا تھا۔ ایک طالب علم علیوف کے افغان طلبہ سے نہایت اچھے مراسم تھے۔ میرے ساتھ وہ خاص باتے کلف تھا۔ وہ اکثر نماز کے وقت میرے کمرے میں آ جاتا اور میرے ساتھ مل کر نماز ادا کرتا تھا۔ ایک روز میں اس کے کمرے میں تھا۔ وہ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک افغان طالب علم کمرے میں داخل ہوا۔ اس طالب علم کا تعلق پرچیم پارٹی سے تھا۔ اس نے جب علیوف کو حالتِ نماز میں دیکھا تو مذاقاً کہنے لگا:

”او بابا تو ہم بخدا مارا شرمندی“ (اے بابا بخدا تم نے میں بھی شرمادیا)

علیوف نماز سے فارغ ہوا تو افغان لڑکے سے پوچھنے لگا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ پرچیم



طالب علم نے کہا کہ جب وہ کسی آذربائیجانی مسلمان کو نماز پڑھتا دیکھتا ہے تو اسے بہت شرمندگی ہوتی ہے اس لیے کہ یہ کمیونزم کی ناکامی ہے۔ وہ ساٹھ برس میں بھی لوگوں کے دلوں سے اسلام کی محبت نہ نکال سکا۔ اس پر دونوں کے درمیان طویل بحث چھڑ گئی۔ افغان طالب علم کا لہجہ استہزائیہ تھا، مگر علیوف کا انداز گفتگو گہری سنجیدگی اور درود دینے ہوئے تھا۔ اس نے بڑی حسرت سے کہا:

”کاش ہم بھی آپ کی طرح آزاد ہوتے۔ افغانستان کی طرح ہماری مساجد بھی آباد ہوتیں۔ محراب و منبر سے اللہ کا نام بلند ہوتا۔ خدا آپ کو یہ روزِ بد نہ دکھائے۔

یہاں کسی کو عبادت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ تعلیمی اداروں میں اسلام پر رکیک حملے کیے جاتے ہیں، مگر ہم کمیونزم کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔“

علیوف کے لہجے کا کرب سیدھا میرے دل میں اتر گیا۔ اس نے بتایا کہ اسلام پر پابندیوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کی تڑپ مزید بڑھ گئی ہے۔ پہلے ان کو اس کی قدر نہ تھی، مگر اب وہ اس کے اصولوں اور قوانین کو دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

میرا افغان ساتھی علیوف کی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آذربائیجان کے لوگ دل و جان سے روسی حکومت اور نظام کو قبول کر چکے ہیں۔ اس پر علیوف نے کہا:

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محکوم لوگوں نے خوشامد کافن سیکھ لیا ہے اور اپنی آزادی سے محروم ہو کر بھی بظاہر مطمئن دکھائی دیتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دل سے روسی حکومت کو پسند کرنے لگے ہیں۔“

پرچی طالب علم نے کہا: ”مگر یہ بھی تو دیکھو کہ لوگوں کے اقتصادی حالات کتنے بہتر ہوئے ہیں۔ یہ سوشلزم کی برکت ہے کہ آج پورے آذربائیجان میں کوئی شخص بے کار اور بے روزگار نہیں ہے۔“

علیوف نے روس نواز افغان طالب علم کی اس بات کا جواب یوں دیا:

”کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہماری سرزمین کا ذرہ ذرہ سونا اگلتا ہے۔ پھر ہمیں اس دولت میں سے کتنا حصہ ملتا ہے۔ آپ دیہات میں جا کر دیکھیں عام لوگوں کا معیارِ زیست کس قدر پست ہے۔“



## یونیورسٹی میں داخلہ

پہلے سمسٹر کے امتحان میں میری امتیازی پوزیشن آئی تھی۔ دوسرے سمسٹر کے دوران میرے  
تجربہ معرکہ کاشکار ہوا اور ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہسپتال میں گزارا، لیکن نتیجے کے بارے میں مجھے امید تھی  
کہ اچھا ہی نکلے گا۔ اس اثنا میں فیکلٹی کے چیئرمین نے طلبہ کی رائے پوچھے بغیر یہ فیصلہ کر دیا کہ کس  
طالب علم کو یونیورسٹی میں داخلہ دیا جائے اور کسے ٹیکنیکل کالجوں میں بھیج دیا جائے۔ میں بھی خلاف  
توقع اس فیصلے کی زد میں آ گیا۔ میری خواہش کے برعکس مجھے انجینئرنگ کالج میں داخل ہونے کے  
لیے کہا گیا۔ میں کسی ایسی یونیورسٹی میں داخل ہونا چاہتا تھا، جس کا معیار تعلیم اچھا ہو۔ کسی کالج میں داخلے  
کا مطلب یہ ہوتا کہ مجھے کئی برس تک ٹکریں کھانے کے بعد ایک معمولی سے ڈپلومے پر ٹرے ختم دیا جائے  
چونکہ یہ فیصلہ امتحان لیے بغیر ہی کر دیا گیا تھا، اس لیے اکثر طلبہ کو اس سے پریشانی ہوئی، لیکن  
فیکلٹی کے اس غیر منصفانہ فیصلے پر مجھے سب سے زیادہ پریشانی ہوئی۔ ایک مہربان آذربائیجانی  
استاد نے مجھے مشورہ دیا کہ میں فیکلٹی کے ایک طرفہ فیصلے پر احتجاج کر دوں چیئرمین سے مل کر اس سے  
مطالبہ کروں کہ میں اس فیصلے کو ماننے کے بجائے امتحان دینا چاہتا ہوں۔

میں چیئرمین کے پاس گیا۔ ان سے زوردار الفاظ میں احتجاج کیا۔ ایک غیر ملکی طالب علم کے  
مطالبے کو نالٹا ان کے لیے مشکل تھا۔ پھر بھی انہوں نے خاصی شفقت سے مجھے ٹالنے کی کوشش  
کی اور کہتے تھے اتنے دن بیمار رہے ہو، امتحان کیسے دو گے؟ میں نے کہا کہ اگر میں امتحان پاس نہ  
کر سکا تو مجھے فیکلٹی کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔ امتحان ہوا، تو میں نے امتیازی پوزیشن حاصل کی۔ اس  
طرح میں یونیورسٹی میں داخلے کا جائزہ حقدار ٹھیرا۔

## نائٹروجن گیس کا موجد - لینن

اس امتحان کے دوران میں ایک لطیفہ ہوا۔ زبانی انٹرویو کے دوران جب میں سوالات کرنے  
والوں سے فارغ ہوا، تو ایک افریقی طالب علم کی باری آئی۔ اس سے نائٹروجن گیس کے موجد کا  
نام پوچھا گیا، تو اس نے قدرے تامل کے بعد عجیب و غریب جواب دیا۔ اس کا جواب تھا:



”ولادیمیر ایلیچ اولیانوف لینن“

طالب علم کا جواب سن کر بے اختیار سنس ٹپا۔ میرے ساتھی ہی امتحان لینے والے اساتذہ نے بھی بے اختیار قہقہہ لگایا۔ میرا خیال تھا اتنا غلط جواب دینے پر افریقی طالب علم کو فیل کر دیا جائے گا، لیکن ممتحن نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا :

”شاباش تمہارا جواب درست ہے۔ جاؤ تمہارا امتحان مکمل ہو گیا“

بہت ممکن ہے اس طالب علم نے روسی اساتذہ کا دل جیتنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہو یا واقعاً اس نے روسی تاریخ کی کسی کتاب میں یہ پڑھ رکھا ہو کہ نائٹروجن کا اصل موجد لینن ہی تھا نہ کہ ولادازیر۔ حقیقت یہ ہے کہ روس میں ہر کمال لینن سے منسوب کیا جاتا ہے اور کسی ایسے کام کو کمال ہی نہیں سمجھا جاتا جس میں کسی نہ کسی طرح لینن کا ہاتھ ثابت نہ کیا جائے۔

### چرس رکھنے کا الزام

جن دنوں میں ہسپتال میں تھا ایک روسی نوجوان میرے پاس آیا۔ میری اس سے سرسری شناسائی تھی۔ میں بڑا خوش ہوا کہ اتنی معمولی واقفیت کے باوجود وہ میری عیادت کے لیے آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مجھ سے بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا :

”تمہارے پاس حشیش ہوگی؟“

مجھے اُس وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ حشیش کیا چیز ہوتی ہے۔ میں نے بغیر سمجھے بوجھ انکار میں سر ہلادیا، مگر وہ اصرار کرنے لگا، تو میں نے سوچا شاید ٹافیاں مانگ رہا ہے۔ روسی لڑکے اکثر ہم سے غیر ملکی ٹافیاں مانگا کرتے تھے۔ میں نے کہا، ٹھیک، میں اپنے بیگ سے نکال لاؤں“

وہ حشیش کی طلب میں اتنا بے تاب ہو رہا تھا کہ میرے ساتھ لپکتا ہوا بیگ تک جا پہنچا۔ میں نے چند ٹافیاں نکال کر اسے دیں۔ مگر جب اس نے پھر بھی ”حشیش“ کا مطالبہ جاری رکھا، تو میں نے چیونگم کا پیکٹ پیش کیا۔

اس نے کہا: ”مذاق نہ کرو، اب اتنے بچے بھی نہیں ہو کہ حشیش کو نہیں جانتے حشیش کھانے کی چیز نہیں سگریٹ میں ڈال کر پینے کی چیز ہوتی ہے“

میں نے روسی لڑکے کو بتایا، میرے پاس اس کی مطلوبہ چیز موجود نہیں ہے، لیکن اس



لے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا :  
 ”تمہارے پاس چرس ضرور ہوگی، ورنہ تم معدے کے عارضے میں کیوں مبتلا  
 ہوتے۔ دوسرے مجھے شامی طالب علم محمد نے بتایا ہے کہ اس نے تمہارے  
 پاس چرس دیکھی ہے۔“

اب مجھے پریشانی ہوئی۔ محمد کو میں جانتا تھا، وہ اچھی شہرت کا مالک نہ تھا۔ تقریباً  
 سبھی افغان طلبہ سے اس کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ میرے ساتھ تو اسے خدا واسطے  
 کا بیر تھا۔ میں روسی لڑکے کو ساتھ لے کر محمد کے پاس گیا۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے  
 مجھ پر الزام لگاتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے تمہارے پاس چرس دیکھی ہے۔  
 اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ بات فیکلٹی کے چیئرمین اور دوسرے اساتذہ کو بھی بتادی گئی  
 ہے۔

اب مجھے معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ میں فوراً چند دوسرے افغان ساتھیوں  
 کے ہمراہ فیکلٹی کے چیئرمین کے پاس گیا۔ انہیں بتایا کہ محمد افغانوں سے بیر رکھتا ہے  
 اس لیے اس نے الزام لگا کر ایک افغان طالب علم کو بدنام کرنے کی کوشش کی  
 ہے۔ بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔

### طلبہ کی سیاسی سرگرمیاں

روس میں غیر ملکی طلبہ نصابی سے زیادہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ روسی  
 حکام ایسے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ایسے اجتماعات کا اہتمام کیا جاتا ہے جہاں سیاسی  
 موضوعات پر تقاریر کی جاتی ہیں۔ غیر ملکی طلبہ کو ان اجتماعات میں دعوتِ خطاب ملتی ہے،  
 تو وہ اس ”عزت افزائی“ پر بھولے نہیں سماتے۔ مقررین کو ترغیب دی  
 جاتی ہے کہ وہ اپنی تقاریر میں اپنے ممالک کی پس ماندگی، غربت اور دوسری محرومیوں  
 کا ذکر کرتے ہوئے روسی احسانات کا تذکرہ ضرور کریں۔ ہر اجتماع کے آغاز میں کمیونسٹ  
 پارٹی کا کوئی رہنما اٹھتا ہے اور دنیا بھر کے ترقی پذیر ممالک کے مسائل اور مشکلات  
 بیان کرتا ہے۔ پھر روس کی عدیم النظیر ترقی اور عظمت کے گن گاتے ہوئے اس کا  
 سبب یہ بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ اشتراکیت کو اپنانے کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ اس



کے بعد مختلف ممالک کے طلبہ کو اظہارِ خیال کی دعوت دی جاتی ہے، تو احساسِ منُونیت سے مغلوب ہو کر وہ کچھ زیادہ ہی غلو کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اپنے ملکوں کے لیڈروں اور سربراہوں کو گالیاں دیتے اور روسی رہنماؤں کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہیں۔ پھر روس کو اپنا نجات دہندہ قرار دیتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ روس ان کے ممالک کو "فیضیاب" کرنے میں مدد دے۔ آخر میں صدرِ مجلس اس طرح گویا ہوتے ہیں، گویا وہ غریب دنیا کے درد میں تڑپ رہے ہوں۔ امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ ممالک انسانیت کے دشمن ہیں۔ مذہب اور دوسری تہذیبی قدروں کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب تک لوگ اس "دقیانوسیت" سے نجات نہ پائیں گے ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہو سکتے اس سلسلے میں روس اور دوسرے کیونسٹ ممالک کی تقابلی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

روس میں غیر ملکی طلبہ کے لیے ایسا ماحول پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ خود بخود جنسی آزادی، رقص و سرود اور عیش و عشرت کے دلدادہ ہو جاتے ہیں۔ نوجوانی کا گرم لہو اور قدم قدم پر ترغیبات کے پھیلے ہوئے جال، مرد و زن کے آزادانہ اختلاط، شراب کی فراوانی اور طرب گاہوں کی کثرت میں پھنس کر کوئی شخص یہ سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں نکال سکتا کہ روسی معاشرے کے اس چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ بھی ہے۔ اس رنگین تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ تصویر کا یہ رخ دیہاتوں میں دکھائی دیتا ہے، مگر روسی حکومت غیر ملکیوں کو دیہات میں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ غیر روسیوں کو روس میں جو آسانیاں حاصل ہوتی ہیں، روسی ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں اگرچہ کسی طرح بھی پسندیدہ مہمان نہ تھا، لیکن مجھے زیادہ مشکلات کا سامنا نہ ہوا۔ پسندیدہ لوگ تو شہزادوں کی سی زندگی گزارتے تھے۔



## کے جی بی کی کارستانیاں

بیرونی ممالک کے طلبہ کو روس میں آزادی حاصل ہوتی ہے۔ بشرطیکہ وہ آزادی سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اور اس آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ وہ سوشلزم کی تعریف آزادی سے کر سکتے ہیں۔ اپنے ملک کے حکمرانوں پر آزادانہ تنقید کر سکتے ہیں۔ اپنے ملک کو روس کا کٹھ پتلی اور دستِ نگر ثابِت کر سکتے ہیں۔ انہیں ہر قسم کی جنسی آزادی حاصل ہے لیکن اس آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے شہروں میں گھوم پھر سکتے یا لوگوں سے آزادانہ میل جول رکھ سکتے ہیں۔ کوئی غیر ملکی طالب علم جو خود کو روس کا منت کش نہ سمجھتا ہو اور اپنے ملک کو روس کی فلامی میں دینے کے لیے تیار نہ ہو، کسی بھی وقت پریشانی سے دوچار ہو سکتا ہے۔ اسے یونیورسٹی سے خارج کیا جاسکتا ہے، علاج کے بہانے اس کے جسم کے کسی حصے کو مفلوج کیا جاسکتا ہے۔ یا اسے ایسے مسائل میں الجھا دیا جاتا ہے کہ مجبور ہو کر بارمان لیتا ہے۔

ہمارے ایک دوست کو ہاں میں ہاں نہ ملانے کے ”جرم“ میں بینائی سے محروم ہونا پڑا۔ روس آنے سے پہلے اس کی نظر بہت اچھی تھی۔ اپنی خودداری کی وجہ سے وہ روسیوں میں مقام نہ بنا سکا؛ چنانچہ آنکھوں کے علاج کے بہانے اسے ماسکو کے ایک ہسپتال لے جایا گیا اور دو انجکشن لگا کر بینائی سے محروم کر دیا گیا۔ میں نے اسے ایک روز بہت موٹے شیشے والی عینک لگائے ہوئے دیکھا تو اس کا مابرا بوجھا۔ اس نے بڑی رازداری سے بتایا، کسی نے اس کے بارے میں کے جی بی کو بتا دیا تھا کہ اس کے افغانستان میں اسلامی تحریکوں سے تعلقات تھے۔ اس کا بدلہ یہ لیا گیا کہ اسے آنکھوں میں انجکشن لگا کر اندھا کر دیا گیا۔ اس نے بتایا کہ پہلے وہ بالکل اندھا ہو گیا تھا۔ اب کچھ دکھائی دینے لگا ہے، لیکن اب بھی آدمی کو نہیں پہچان سکتا۔ اس نے کہا، ”میں اس ناکرہ گناہی پر ملنے والی سزا کا احتجاج کس سے کروں؟ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں نے زور سے سانس بھی لیا تو وہ مجھے ختم کر دیں گے۔“



روس جانے سے پہلے ہر شخص کو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے کہ ہر چوتھا روسی شہری کے جی بی کا ایجنٹ ہے۔ مذہب کے خلاف کیے جانے والے پروپیگنڈے پر بگڑنے سے بھی صورت حال آپ کے خلاف ہو سکتی ہے۔ آپ کو اپنے مذہب کے خلاف تقریریں فراخ دلی سے سننی پڑیں گی۔ اس کے علاوہ ہر غیر ملکی طالب علم سے یہ بات منوانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ روس دنیا کے ہر ملک سے ہر شعبے اور ہر میدان میں برتر ہے۔ یہ ”برتری“ بھی تسلیم کر لینی چاہیے، ورنہ برتری ثابت کرنے کی کوشش جسمانی بھی ہو سکتی ہے۔

روس میں سب سے پہلے جس شخص سے ملاقات ہوتی ہے وہ روسی خفیہ پولیس کا ایجنٹ ہوتا ہے۔ وہ آپ سے ملنے کے فوراً بعد روسی حکومت اور سوشلزم کی ”خیرو برکت“ اور ”عظمت و شوکت“ پر مختصر سی تقریر کرتا ہے اور آپ کو اپنی رائے سے اتفاق یا اختلاف کا موقع فراہم کرتا ہے۔ عموماً سوال کچھ اس قسم کا ہوتا ہے :

”روس کے بارے میں آپ کے ملک کے عوام کیا تاثر رکھتے ہیں؟“

یاد رکھیے یہ سوال آپ کو ٹھٹھانے کے لیے کیا گیا ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی آپ کے روس میں قیام کو مخدوش بنا دے گی۔ اب یہ آپ کی ”بصیرت“ پر منحصر ہے کہ اسے کیا جواب دیتے ہیں۔ اگر آپ نے روس کی تعریف کے ساتھ ساتھ امریکی حکومت کی ”سیاہ کاریوں“ کا کچھ تذکرہ بھی کر دیا، تو سمجھ لیجئے، سرکار کی نظروں میں آپ دوست ٹھہر چکے ہیں۔ اب آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جہاں موقع ملے کیونزیم اور روسی حکومت کی تعریف کرتے رہا کریں۔ دلائل کے چکر میں نہ پڑیں، کیونکہ روسی اپنی بات ثابت کرنے کے لیے نہ خود دلائل کا سہارا لیتے ہیں نہ دوسروں کے دلائل سننے کا تکلف کرتے ہیں۔

### شکاریوں کے پھندے

جولڈ کے کیونسٹ ملکوں سے آتے ہیں یا جن کا تعلق پس ماندہ ممالک کی سوشلسٹ پارٹیوں سے ہوتا ہے وہ پہلے سے ”سرخ جنت“ کے مدح خواں ہوتے ہیں۔ باقی



کسروس میں آکر پوری ہو جاتی ہے۔ ان کو شراب و شباب کے ہنگاموں میں اپنی منزل مقصود مل جاتی ہے۔ سرکاری طور پر ان کے لیے ایسا ماحول پیدا کیا جاتا ہے کہ جہاں ان کے سفلی جذبے بلا روک ٹوک سیراب ہوتے رہیں۔ یونیورسٹی کے ماحول میں نوجوانوں کے جنسی اور حیوانی مطالبوں کی تکمیل و تعمیل کا پورا انتظام کیا جاتا ہے۔ سینما، تھیٹر، رقص گاہیں، ہیجان خیز لباس پہننے والی نوجوان لڑکیاں اور سامانِ عشرت ان سب کی اتنی فراوانی ہوتی ہے کہ ظاہری نگاہوں سے دیکھنے والے بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں :۔

اگر فردوس بر روئے زمین است  
ہمیں است ہمیں است وہیں است

تدریس کا آغاز ہوتا ہے تو ایسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں جن میں روس کی نگاہوں کو خیرہ کرنے والی ترقی اور قوت کے تذکرے شامل ہوتے ہیں۔ ان سے کچے ذہنوں کو مرعوب کیا جاتا ہے۔ کیونست پارٹی کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے۔ انسانیت پر احسان کرنے والے مارکس اور لینن کی داستانیں مبالغہ آمیز انداز میں سنائی جاتی ہیں۔ مذہب کے بارے میں تشکیک کے کلنٹے دلوں میں چھپوئے جاتے ہیں اور پھر مذہب سے علما جدا کرنے کے لیے تمام شیطانی حربوں اور ترغیبات کو کام میں لایا جاتا ہے۔ رقص و سرود کی مجلسوں میں بتان سیمیں تن اپنی تمام تر ہوشربائیوں کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ شراب پانی کی طرح بہائی جاتی ہے۔ اخلاق کا ہر ضابطہ دم توڑ دیتا ہے وہاں غیر معمولی کمزور کے لوگ بھی ڈول جلتے ہیں۔

مذہب کے ساتھ رشتہ زیادہ عرصہ یوں بھی قائم نہیں رہتا کہ بھوروں کی طرح کلی کلی کا رس چوسنے والوں کو اپنے ملک میں پابندیوں کا ماحول کھلنے لگتا ہے۔ ایسے ہی لوگ روس کے نزدیک کام کے ہیں جن کا ضمیر اور حیا مر جائیں۔ ان سے ذلیل سے ذلیل کام لیا جاسکتا ہے، چاہے وہ کام وطن فروشی ہی کیوں نہ ہو۔



ہاں میں ہمارے اساتذہ روزانہ خود ہمیں ایسی مجالس میں لے جاتے تھے جہاں شراب کے دور چلتے اور نوجوان لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے کرتے تھے۔ چند ہی روز میں ہمیں یہ پتہ چل گیا کہ وہاں ہر نوع کی جنسی آزادی تھی۔ نئے آنے والے لڑکوں نے جلد ہی اپنی دلچسپیاں تلاش کر لیں۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ مشرقی ممالک کے لڑکے جہاں ابھی تک سماجی قدریں زندہ اور شرم و حیا باقی ہے، ابتدا میں کچھ جھجکے سے رہتے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ہر کاوش کو توڑ پھینکتے ہیں پھر توان کی بے راہ روی انہیں اس مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ اپنا اصل مقصد تک بھلا بیٹھتے ہیں۔ ہم میں سے جو لڑکے نئے ماحول سے گھبرائے انہیں سمجھایا گیا کہ تم غیر حقیقی اور رجعت پسند معاشرے سے آئے ہو۔ فکر نہ کرو، جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ مجھے کئی بار میرے اساتذہ نے کہا:

”کھاڈ پیو، ناچو، گاؤ اور زندگی کا ثبوت دو“

ایک مرتبہ ایک استاد سے جب میں نے یہ کہا: ”شیطان مجھے بھی قدم آگے بڑھانے کے لیے اکساتا ہے، مگر خدا کا خوف مجھے روک لیتا ہے“ تو انہوں نے بڑی شفقت سے میرا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا: ”یہ روس ہے۔ یہاں خدا تمہیں کچھ نہیں کہے گا“ غیر ملکی طلبہ کو روسی تاریخ کے متعلق معلومات دینے کے لیے مختلف عجائب گھروں میں ایسی تصاویر رکھی گئی ہیں جو انسان کی ابتدائی تخلیق کے مختلف مناظر پیش کرتی ہیں۔ اس میں ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ کچھ تصویریں ایسی بھی ہیں جو خدا کو انسانی ذہن کی تخلیق بتاتی ہیں۔ کتابوں میں جو مواد پیش کیا گیا ہے اس میں مذہب کو مزدوروں کے خلاف سازش ٹھہرایا گیا ہے۔ کچھ ذہنوں کے طلبہ کو الحادی فلسفے کی بھول بھلیاں میں اُلجھایا جاتا ہے۔ ثابت یہ کرتے ہیں کہ صرف مذہب دنیا بھر میں غربت، افلاس، جہالت اور پس ماندگی کا سبب ہے۔ اس کے مقابلے میں کمیونزم کو ایک فلی میرو کی طرح کا انسانیت کا نجات دہندہ ثابت کیا جاتا ہے۔

روس میں حصول تعلیم کی خاطر بیرونی ملکوں سے آنے والوں کو کمیونزم کا آلہ کار



بنانے کے لیے ان کے اندر ایجنٹ تلاش کیے جاتے ہیں۔ ایسے لڑکے عموماً اخلاق و کردار سے غاری ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہم وطن طلبہ کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے ہر ممکن تدبیر کرتے ہیں۔ ان کے رسوخ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کسی طالب علم کو ان کے ادنیٰ اشارے پر یونیورسٹی سے خارج کیا جاسکتا ہے۔ ان کی سفارش سے کامیابی ناکامی میں اور ناکامی کامیابی میں بدل جاتی ہے۔ وہ روس کے خاص آدمی ہونے کی بنا پر اعلیٰ مراعات کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ روس میں ان کی زندگی آسائشوں اور عیاشیوں کی منظر ہوتی ہے۔ ان طلبہ کو روس میں عرصہ تعلیم کے بعد بھی مہمان رکھا جاتا ہے۔ اپنے ملک جانے سے پہلے انہیں خصوصی تربیت دی جاتی ہے تاکہ اپنے ملک میں روس کے مفادات کا کچھ تحفظ کر سکیں۔ ایسے طلبہ (چاہے تعلیم سے ان کا دور کا تعلق بھی نہ ہو) ڈگری بڑی آسانی سے حاصل کر لیتے ہیں۔

افغان طلبہ میں کام کرنے کے لیے خلق اور پرچم پارٹیوں سے وابستہ طلبہ کی امداد لی جاتی تھی۔ ماسکو اور دوسرے شہروں میں خلقیوں اور پرچیوں کا کام الگ الگ قیادت کے تحت منظم تھا۔ وہ دوسرے افغان طلبہ کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے اجتماعات منعقد کرتے، جرائد، پوسٹر اور دوسرا لٹریچر شائع کرتے اور دوسری سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ انہیں روسی حکومت خاصی امداد فراہم کرتی تھی۔

### بے راہ روی کی تربیت

غیر ملکی طلبہ کی تعلیم کا آغاز عموماً روسی زبان کی تدریس سے ہوتا ہے۔ روسی زبان سیکھانے کے لیے ایسی خواتین کا انتخاب کیا گیا ہے جو حسن و جمال میں لاثانی اور نوجوان لڑکوں کو غلط راہ پر ڈالنے کے تمام حربوں سے لیس ہوتی ہیں۔ اس کورس کے لیے ہماری معلمہ بھی ایسی ہی تھیں۔

ہمارے گروپ میں میرے علاوہ چار ویت نامی لڑکے تھے۔ کچھ افغان طلبہ، دوسرے گروپوں میں دوسری معلمات کے پاس زیر تعلیم تھے۔ ہماری معلمہ کسی اعتبار سے



استاد نہ تھیں اپنے شاگردوں سے اس کا رویہ پُر پیچ قسم کا تھا۔ کبھی تو لکھ بھی ماشہ گھڑی میں استاد بن کر یہ کہ وہ نہ کرو کے احکام جاری کرتی دکھائی دیتیں، تو کبھی اپنی شوخ اداؤں سے گھائل کرنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتیں۔

مجھے رام کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن میں اپنی طبعی سستی کی بنا پر ان کے التفات کا مستحق نہ ہو سکا۔ چونکہ انہیں میری خصوصی نگران کی حیثیت حاصل تھی اس لیے چلتے پھرتے کوٹنے لگیں کہ تم میں زندوں اور زندہ دلوں کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں ان کا ہاتھ تھام کر چہل قدمی کے لیے نکلوں۔ ان کے پہلو سے لگ کر رقص کروں۔ انہوں نے میرے بارے میں یونیورسٹی حکام کو رائے دی کہ یہ مردہ دل اور بیمار ذہن کا نوجوان ہے۔ اس لیے داخلے کے لائق نہیں، لیکن ان کی رائے کے برعکس مجھے یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ وہ اپنی رائے پر مصر رہیں۔

جنب میں باکو سے دل سک آگیا تو وہاں بھی حالات زیادہ مختلف نہ تھے۔ یونیورسٹی کے ہر باٹل میں ایک ڈانسنگ کلب تھا۔ جہاں ہفتے کی چار راتیں رقص و موسیقی کے پروگرام ہوتے تھے۔ باٹلوں کے ڈانسنگ کلبوں کے علاوہ یونیورسٹی میں "انٹر کلب" کے نام سے بین الاقوامی کلب بھی تھے جن کی رکنیت زیادہ تر غیر ملکی طلبہ کو ملتی تھی یہاں دنیا بھر میں مروجہ مذاہب اور نظام ہائے زندگی کا مذاق اڑانے کے لیے اجتماعات ہوتے ہیں مختلف قوموں کے لوگ مل کر کیونز کم کے گن گاتے اور روسی حکومت کی درازی عمر کی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔ عیش و عشرت کا ہر سامان یہاں موجود ہوتا ہے۔ غیر ملکی طلبہ پر روسی حکومت ہر سال کثیر رقم صرف کرتی ہے۔ انہیں ممکنہ سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں (مقامی طلبہ ان سہولتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے) اس کے بدلے میں ان سے کچھ مطالبہ بھی کیا جاتا ہے۔ وہ مطالبہ یہ نہیں ہوتا کہ اپنے ملکوں میں جا کر وہاں عوام کی خدمت کریں اور روسیوں کو دعائیں دیں۔ اس کے برعکس طلبہ سے دورانِ تعلیم یہ یقین دہانی حاصل کی جاتی ہے کہ وہ روس کے پکے حمایتی بن جائیں گے۔ واپس جائیں، تو اپنے مالک کے فرسودہ نظاموں اور اخلاقی و روحانی قدروں کے



تلافی بغاوت کا مصمم ارادہ کر کے جائیں تعلیم کے دوران اساتذہ بار بار یہ احساس دلاتے ہیں کہ :

”تم یہاں صرف ڈگریاں لینے نہیں آئے ہو۔ ڈگریاں تو امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک سے بھی حاصل ہو سکتی تھیں۔ اس انقلابی سرزمین پر قدم رکھا ہے تو انقلابی طور طریقے سیکھو“

دورانِ تعلیم کیونست پارٹی طلبہ سے گہرا رابطہ رکھتی ہے۔ بعض اوقات تو غیر ملکی طلبہ مقامی کیونست پارٹی کا کوئی یونٹ معلوم ہوتے ہیں۔ پارٹی کے اجتماعات میں باقاعدگی سے شریک ہونا، کیونزیم کے فکری اسباق ازبہ کرنا اور اشتراکی فلسفے پر عبور حاصل کرنا ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ اس دوران میں پارٹی کے لوگ طلبہ کو ان کی مشکلات میں ہر ممکن تعاون فراہم کرتے ہیں۔ وہ بیمار ہوں تو علاج معالجے کا انتظام کیا جاتا ہے، کسی اور مشکل میں گرفتار ہوں، تو وہ دور کی جاتی ہے۔ جب طلبہ فارغ ہو کر اپنے وطن لوٹتے ہیں تو پارٹی کے لوگ انہیں یقین دہانی کراتے ہیں کہ روس سے جانے کے بعد بھی تم تمہاری نگرانی جاری رکھیں گے۔ تمہارے ملکوں میں ہماری شاخیں موجود ہیں۔ ان سے رابطہ رکھو۔ تم تمہیں اچھے عہدوں پر فائزہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ کسی مشکل میں گرفتار ہوئے تو ہم دامے، درمے، سٹخنے، قدمے تمہارے ساتھ ہیں۔

جن ممالک کے طلبہ روس جاتے ہیں، وہاں کی حکومتیں جانتی ہیں کہ روس میں طلبہ کو کیونزیم کی فکری اور عملی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ لڑکے واپس آکر ان کے لیے مسائل بھی پیدا کرتے ہیں، لیکن وقتی مصلحت انہیں خاموش رہنے پر مجبور کیے رہتی ہے اور وہ روس جانے والے طلبہ کو جان بوجھ کر اشتراکیت کے حوالے کر دیتے ہیں۔ حالانکہ بعض چھوٹے کیونست ممالک اس پر روس سے احتجاج کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ویت نامی حکومت نے ایک سے زائد مرتبہ روسی حکام سے درخواست کی ہے کہ اس کے طلبہ کو روسی طرز کے کیونزیم کی تدریس سے آزاد رکھا جائے۔ ہمارا ایک ویت نامی ساتھی ہوا کہ کرتا تھا کہ روسی کیونزیم کو اپنے مفادات



کے گرد گھماتے ہیں، ہم دیت نامی طلبہ روسی پروپیگنڈے سے سخت نفرت کرتے  
ہیں۔ دوسرے دیت نامی لڑکے بھی اس صورتِ حال کے سخت شاکی تھے۔



تیسرا جواب

## نئی منزل و نسک

باکو میں برس بھر کے قیام کے دوران میں میں نے روسی زبان اچھی طرح سیکھ لی۔ اب میری اگلی منزل یوکرین کا شہر و نسک تھا۔ بحیرہ ازوف کے قریب اور دریائے و نسک پر آباد یہ شہر بہت خوبصورت ہے۔ آبادی ایک ملین سے زیادہ ہے۔ وانیسن کے کوئلے سے بریزہ علاقے میں واقع کوئلہ صاف کرنے کے کئی کارخانوں کی وجہ سے یہ شہر پورے روس میں ممتاز خیال کیا جاتا ہے۔ وانیسن کے کوئلے کے بارے میں خود لینن نے کہا تھا :

”وانیسن کے کوئلے کے بغیر سوشلسٹ ریاست کا قیام ممکن نہیں ہے“

ابھی تک یہ شہر شالین کے نام سے منسوب تھا۔ اب شالین کی دوسری یادوں کے ساتھ نام بھی تبدیل ہو چکا ہے۔ دریائے و نسک شہر کے عین وسط سے گزرتا ہے۔ شہر کی اکثر تفریح گاہیں اسی دریا کے کنارے واقع ہیں۔ شام کے وقت شہر کی آبادی کا بڑا حصہ تفریح گاہوں میں سمٹ آتا ہے۔

## رشوت کی کرامت

و نسک آنے سے پہلے مجھے وطن جانے کے لیے ڈیڑھ ماہ کی چھٹی دی گئی۔



قابل جانے کے لیے مجھے دوسروں کی ضرورت تھی۔ تاکہ کرایہ ادا کرنے کے علاوہ میں گھر کے افراد کے لیے چند تحفے بھی خرید سکوں، لیکن وظیفے سے اتنی رقم بچا مشکل تھا۔ ہمیں صرف اسی روپل ماہانہ وظیفہ ملتا تھا اور اشیائے ضرورت اتنی گراں تھیں کہ اس میں بشکل گزارا ہوتا تھا۔ میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ لیا تو انہوں نے مجھے اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے ایک ترکیب بتائی۔ مجھے بتایا گیا کہ میں موسم سرما میں ملنے والے کپڑوں کے بجائے اگر نقد رقم وصول کر لوں تو میرا کام بن سکتا ہے۔ ہر غیر ملکی طالب علم کو ماہوار وظیفے کے علاوہ موسم سرما میں تین سو روپل کے کپڑے دیئے جاتے ہیں، مگر رقم نقد کی صورت میں نہیں دی جاتی۔ میرے ایک ساتھی نے بتایا کہ اگر کوشش کی جائے تو یہ قانون نرم کیا جاسکتا ہے۔ میں حیران ہوا مگر ضرورت نے مجھے ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور کر دیا۔

منتظمین سے ملا، تو انہوں نے بتایا کہ نقد رقم کسی طرح نہیں مل سکتی، صرف کپڑے ہی مل سکتے ہیں۔ اس اثناء میں مجھے پتہ چلا کہ کچھ غیر ملکی لڑکوں نے منتظمین سے خفیہ روابط استوار کر کے نقد رقم حاصل کر لی ہے۔ میں اس بات کی اپنے اندر اہلیت نہ پاتا تھا۔ وہی لڑکے میری دستگیری کو آئے۔ انہوں نے تیس روپل کی رقم مجھ سے لے کر منتظمین کو بطور ”انعام“ پیش کر دی اور تین سو روپل لے کر مجھے دے دیئے۔ کچھ رقم دوستوں سے قرض مل گئی۔ اس طرح چھٹیاں گزارنے والی افغانستان پہنچی۔

افغانستان سے واپسی پر میں نے اپنی ضرورت کی خاصی چیزیں خرید کر ساتھ لے لیں۔ اس لیے کہ روس میں ایک برس کے قیام سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں اشیائے ضرورت کی فراہمی کس قدر مشکل ہے۔ دوستوں کے لیے کچھ تحفے بھی لیے۔ تاشقند پہنچا تو سامان کی سختی سے تلاشی لی گئی۔ چینی ساخت کے قلم، بال پوائنٹ، رومال اور جاپانی کپڑا ضبط کر لیا گیا۔ میں نے لاکھ کہا یہ چیزیں میں اپنی ضرورت کے لیے لے جا رہا ہوں مگر شنوائی نہ ہوئی۔ چند ہی چیزیں میرے پاس چھوڑی گئیں۔ کسٹم میں ضبط کی جانے والی اکثر چیزیں کسٹم کے افسر آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ اس چیز کا ثبوت مجھے تھوڑی ہی دیر بعد مل گیا۔



## غیر ملکی سیاحوں کے شکاری

ماشقند میں مختصر قیام کے لیے اپنے چند دوسرے ہمسفروں کے ساتھ ایک ہوٹل میں بھرا۔ شام کے وقت جب ہم شہر کی سیر کے لیے نکلے، تو بہت سے لوگ ہمارے تعاقب میں چلنے لگے۔ میں پریشان ہو گیا، مگر میرے ساتھیوں نے بتایا کہ یہ ”معصوم شکاری“ ہیں ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ”شکاری“ کی تشریح یوں کی گئی کہ یہ ہمیں غیر ملکی سمجھتے ہوئے ہم سے باہر کی اشیاء خریدنے کے خواہاں ہیں۔ میں نے دیکھا ان لوگوں میں سرکاری افسر بھی تھے۔ وہ جگہ جگہ روک کر رازدارانہ انداز میں ہم سے پوچھتے کہ آیا کوئی قابل فروخت چیز موجود ہے؟ پھر ہمارے انکار کو خاطر میں لائے بغیر اصرار کیے جاتے کہ اپنی نشانی تو دیتے جاؤ۔ میرے ایک تجربہ کار (افغان) ساتھی کا خیال تھا کہ ان لوگوں کی اکثریت جاسوسوں پر مشتمل ہوتی ہے، اس لیے ان کے پاس کچھ فروخت کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ایک پارک میں ایک شخص تو میرے گلے پڑ گیا۔ وہ کچھ اس طرح کے مسکین لمبے میں التجائیں کر رہا تھا گویا بھیک مانگ رہا ہو۔ میں اس سے نجات حاصل کرنے کی کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ عسکری لباس میں ملبوس ایک شخص آہنچا۔ میں گھبرا یا کہ شاید کوئی نئی مصیبت آگئی، مگر یہ صاحب بھی اسی بیماری کے مریض نکلے۔ انہوں نے بھی بڑے عجیب عاجزی سے درخواست کی کہ میں کوئی کپڑا ان کے ہاتھ فروخت کر دوں۔

اس افسر میں مجھے کچھ دیکھ بھالے شخص کی جھلک دکھائی دی۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ موصوفی نے کچھ دیر پہلے میرے سامان کی تلاشی لی اور میرا سامان چھینا تھا، مگر اب اس کے لمبے میں عجوزانہ کسار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کہنے لگا ”میں افسر تو ہوں“ لیکن تمہارے پاس ضرورت لے کر آیا ہوں۔ پھر مجھے خوش کرنے کے لیے اپنی جیب میں ٹھونسے ہوئی کچھ چیزیں نکالیں اور مجھے دے دیں۔ یہ وہی قلم اور دوسری چیزیں تھیں جو مجھ سے چھینی تھیں۔ میں نے اس مہربانی کے جواب میں اسے بتایا کہ میرے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ اس پر اس نے میری واسکٹ کی طرف اشارہ



کرتے ہوئے کہا،

”یہی دے دو۔ میں اپنے بیٹے کے لیے کوئی چیز خریدنا چاہتا ہوں۔“  
میں نے کہا، ”مگر یہ تو میں اپنی ضرورت کے لیے لایا ہوں۔ یہ۔۔۔ استعمال بھی کر  
چکا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے اپنی واسکٹ اتار کر اسے دکھائی۔ اس نے میری بات کی پروا کیے  
بغیر واسکٹ میرے ہاتھ سے جھپٹ لی اور پوچھا، ”یہ کہاں کی بنی ہوئی ہے؟ اور میرے  
منہ سے یہ سنتے ہی کہ ”امریکی“ ہے، وہ صاحب میری مرضی کا انتظار کیے بغیر ایک سو  
روبل کا نوٹ میری گود میں پھینکتے ہوئے واسکٹ کے وہاں سے چل دیئے۔ میں نے  
آواز دی کہ میں فروخت نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آپ لینا ہی چاہتے ہیں تو ایسے ہی لے جائیں،  
مگر وہ یہ کہتے ہوئے چل دیے کہ اگر پیسے کم ہوئے تو مہمان خانے میں مزید دے دوں گا۔  
مجھے خطرہ تھا، کہیں وہ جاسوس نہ ہو لیکن پھر میں نے اسے کہیں نہ دیکھا۔

قیام گاہ پر پہنچے، تو کئی مرد اور عورتیں سچھے پڑ گئیں۔ وہ ہمارے کٹے کے کپڑے  
اتر والینا چاہتے تھے۔ جن لوگوں کا سامان کٹم کی چھلنی سے گزر گیا تھا، وہ مزے سے  
ایک پیسے کی چیز کا روبل وصول کر رہے تھے۔ میرے پاس بیچنے کے لیے کچھ نہ تھا اس  
لیے میرے پاس آنے والے مایوس لوٹتے۔ ان میں سے بعض کہنے مشق خریدار جاتے جاتے  
ایک ٹافنی اور چیونگم حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔

”ناشنہ سے میں باکو جانا چاہتا تھا۔ وہاں مجھے اپنے کاغذات حاصل کرنے اور  
پرانے ساتھیوں سے الوداعی ملاقات کرنی تھی۔ دو روز تک باکو جانے والے جہاز میں  
سیٹ نہ مل سکی تیسرے روز باکو پہنچا۔ جلدی جلدی اپنے کام نمٹائے، کیونکہ یہاں بھی غیر  
ملکی سامان کے ”خریداروں“ کو ہر جگہ اپنے تعاقب میں پاتا تھا۔ پھر بھی پرانے ساتھیوں  
اور اساتذہ سے رخصت ہونے میں کئی روز لگ گئے۔“



## مسلمان بھائی نے مدد کی

دنک روانگی سے پہلے ٹکٹ لینے ہوئی اڑے پر گیا۔ کاؤنٹر پر قیامت کا شہنشاہ تھا۔ ٹکٹ لینے والوں کی طویل قطاروں میں نظم و ضبط کا فقدان تھا۔ لوگ ایک دوسرے کے کندھوں پر چڑھ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ میں کئی بار قطار میں کھڑا ہوا، لیکن پیچھے سے زوردار دھکوں نے مجھے نکال باہر کیا۔ کئی لوگ میرے کندھوں پر چڑھ کر آگے بڑھے، لیکن میں ایک اپخ آگے نہ سرک سکا۔ دوپہر کے وقت میں قریبی کافی ہاؤس گیا، تاکہ کچھ کھا پی کر توانائی حاصل کر سکوں۔ ابلے ہوئے انڈے اور خشک روٹی کے علاوہ دیوار سے لگی خود کا مشین سے مختلف قسم کے مشروبات حاصل کیے جاسکتے تھے۔ میں نے پچاس کوپک کا سکہ مشین میں ڈالا اور اپنا گلاس مشین سے بھر لیا۔ میز پر کھانا لے کر بیٹھا تھا کہ ایک آذربائیجانی کاریگر نے مجھے ٹوکا: ”تم مسلمان ہو کر شراب پیتے ہو؟“

میں نے کہا: ”نہیں تو! مجھے تو شراب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ اس نے میرے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس میں شراب ہی تو ہے۔ تب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے مجھے مزید یقین دلانے کے لیے کہا: ”اگر میری بات کا یقین نہیں آتا، تو چکھ کر دیکھ لو۔“

لیکن میں نے چکھ بغیر ہی شراب ہونے کا یقین کر لیا اور اس گلاس کو چھوئے بغیر میز پر پڑا رہنے دیا۔ آذربائیجانی کاریگر میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور وہیں کھانا لے آیا۔ بچہ سے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا اور کہاں جا رہا ہوں؟ افغانستان کا نام سن کر گرجوٹی سے میرا ہاتھ دبایا اور بتایا کہ وہ بھی مسلمان ہے اور یہ کہ اسے مسلمانوں سے بے حد محبت ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں داسکند جا رہا ہوں، لیکن ہوئی جہاز کا ٹکٹ خریدنا مشکل ہو رہا ہے تو اس نے مجھے اپنے ساتھ جانے کی پیش کش کرتے ہوئے کہا: ”تم ٹکٹ گھر کے دفتر میں چلے جائیں گے، وہاں بہت سے مسلمان ملازمین ہیں کسی کو بتا دیا کہ ہم مسلمان ہیں تو ٹکٹ آسانی سے مل جائے گا۔“



اور صرف پانچ منٹ میں مجھے ٹکٹ مل گیا۔ میرے مسلمان دوست نے ایک مسلمان خاتون کو میرا پاس پورٹ دکھایا، وہ اپنے ساتھ ٹکٹ کی رقم لے کر گئیں اور ٹکٹ لا کر مجھے دے دیا۔

میں نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا تو انہوں نے التجا کی کہ جس قیمت پر بھی ممکن ہو میں اسے قرآن پاک دے دوں۔ میرے پاس سورہ یسین کا ایک نسخہ تھا جو میں اپنے پڑھنے کے لیے ساتھ رکھتا تھا۔ وہی میں نے ہدیہ کر دیا۔ انہوں نے قیمت معلوم کرنے کی چاہی لیکن میں قیمت کیسے لے سکتا تھا، میں تو دیارِ غیر میں اس چارہ ساز کو دل و جان بھی ہدیہ کرتا تو کم تھا۔

### افغانستان روس میں ہے

دوسری صبح میری پرواز تھی۔ طیارے میں سیٹ ایک روسی کیونٹ نوجوان کے ساتھ ملی۔ اس شخص کا حلیہ عجیب تھا۔ سر، مونچھوں اور ہنڈوؤں کے بال اس طرح سرخ تھے جیسے کہ مہندی لگائی گئی ہو۔ دانت پان یا نسوار کھانے والوں کی طرح داغدار اور منہ سے بدبو کے بھبھکے۔ آسمانی رنگ کی تپلون پر کالے رنگ کا کوٹ اور زرد رنگ کی چھوٹی سی ٹکٹائی۔ پاؤں میں زرد رنگ کے بڑے بڑے بوٹے۔ اس رنگ پر نگے کے باعث پورے جہاز میں اس کی شخصیت نمایاں نظر آرہی تھی۔ میرے لیے اس کا قرب خاصا صبر آزمائے ثابت ہوا۔ کچھ تو اس لیے کہ اس کی ہیئت کدائی ذوقِ سلیم پر گراں گذرتی تھی اور کچھ اس لیے کہ دورانِ سفر اس نے مجھے اپنے ”معلومات“ سے لبریز خیالات سے اتنا فیض پہنچایا اور اپنی بدبودار سانس سے اتنا پریشان کیا کہ میں فرار کی راہ ڈھونڈنے لگا۔ گفتگو کا آغاز اس طرح ہوا :

”آذربائیجان میں رہتے ہو؟“

”نہیں!“

”ازبک ہو؟“



”نہیں“

”تو پھر کون ہو؟“

”افغانستان سے آیا ہوں“

”اچھا.... افغانستان....“

چند لمحوں تک خاموشی کے بعد اس نے سلسلہ گفتگو پھر جوڑا.... ”تو پھر تم روس

کے شہری ہو؟“

میں نے کہا: ”نہیں صاحب، افغانستان روس میں نہیں، ایک الگ اور خود مختار

ملک ہے۔“

”چلو مان لیا کہ آپ کا ملک ہم سے الگ ہے، مگر حکومت تو وہاں برٹرنیف کے

ہوگی؟ یہ اُس کا اندازہ تھا۔ میں نے اُس کے خیالات کی مناسب الفاظ میں تردید

کی اور بتایا کہ افغانستان روس کی ہمسایہ خود مختار مملکت ہے جس کا حکمران ظاہر شاہ

ہے۔ اس پر اس نے مزید بحث کیے بغیر افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کو تسلیم

کر لیا، مگر پھر بھی اتنا ضرور کہا:

”ظاہر شاہ سے تو برٹرنیف کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ وہ ہمیشہ ماسکو

آتا ہے اور دونوں حکمرانوں کے درمیان طویل مذاکرات ہوتے ہیں۔ ہمارے

حکومت اس کی مدد بھی کرتی ہے۔“

مجھے مذاق سُوجھا۔ اس کی خود اعتمادی ویسے بھی اب خاصی کم ہو چکی تھی۔ میں نے کہا:

”آپ کی حکومت ہماری کیا مدد کرے گی۔ ہم خود کفیل ہیں۔ آپ تو خود ہمارے تعاون کے

محتاج رہتے ہیں۔“

اس نے کہا: ”جو بھی ہو، روس دنیا کی سب سے بڑی حکومت ہے۔ یقیناً

تمہارے ساتھ ہمارے اچھے تعلقات ہوں گے۔ اگر اس سے پہلے ہم تمہاری مدد نہیں

کر سکے، تو آئندہ کریں گے۔“

میں نے بتایا: ”ہمارے ملک کے سو فی صد لوگ اسلام کے شیعہ ہیں، جب کہ



آپ کے ہاں کمیونزم کو عروج حاصل ہے۔ ہمارا آپ کا سمبندھ کیسے ہو سکتا ہے؟  
 اُن صاحب نے میری بات کا جواب بڑی سادگی سے دیا: ”اسلام تو روس میں  
 بھی ہے۔ کروڑوں مسلمان یہاں موجود ہیں۔ یہاں کلیسا بھی ہیں، مسجدیں بھی ہیں، صرف  
 پارٹی مذہب کی مخالف ہے، لوگ تو مذہب کے مخالف نہیں۔“

اس کے بعد اس نے مذہب کی مخالفت میں کئی دلائل دیے، مگر ان کی نوعیت  
 علمی نہ تھی۔ بس گھسی پٹی باتیں کیں، جو ریڈیو، اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے  
 ذریعے ہر روسی کو معلوم ہو جاتی ہیں۔ آخر میں اس نے افغانستان کے بارے میں کچھ  
 سوالات کیے۔ اپنی باتوں میں اس نے ”امید“ ظاہر کی کہ بالآخر افغانستان میں بھی  
 انقلاب آئے گا۔ تب دونوں ممالک کے درمیان حقیقی دوستی کا آغاز ہو گا۔“

میں نے کہا: ”افغانستان میں روس کی طرح کمیونزم کے پنپنے کے امکانات نہیں  
 ہیں۔ وہاں کی کمیونسٹ پارٹیوں کو عوام میں کبھی نفوذ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے  
 افغانستان میں انقلاب کیسے آ سکتا ہے؟“

اس پر وہ ہنسا اور خاصی دیر تک ہنستا رہا۔ پھر ایسے لہجے میں بولا جیسے میری سادہ  
 لوحی کا مذاق اڑا رہا ہو:

”پولینڈ اور جرمنی کے لوگ بھی کمیونزم کے حامی نہ تھے۔ چیکو سلواکیہ میں  
 بھی کمیونسٹ پارٹی مضبوط نہ تھی، لیکن روس کی حکومت اور پارٹی نے ان  
 کی مدد کی اور نازیوں اور فاشسٹوں سے نجات دلا کر وہاں انقلابی حکومتیں  
 قائم کر دیں۔ اب ان ملکوں میں کمیونسٹ پارٹی کا راج ہے۔“

### یونیورسٹی

وئسک پنچ کر مجھے کسی سہم وطن کی تلاش ہوئی، لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہاں حصول  
 تعلیم کے لیے آنے والے پلہ افغان طالب علم ہوں۔ بعد میں دوسرے بھی آتے چلے  
 گئے۔



یونیورسٹی کے آٹھ بڑے اور کئی چھوٹے ہاسٹل تھے۔ ہمارے ہاسٹل کا نمبر ۱۴ تھا۔ اس یونیورسٹی میں تقریباً بائیس ہزار طلبہ پڑھتے تھے۔ ہر ہاسٹل کئی کئی منزلوں پر مشتمل تھا۔ چند روز بعد ایک افغان طالب علم سرور بھی ہماری یونیورسٹی میں آگیا۔ سرور میرے ساتھ پولی ٹیکنیک کالج کا طالب علم رہ چکا تھا، البتہ میری اس سے واقفیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ میں اسے پرچم پارٹی کا حامی اور وہ مجھے کمیونسٹ مخالف مسلمان کے طور پر جانتا تھا۔ ہماری یہ واقفیت ’’ونسک میں ہمارے تعلقات میں مرکزی کردار ادا کرتی رہی۔ اتنے بڑے شہر میں ہم صرف دو ہم وطن تھے۔ کئی بار ہم اکٹھے سیر کے لیے بھی نکلتے، مگر ہمارے درمیان ذہنی فاصلہ تقریباً اتنا ہی تھا جتنا ناسکو اور کابل میں۔‘‘

کلاسیں بہت جلد شروع ہو گئیں۔ ہمارے گروپ میں ہم دونوں کے علاوہ دو ویت نامی، دو الجزائر اور اٹھائیس روسی تھے جن میں طالبات کی تعداد چوبیس تھی۔

### ابتدائی مشکلات

ونسک پہنچ کر سب سے پہلی مشکل زبان کے سلسلے میں پیش آئی۔ اگرچہ میں روسی زبان کی خاصی شہد حاصل کر چکا تھا، لیکن روسی لب و لہجے سے کافی واقفیت نہ ہو سکی تھی۔ روسی زبان میں دیے جانے والے لیکچرز کو سمجھنا اور انہیں سمجھ کر لینا خاصا مشکل کام تھا۔ غیر ملکی طلبہ کی اکثریت کا تعلق چونکہ پس ماندہ ممالک سے ہوتا ہے جو سائنسی علوم کی بنیادی معلومات بھی نہیں رکھتے، اس لیے روسی زبان میں دیے جانے والے سبق سناؤ ہی ان کی سمجھ میں آتے ہیں۔

روس جا کر مجھے جس دوسری مشکل کا ہمیشہ احساس رہا وہ یہ تھی کہ وہاں تعلیمی اداروں اور اقامت گاہوں کا ماحول، مطالعے کی رغبت نہیں دلاتا، بلکہ اس میں رکاوٹیں حامل کرتا ہے۔ روسی طلبہ بالعموم عیش پرست اور آرام طلب ہیں۔ تعلیمی اداروں کے قریب دجوار میں شراب خانوں اور رقص گاہوں کی کثرت اور صلائے عام ہے۔ نوجوان طلبہ ان ترغیبات سے دامن کش نہیں رہ سکتے۔



کورس کی ابتدا عام مضامین سے ہوئی۔ ریاضی، فزکس، فزیالوجی، جیالوجی اور روسی زبان۔ اضافی مضمون صرف ”کیونسٹ پارٹی کی تاریخ“ تھا۔ غیر ملکی طلبہ کے لیے اس مضمون کی ہفتے میں دو بار تدریس ہوتی تھی۔ پیریڈ کا دورانیہ بھی زیادہ تھا۔ تقریباً نوے منٹ۔ یہ مضمون ہمیں ایک یہودی نثراد معلمہ پڑھاتی تھیں۔

ابتدائی ایام میں ہمارے تعلقات محدود تھے۔ روسی طلبہ ہم سے میل جول رکھنا پسند نہ کرتے۔ ہماری اجنبیت دور کرنے کے لیے صرف دو افراد تھے۔ ایک کوسومول کمیٹی کی نگران (Organiser of Comsomul Committee) خاتون اور دوسرے ہمارے گروپ لیڈر۔ کوسومول کمیٹی کی نگران خاتون کم عمر اور تنگ نظر تھی۔ وہ ہمارے مسائل حل کرنے کے بجائے لاٹا مل بخت کرتی اور آخر میں یہ کہہ کر رخصت کر دیتی کہ جاؤ کام کرو، خوب محنت کرو اور کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتاؤ۔ مسائل حل کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی، البتہ ہمارا گروپ لیڈر تجربہ کار کمیونسٹ تھا۔ حالانکہ اس کے علمی استعداد بہت کم تھی۔ یہ نہیں کہ وہ پڑھا کھانا تھا، مگر جو کچھ اس نے پڑھا تھا سیاست میں پڑ کر بھول چکا تھا۔ وہ صرف پارٹی پروپیگنڈے میں خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ وہ غیر ملکی طلبہ سے رابطے کا ذمہ دار تھا۔ اس لیے ہم میں سے ہر ایک سے بے تکلف تھا۔ ہم جب بھی اس کے پاس کوئی مسئلہ لے کر جاتے، کیونزوم پر اس کا بھاشن بھی سننا پڑتا، لیکن وہ ہمارے کام کرنے میں اکثر مستعد رہتا تھا۔

### نماز پر حیرت

دنک میں یوکرینی اور روسی طلبہ نے ہمارا پرجوش استقبال نہ کیا۔ روسی لڑکیاں پہ پہ پی بامروت تھیں، مگر لڑکے ہمارے قریب سے گزرتے وقت آپس میں سرگوشیاں کرتے اور قہقہے لگاتے، جیسے ہم کسی دوسرے تیارے کی مخلوق ہوں۔

ہاسل کے کمرے میں میرا قیام دور روسی لڑکوں کے ساتھ تھا۔ وہاں بھی سرد مہری کی فضا لاری رہتی تھی۔ وہ از خود کوئی بات نہ کرتے، میں کچھ پوچھتا تو ہوں ہاں کر کے



خاموش ہو جاتے۔ نماز پڑھتا تو میرے آگے بیٹھ کر مجھے قیام وقعود کرتے ہوئے دیکھا کرتے۔ میں بار بار انہیں بتاتا کہ یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور نماز پڑھتے ہوئے میرے سامنے مت آیا کرو۔ اس سے نماز میں حرج ہوتا ہے، مگر وہ سنی ان سنی کر دیتے اور اکثر نماز کے بعد مجھ سے پوچھتے کہ اس نشست و برخاست کا کیا فائدہ ہے؟ رفتہ رفتہ وہ اس "نشست و برخاست" کے عادی ہو گئے۔

نماز کی وجہ سے ایک بار میری ایک روسی لڑکے ویتیا سے معمولی تلخی بھی ہوئی۔ ایک روز وہ میرے کمرے میں آیا تو مجھے نماز پڑھتے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اس کا انداز اس قدر استہزائیہ تھا کہ بہت ضبط کے باوجود میرا پارہ چڑھ گیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں اس سے اُلجھ پڑا۔ بات خاصی بڑھی۔ میں نے اس کی پٹائی کر دی۔ خود مجھے بعد میں اپنے رویے پر خاصی پشیمانی ہوئی۔ وہ میرے کمرے سے چلا گیا، کچھ ناراض کچھ نادام، لیکن اس واقعے کا نتیجہ مثبت ہی نکلا۔ کچھ لڑکوں کے کہنے پر اس نے مجھ سے معذرت کر لی۔ بعد میں ہم بہت اچھے دوست بن گئے۔

جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں کہ میں نے باکو میں دونوں سمسٹرز میں روسی زبان پڑھی تھی اور بات چیت پر خاصی قدرت حاصل کر چکا تھا، لیکن لیکچر سن کر اسے سمجھنے اور نوٹس لینے کی اہلیت پیدا نہ ہو سکی تھی۔ استاد بڑی تیزی سے بولتے اور میں پورے لیکچر کا محض دس فیصد حصہ اخذ کر سکتا۔ اس صورت حال نے مجھے ذہنی طور پر پریشانی سے دوچار کر رکھا تھا۔ ریاضی، تریکیمی ہندسہ اور فزیکالوجی جیسے مضامین میں کچھ نہ کچھ پیش رفت ہو رہی تھی، لیکن باقی مضامین کی تعلیم میرے لیے نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے کسی روسی ہم سبق کی کاپی حاصل کر کے نوٹس نقل کر لیا کروں، میں نے ایسا کیا بھی، لیکن اکثر روسی طلبہ اتنے بدخط تھے کہ اپنا لکھا ہوا خود ہی پڑھ سکتے تھے۔

## اخلاقی جہالت

میرے لیکچر مسلسل ضائع ہونے لگے، تو مجھے کسی خوش خط ہم جماعت کی جستجو ہوئی۔



پتہ چلا کہ لڑکیوں کے خط لڑکوں سے اچھے ہیں اور وہ نوٹ محنت سے تیار کرتی ہیں۔ مجھے کئی لڑکوں نے مشورہ دیا کہ میں کسی خوش خط لڑکی سے رابطہ قائم کروں مشکل یہ تھی کہ میری معاشرت میں لڑکیوں سے ارتباط معیوب سمجھی جاتی ہے اور روس میں خاصا عرصہ گزارنے کے باوجود میں اتنا ”مہذب“ نہ ہو سکا تھا کہ کسی لڑکی سے بات کر سکتا۔ اپنی مشکل اپنے ساتھی لڑکوں سے بیان کی اور درخواست کی وہ کسی لڑکی سے میری کیفیت کرادیں۔ وہ مجھ پر خوب ہنسے۔ اُن کے خیال میں میرے اندر اخلاقی جرأت کا فقدان تھا۔ بالآخر میں نے ”اخلاقی جرأت“ پیدا کر لی۔ کچھ دوسروں نے اکسایا اور کچھ اپنی ضرورت نے مجبور کیا۔ میں نے اپنی کلاس کی سب سے خوش خط لڑکی کا انتخاب کیا۔ ”تانیازیلنسکایا“ جو پوری کلاس میں اپنی خوش خطی، لیاقت اور چشمے کی وجہ سے مشہور تھی۔ تانیازیلنسکایا سے بات کرنے کے لیے میں نے یونیورسٹی سے واپس جانے کا وقت پسند کیا۔ ہچکچاتے ہوئے اس کے پاس گیا اور انتہائی ادب و احترام کے ساتھ اپنی قوت گویائی یک جا کرتے ہوئے اسے بتایا کہ زبان کے مسئلے کی وجہ سے میرا تعلیمی حرج ہو رہا ہے۔ اگر وہ مہربانی کرے اور ہر روز کچھ دیر کے لیے اپنی کاپیاں مجھے دے دیا کرے تو میں نوٹ نقل کر لیا کروں۔ اس نے بڑی توجہ سے میری بات سنی اور بہت حوصلہ افزا بات کہی۔ ”شام کے وقت میرے کمرے سے کاپیاں لے جانا“ عجیب صورت حال تھی۔ میں شرماتا ہوا تھا اور وہ بغیر کسی حجاب کے بات کر رہی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ہاسٹل کی طرف چل پڑا۔ تانیازیلنسکایا نے مجھے آواز دی اور کہا :

”شام آٹھ بجے۔ آنا بھولنا!“

### تانیازیلنسکایا کی ضیافت

آٹھ بجے میں لڑکیوں کے ہاسٹل پہنچا۔ ہاسٹل کے چوکیدار (وینروانی) نے خاصی جرح کی۔ یہاں تک کہ میرا شناختی کارڈ بھی لے لیا۔ تانیازیلنسکایا کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ مجھے دستک دینے میں تامل ہی تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور تانیازیلنسکایا آمد ہوئی۔ یہ بات میرے



وہم دکان میں بھی نہ تھی کہ کوئی نوجوان لڑکی اتنی بے باک بھی ہو سکتی ہے کہ انتہائی ناکافی اور جیسا سوز لباس میں ایک اجنبی کو اپنے کمرے میں چلنے کی دعوت دے گی، مگر تانیانے مجھے کمرے میں چلنے کی دعوت دی۔ میں اندر گیا تو کمرے کے منظر نے مجھے ہیبت زدہ کر دیا۔ میز پر طرح طرح کے ماکولات و مشروبات سجے ہوئے تھے اور تانیانے مجھے نوٹ کی کاپیاں دینے سے پہلے میری میزبانی پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا :

”بیٹھنے کیوں نہیں یہ کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟“

میں اتنا خوف زدہ تھا کہ منہ سے بات بھی نہ نکلتی تھی۔ جب اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کرسی پر بٹھانے کی کوشش کی تو میں کانپنے لگا۔ (میری اس کیفیت کو یاد کر کے تانیانے بعد میں میرا مذاق اڑایا کرتی تھی) میرے منہ سے چند بے معنی فقرے نکلے :

”محترمہ! معاف کیجئے۔ اس وقت شاید آپ کی کوئی پارٹی ہے۔ میں کسی وقت پھر حاضر ہو جاؤں گا۔“

تانیانے کہا : ”جی میرے ہاں پارٹی تو ہے، لیکن کوئی دوسرا مہمان نہیں آئے گا۔ یہ سب اہتمام آپ ہی کے اعزاز میں ہے۔“

اس کی باتوں سے میری تشویش کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی۔ آخر میرے لیے یہ اہتمام کیا ہی کیوں کیا؟

میں نے کہا : ”میں تو صرف کاپیاں لینے حاضر ہوا تھا اور مجھے کچھ ضروری کام ہے“

اس لیے اگر ہو سکے تو مجھے اپنی کاپیاں عنایت کر دیجئے۔“

”کاپیاں بھی مل جاتی ہیں پہلے کھاپی لو، اس کے بغیر تم کیسے جاسکتے ہو۔“

ناچار ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور جلدی جلدی کچھ پھل اور کھانے کی دوسری چیزیں زہر مار لیں۔ وہ بار بار میرے ہاتھ میں کھانے کی مختلف چیزیں دیتی رہی، مگر میری بھوک اڑ گئی تھی اور جلد از جلد وہاں سے نکل بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ بہت آہستہ کھا رہی تھی۔ مجھے اس کے ختم کرنے کا انتظار کرنا تھا۔ آخر میں اس نے مجھے شراب کے ایک



گلاس کی دعوت دی جو میں نے رد کر دی اور اسے بتایا کہ شراب ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ وہ بہت اصرار کرتی رہی، مگر میرے مسلسل انکار پر خاصی بد دل ہو کر کہنے لگی :

”تم عجیب آدمی ہو کیا تمہارے ملک میں لڑکے لڑکیوں سے اسی طرح بدکتے ہیں ؟“

میں نے کہا : ”اس سے بھی زیادہ“  
کہنے لگی : ”یہ تو روس ہے، افغانستان سے بہت دور۔ تم یہاں جو چاہو کر سکتے ہو۔ یہاں تمہیں خدا نہیں دیکھے گا۔“

میں نے بحث ختم کرنے کی غرض سے کہا : ”خدا ہر جگہ موجود ہے اور وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ ہمارا یہ ایمان ہے۔ آپ کا جو بھی عقیدہ ہو، مجھے معاف رکھیں۔“  
تانیہ مجھ سے متفق نہ تھی اس کے خیال میں مذہب بوڑھوں اور ازکار رفتہ لوگوں کے لیے اچھی چیز تھا، لیکن اگر جوان نسل بھی مذہب پر چلنے لگے تو اس کا دم گھٹ کر رہ جائے۔ میں نے بڑی شکل سے تانیہ سے اجازت لی اور نوٹس کی کاپیاں لے کر وہاں سے نکل بھاگا۔

### علیحدہ کمرہ

تین ماہ بعد ہمارے لیے نیا ہاسٹل تعمیر ہو گیا۔ اس میں زیادہ تر غیر ملکی طلبہ کے قیام کا انتظام تھا۔ یہاں زیادہ آسانیاں اور آسائشیں فراہم کی گئی تھیں۔ ایک کمرے میں دو غیر ملکی رہتے تھے جبکہ روسی طلبہ کو ایک کمرے میں تین اور چار کے حساب سے بٹھرایا گیا۔ ہر کمرے کے ساتھ بیت الخلا اور غسل خانہ بھی تھا۔ میرے حصے میں ایک روسی طالب علم آیا تھا۔ اس کی موجودگی میرے لیے اس لحاظ سے تو مفید تھی کہ میں اس سے بات چیت کر کے روسی زبان سیکھ رہا تھا، لیکن ہمارے درمیان طرز معاشرت اور طرز فکر کے ناقابل عبور فاصلے حامل تھے۔ مجھے اس کی نشست و برخاست اور خورد و نوش سے پریشانی



ہوتی اور وہ میرے نماز پڑھنے اور قرآن کی تلاوت کرنے سے تکلیف محسوس کرتا تھا، چنانچہ میں اس کوشش میں رہنے لگا کہ مجھے کوئی علیحدہ کمرہ مل جائے اور کچھ ہی عرصے بعد مجھے یہ نادر موقع ہاتھ آگیا۔

میرا ایک کلاس فیلو ”سیرگی“ شادی کر کے بیوی کو ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ میرے ساتھ مشترکہ کمرہ لے لے، تاکہ جب وہ شادی کر کے علیحدہ رہائش اختیار کرے تو میں کمرے میں تنہا رہ جاؤں۔ اس نے میری بات مان لی اور کچھ عرصے کے بعد مجھے الگ کمرہ مل گیا۔ اگرچہ سیرگی کی کچھ ضروری چیزیں میرے کمرے میں موجود رہیں۔

### روحانی اذیت کا سامان

روسی طلبہ کی ایک عادت مجھے کبھی پسند نہ آ سکی، وہ ساری ساری رات ”موسیقی نوازی“ کرتے رہتے۔ ہاسٹل کے کمروں میں موسیقی اتنے زور سے بجائی جاتی کہ قریب کے کمروں والے نہ تو مطالعہ کر پاتے، نہ آرام کر سکتے۔ ہر روسی نوجوان کیونسلٹ موسیقی کا رسیا ہے۔ خصوصاً مغربی ممالک کے بلند آہنگ سازوں والے ریکارڈوں پر تو وہ جان دیتے ہیں۔ اگرچہ روس میں دوسرے مغربی ممالک کے ریکارڈ بجانے پر پابندی ہے اور صرف ”کیونسلٹ موسیقی“ ہی سنی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ اشتراکی حکومت موسیقی سے کیونزوم کی اشاعت کا کام لیتی ہے، لیکن میں نے ایک بھی کیونسلٹ نوجوان ایسا نہیں دیکھا، جو اس قانون کو خاطر میں لاتا ہو۔ تمام لوگ امریکی اور برطانوی دھنوں کے شیدائی تھے۔ چننے چنگھاڑتے ریکارڈ رات گئے تک بجتے اور طلبہ ان دھنوں پر رقص کرتے۔ جب تک یہ لوگ سو نہ جاتے میں بھی نہ سو سکتا تھا۔ سویرے بیدار ہو کر فریضہ نماز ادا کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔

ونسک پہنچ کر مجھے ماحول کے اختلاف کاشت سے احساس ہوا۔ اتنے بڑے شہر میں اجنبیت اور کسی ہم مزاج سے محرومی مجھے مسلسل پریشان رکھتی تھی۔ بعض کام جو ہم



سے لیے جارہے تھے، روحانی صدمے سے دوچار کرتے تھے، مگر میرے لیے اپنے آپ کو ان سے الگ رکھنا ممکن نہ تھا۔ مثلاً انٹر کلب کی ڈیوٹی میرے لیے کڑی سزا تھی، مگر اسے انجام دینا ہر طالب علم کے لیے لازم تھا۔

انٹر کلب ایک قسم کا شبینہ کلب تھا جہاں غیر ملکی طلبہ کو لڑکوں لڑکیوں سے آزاد ارتباط اور اختلاط کے مواقع مہیا کیے جاتے تھے۔ ہفتے میں ایک مرتبہ ہر طالب علم کو اس کلب میں انتظامی کاموں میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی باری پر مجبور تھا کہ لڑکوں لڑکیوں کو کلب میں مدعو کرے، ان کے لیے ناؤ نوش کا اہتمام کرے اور پھر موسیقی اور رقص کی محفل سجائے۔ دوسروں کے لیے یہی بات عیش و نشاط کا سامان تھی، مگر میرے لیے روحانی اذیت اور ایک مسلسل کڑھن۔

### غیر نصابی مشاغل

ہر ہاسٹل میں کرائسی اوگالوک (سرخ ہال) کے نام سے ایک مقام مخصوص تھا جہاں اشتراکی تعلیمات پر مبنی نمائش مگنی رہتی تھی۔ اس نمائش گاہ کو سجانے اور سنوارنے میں بھی ہمیں عملی حصہ لینا پڑتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار ہر طالب علم کو ایک خاص موضوع دیا جاتا۔ یہ موضوع عموماً اشتراکیت کے فکری یا نظری پہلوؤں پر مبنی ہوتا تھا۔ ہمیں اس موضوع کے بارے میں اچھی طرح تیاری کر کے دوسروں کو مستفید کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ ہم کرائسی اوگالوک میں نمائشیں تختے اور پوسٹر نصب کرتے بغرضیکہ یہاں ہر طالب علم کے لیے لازمی تھا کہ وہ اشتراکیت کے اصول سیکھے اور دوسروں کو ان سے مستفید کرے۔

غیر ملکی طلبہ کے لیے ایک ضروری کام یہ بھی تھا کہ کسی صنعتی ادارے سے رابطہ قائم کریں، ہر پندرہواڑے ایک بار وہاں جائیں اور حالات کا مشاہدہ کریں۔ اس مشاہدے میں کارخانے کے تربیت یافتہ کمیونسٹ نوجوانوں سے میل ملاپ بھی شامل تھا۔ اس کے بدلے میں کارخانے کے یہی کمیونسٹ کارکن ہمارے ہاسٹلوں میں آتے



اور ہمارے کمروں میں آکر ہماری زندگی اور طور اطوار کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اس طرح ہمیں کیونرزم کی عملی تربیت دی جا رہی تھی۔

یونیورسٹی کی سطح پر اجتماعی پروگرام اور فنکشن ہوتے تھے جن میں شرکت لازمی ہوتی۔ ایسے اجتماعات میں تقاریب کے علاوہ رقص و سرود کی محفلیں بھی آراستہ کی جاتیں۔ غیر ملکی طلبہ کو ایسی مجالس میں عملی حصہ بھی لینا پڑتا۔ بعض اوقات دوسری یونیورسٹیوں سے دعوتیں آتیں۔ وہاں بھی رقص و سرود کی محافل میں شریک ہونا پڑتا۔ میں کوشش کرتا کہ ایسی جگہ جانے سے بچ جاؤں، مگر یونیورسٹی کا ڈسپلن اس کی اجازت نہ دیتا۔ ہفتے میں ایک اجتماعی نشست "پولی چاس" کے نام سے منعقد ہوتی جہاں طلبہ ایک دوسرے کے خیالات سے مستفید ہوتے اور بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔

تدریسی مصروفیات کی اہمیت اپنی جگہ تھی۔ ہمارے اساتذہ کو اس بات سے کچھ غرض نہ تھی کہ ہمارے شب و روز کن مشاغل میں گزرتے ہیں۔ وہ ہمیں نصاب پر پوری توجہ مرکوز کرنے کے لیے کہتے تھے۔ میں دل سے اس بات کا خواہاں تھا، لیکن غیر نصابی مشاغل سے مفر نہ تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ ایسا طریق کار اختیار کیا جس سے سناپ بھی مرجائے اور لاشی بھی نہ ٹوٹے۔ میں ہر مجلس میں شریک ہوتا، لیکن اپنے ملی تشخص کو قائم رکھتا۔ تعلیمی سرگرمیوں میں بھی پوری توجہ سے شرکت کرتا۔ میں نے ایک مرتبہ پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ مجھ پر کتنا ہی زور کیوں نہ ڈالا جائے اپنے دین و ایمان کے خلاف کسی کام میں حصہ نہ لوں گا، تو پھر کوئی مجھے شراب پلا سکا نہ رقص پر مجبور کر سکا۔

ہمارا نظام الاوقات کچھ اس طرح کا تھا کہ ہم تدریسی سرگرمیوں سے بچے ہوئے وقت کو سیاسی اور دوسری مصروفیات پر صرف کر سکتے تھے۔ صبح آٹھ بجے سے ڈیڑھ بجے بعد دوپہر تک عام مضامین کی تدریس ہوتی۔ ہفتے میں دو مرتبہ کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ کی خصوصی کلاس ہوتی جو دو بجے سے ساڑھے تین بجے تک جاری رہتی تھی۔ اس دوران "پولی چاس" کے نام سے اجتماعی نشست ہوتی جس میں طلبہ کے باہمی ارتباط کے علاوہ کیونرزم سے ان کی دلچسپی اور کمیونسٹ پارٹی سے ان کے تعلقات زیر بحث آتے تھے۔



غیر ملکی طلبہ زیادہ تر ان مضامین میں اچھے ہوتے تھے جن کا روسی زبان سے براہ راست تعلق نہ تھا۔ مثلاً ریاضی میں غیر ملکی طلبہ زیادہ ماہر تھے، لیکن جہاں زبان کا کردار مرکزی تھا وہاں ہم روسی طلبہ سے پیچھے تھے۔ روسی زبان کی بھاری بھر کم اصطلاحات تک رسائی حاصل کرنا بہت مشکل کام تھا۔ مختلف مضامین کی تدریس کے لیے کمرے مخصوص تھے جن کا فاصلہ ایک دوسرے سے بہت زیادہ تھا۔ ہمیں ایک مضمون پڑھ کر دوسرے پروفیسر کے کمرے تک پہنچنے کے لیے اکثر دوڑتے ہوئے جانا پڑتا تھا۔

### اساتذہ کا رویہ

جہاں تک اساتذہ کا ہمارے ساتھ سلوک کا معاملہ تھا، مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ بہت اچھا تھا۔ چند ایک کو چھوڑ کر تمام اساتذہ مثالی تھے۔ وہ غیر ملکی طلبہ سے خصوصاً بے حد شفقت سے پیش آتے، البتہ چند یہودی نژاد اساتذہ کا رویہ مسلمان طلبہ سے خاصا متعصبانہ تھا۔ وہ غیر محسوس انداز سے صیہونی ذہنیت کا مظاہرہ کر بیٹھتے تھے۔ کبھی کبھار اچانک مسلمانوں کی تذلیل پر مبنی کوئی بات کہہ جاتے جس سے بد مزگی پھیلتی۔

ریاضی کے استاد یہودی تھے۔ وہ لیکچر کے دوران کسی یہودی مصنف کی کتاب کا حوالہ ضرور دیتے اور ہمیشہ ایک ہی انداز میں یہودیوں کی تعریف کرتے کہ دیکھو یہودی کتنے ذہین ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ عربوں کی پست ہمتی اور نا اتفاقی کی باتیں کرتے اور ساتھ ساتھ یہودیوں کی بحیثیت قوم عظمت کے گن گاتے تھے۔ عرب لڑکے اس پر تلملاتے تو بہت تھے، لیکن کسی کو یارائے احتجاج نہ تھا۔

### روسی طلبہ کی سیاست

روسی طلبہ کی اکثریت آنکھیں بند کر کے 'ایمان' لے آنے والوں کی ہے۔ انہیں جو کردار سونپا گیا ہے بظاہر بہت آسان ہے۔ ناک کی سیدھ میں چلتے رہنا اور سیاسی



معاملات پر بحث مباحثے سے گریز کرنا۔ ایک روز میں نے اپنے کمرے میں رہنے والے  
روسی طالب علم دوست کو چھیڑتے ہوئے پوچھا کہ اس جبر کے شکنجے میں جکڑے ہوئے  
سے وحشت نہیں ہوتی؟ تو اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا:

”یہ سیاست کی باتیں ہیں۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے تو اپنا کردار  
اور مکالمے یاد رکھنے ہیں، بس!“

میں نے مذاق کرتے ہوئے کہا: ”ذرا اپنے مکالمے سناؤ!“  
وہ اٹھا، میز کے قریب پہنچا، بال درست کیے، گلا صاف کیا، پھر جیب سے ڈائری  
نکالی، اسے کھولا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا: ”عزیز کامریڈ دوستو!“

ہم، آپ اور کمیونسٹ پارٹی مختصر عرصے میں غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنے  
میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ انسان کے حقوق انسان کا استحصال ختم ہو چکا ہے۔

اب کمیونسٹوں خصوصاً نوجوانوں پر بھاری ذمہ داریاں آ پڑی ہیں۔ ہم حکومت  
کے ساتھ مکمل تعاون کا اعلان کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ آئندہ پانچ سالہ

منصوبے کو تین برسوں میں مکمل کر کے دکھائیں گے۔ اعلیٰ معیار کی پیداوار اور  
مصنوعات تیار کریں گے۔ بین الاقوامی سطح پر جنگ کا راستہ روکیں گے

اور دشمن کی چال بازیوں کا دندان شکن جواب دیں گے۔ سامراج مردہ باد!

میں اس کی باتیں سن کر ہنسنے لگا۔ مگر اس نے میری طرف توجہ دیئے بغیر ڈائری کو

بند کر کے جیب میں رکھا اور کہنے لگا: ”اپنی سیاست یہاں ختم ہو جاتی ہے“

بین الاقوامی معاملات پر نوجوان طلبہ کی معلومات صفر ہوتی ہیں۔ اکثر طلبہ لاطینی امریکہ

افریقہ اور بعض یورپی ممالک کے ناموں سے بھی واقف نہ تھے۔ بہت سے طلبہ افغانستان

اور ایران کو روس کا حصہ سمجھتے تھے اور اپنی معلومات پر اصرار بھی کرتے تھے۔ ان کا

خیال تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کے لوگ غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انہیں صرف یہ

بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر میں روس لوگوں کو علم اور ترقی باندھتا پھرتا ہے۔ جو ممالک ابھی

تک روس کی دوستی سے محروم ہیں، جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں اور ان



کی آبادی بھوکوں مر رہی ہے۔  
 اگرچہ روس نے ہیلنسکی کانفرنس میں تسلیم کیا تھا کہ وہ دوسرے ممالک سے  
 ثقافتی رشتے استوار کرے گا اور دوسرے ممالک کے عوام کو روسی عوام سے قریب  
 ہونے کا موقع دے گا، لیکن ابھی تک صورت حال یہ ہے کہ روسی عوام دوسرے ممالک  
 کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشریات سننے اور دیکھنے سے محروم ہیں۔ ان کو اجازت  
 نہیں کہ وہ کسی بھی غیر ملک کی مطبوعہ کتابوں کا مطالعہ کریں۔

### اساتذہ کے اختیارات

روس میں اساتذہ کو وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ طلبہ مکمل طور پر ان کے  
 رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ کوئی طالب علم استاد سے بگاڑ کر نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی استاد کو ناراض  
 کر بیٹھے تو اس کا انجام یونیورسٹی سے اخراج اور قید و بند کی صعوبت کی صورت میں بھی نکل  
 سکتا ہے۔ طالب علم کو اپنے خلاف کسی نا انصافی کا ازالہ کرنے کے لیے کوئی سہولت  
 حاصل نہیں ہے۔ طلبہ اپنی یونین نہیں بنا سکتے، کوئی مطالبہ احتجاج یا مظاہرہ نہیں  
 کر سکتے۔ اگر کوئی طالب علم اپنے حق میں کیے جانے والے کسی غیر منصفانہ فیصلے کے  
 بارے میں پوچھ بیٹھے، تو ہو سکتا ہے کہ اس کے عمل کو سوشلزم کے خلاف سازش  
 قرار دے کر اُسے جیل بھجوا دیا جائے۔ اس کے باوجود میں نے دیکھا کہ اساتذہ کا  
 رویہ زیادہ تر دوستانہ ہوتا۔ جن اساتذہ کا طرز عمل پولیس افسروں کی طرح ہو، طلبہ  
 ان سے خوف تو کھاتے ہیں، لیکن ان کی عزت نہیں کرتے۔

ایک روز ایک استاد نے ہمارے ایک ہم سبق روسی طالب علم کو بڑی بڑی مونچھیں  
 رکھنے سے منع کیا۔ استاد صاحب کا لہجہ اتنا درشت تھا کہ میں سن کر حیران رہ گیا۔ انہوں  
 نے چیختے ہوئے کہا: ”اگر کل تمہارے منہ پر مونچھیں نظر آئیں تو نوچ لی جائیں گی!“  
 دوسرے روز طالب علم پھر مونچھوں کے ساتھ آیا۔ استاد صاحب نے اسے نہ صرف  
 ذلیل کیا، بلکہ دھکے دیتے ہوئے کلاس سے نکال دیا۔ اس سے کہا گیا کہ وہ دوبارہ کلاس



ہیں نہ آئے۔ اسی روز اس طالب علم کو یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا۔ اس کے بعد میں نے اس لڑکے کو کہیں نہ دیکھا۔

### جبر کا نتیجہ

جبر کا نتیجہ شدید گھٹن کی شکل میں برآمد ہوا ہے۔ بہت سے طلبہ خود ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ انہیں یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔ بعض تو اتنے مایوس ہو جاتے ہیں کہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی ایک واقعے کا میں عینی شاہد ہوں میری آنکھوں کے سامنے ایک طالب علم نے ہوٹل کی بارہویں منزل سے نیچے کود کر خود کشی کی تھی۔

یہ طالب علم جار جیا کارہنے والا تھا اور اس کا نام ساشا تھا۔ روسی لڑکے اس کی خوش اخلاقی اور ملنساری کے باوجود اس سے ہمیشہ گہریاں رہتے تھے اور اساتذہ کا سلوک بھی اس سے اچھا نہ تھا۔ اس لحاظ سے ساشا اپنے آپ کو ایک تنہا اور مصیبت زدہ انسان سمجھتا تھا۔ کسی وجہ سے یونیورسٹی انتظامیہ نے اس کا وظیفہ بند کر دیا تھا۔ اس کے والدین بھی اس کی مالی مدد نہ کر سکتے تھے؛ چنانچہ اپنی ضروریات کی خاطر اسے تعلیم کے ساتھ ساتھ سخت قسم کی جسمانی مشقت کرنی پڑتی تھی۔ دن کے وقت یونیورسٹی جاتا اور سرور کی تیج بستہ راتوں میں کارخانے میں کام کرتا۔ رات دن کی محنت نے اس کی صحت کو بری طرح متاثر کر دیا۔ تعلیم بھی متاثر ہونے لگی یہاں تک کہ وہ بار بار فیل ہونے لگا۔ اس نے کئی بار یونیورسٹی انتظامیہ سے درخواست کی کہ اس کا وظیفہ دوبارہ بحال ہو جائے، لیکن کسی نے اس کی بات پر توجہ نہ دی۔ مشکلات کے ہجوم نے اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ آخر اس نے اپنے مسائل کے حل کے لیے موت کا راستہ منتخب کیا۔ ایک روز وہ یونیورسٹی ہاسٹل کی بلند و بالا عمارت پر چڑھا اور سینکڑوں طلبہ کی موجودگی میں نیچے چھلانگ لگا دی۔ اس کی المناک موت میری آنکھوں کے سامنے ہوئی۔ اس کا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینا آج بھی میری نگاہوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اس کی موت نظام جبر



کے خلاف ایک الناک احتجاج تھی۔

ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں اور ان پر روس میں کسی کو افسوس کرنے کی اجازت ہے نہ فرصت۔ مسلسل جبر نے لوگوں کے دل مردہ کر دیے ہیں۔ ان میں اس قسم کا صبر اور حوصلہ پیدا ہو گیا ہے کہ ماں اپنے بیٹے کو نظروں کے سامنے قتل ہوتے دیکھ کر بھی خاموش رہنے پر مجبور ہے۔ باپ اپنے لخت جگر کو بے گناہی کے باوجود اشتراکیت کی بھینٹ چڑھنے سے نہیں روک سکتا۔ کٹھن سے کٹھن مصیبت کو بھی چپکے سے برداشت کر لیتے ہیں۔ کبھی ان کے چہرے اندرونی کرب کی غمازی کرنے لگیں، تو وہ فوراً پیر سکون دکھائی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

مصائب سے چھٹکارا پانے کے لیے روسی عام طور پر شراب کا سہارا لیتے ہیں۔ اکثر روسی مزدور شام کو کام سے واپس آتے ہوئے سستی شراب کی بوتل خرید کر لے آتے ہیں۔ گھر پہنچ کر انہیں کھانا ملے یا نہ ملے، شراب ضرور پیتے ہیں اور صبح تک نشے میں دھت پڑے رہتے ہیں۔ روسی طلبہ اپنی پریشانیوں کو غیر ملکی طلبہ سے پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو شاید ان کا قومی تفوق کا احساس ہو، لیکن کچھ اس لیے بھی وہ احتیاط برتتے ہیں کہ کسی کے سامنے کی گئی بات روسی جاسوسی ادارے تک بھی پہنچ سکتی ہے۔

### روسی طلبہ کی حالت زار

روسی طلبہ کو غیر ملکی طلبہ کے مقابلے میں ایک تنہائی سے بھی کم وظیفہ ملتا ہے۔ کالجوں کے طلبہ کو ۲۵ سے ۳۰ روپل تک اور یونیورسٹی طلبہ کو ۴۰ روپل ملتے ہیں۔ اس قلیل رقم میں انہیں کھانے پینے کے اخراجات، ہاسٹل کا کرایہ، لباس کے مصارف، ٹرانسپورٹ، شیشنری اور دوسرے مصارف ادا کرنے ہوتے ہیں۔ متمول گھرانوں کے لڑکے گھروں سے بھی معقول رقم لاتے ہیں، لیکن طلبہ کی اکثریت ایسی ہے جو معمولی وظیفے پر ہی گزر اوقات کرتی ہے۔



طلبہ کی ایک قسم وہ ہے جو بظاہر معمولی وظیفہ پاتے ہیں، لیکن ان کا رہن سہن اور طرز زندگی شہزادوں سے کم نہیں۔ ان کے کمروں میں پڑا ہوا سامانِ تعیش دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ ابتدا میں مجھے اس بات پر حیرت ہوتی تھی، لیکن بتدریج اس راز سے پردہ اٹھا کہ ایسے طلبہ اور طالبات کا تعلق کیونسٹ پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں اور حکام سے ہوتا ہے۔ ان کے والدین کیونسٹ پارٹی کے کتر تادھرتا ہونے کی حیثیت سے خود کو ملک و قوم کی تقدیر کا مالک سمجھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو ملک کی دولت کے حقیقی وارث خیال کرتے ہیں، البتہ ایسے لوگ اقلیت میں ہوتے ہیں، اکثریت غریب ماں باپ کے بچوں کی ہے جو کالج اور یونیورسٹی تک پہنچ جائیں تو عموماً گھروں سے ان کا رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے کئی کئی برس گھر نہیں جاسکتے۔ خط لکھتے ہیں، مگر دل کی بات نہیں کہہ سکتے کہ خطوط پر پسنسر کے پیرے ہیں۔ کبھی گھر سے خط آجائے یا معمولی رقم کا منی آرڈر وصول ہو، تو خوشی سے ان کے چہرے چمک اٹھتے ہیں۔

ایسے غریب طلبہ کو ہماری یونیورسٹی میں ایک سہولت یہ دی گئی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو مہینے میں ایک دو مرتبہ ریلوے اسٹیشن یا ہوائی اڈے پر سامان اتارنے چڑھانے کا کام کر لیں۔ اس طرح ان کو آٹھ دس روپل کی اضافی رقم مل جاتی۔ اب یہ بات بھی ختم ہو رہی ہے کیونکہ سامان اتارنے چڑھانے کا کام بھی مشینوں سے لیا جانے لگا ہے۔

## مالی مشکلات کا حل۔ شادی

مالی مشکلات کم کرنے کے لیے بعض طلبہ شادی رچا لیتے ہیں۔ ایسی شادیاں ہمیشہ برسرِ روزگار عورتوں سے کی جاتی ہیں۔ بیوی کا رہانے میں مزدوری کرتی اور شوہر یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتا ہے۔ طلبہ کی طرح طالبات میں بھی یہ رجحان موجود ہے۔ وہ بھی ایسے مڑوں کی تلاش میں رہتی ہیں جو اچھے کمانے والے ہوں اور ان کے تعلیمی اخراجات پورے کر سکیں، چونکہ یہ رشتے باہمی اخلاص کے بجائے خالص مادی اغراض کی بنا پر طے پاتے ہیں اس لیے ناپائیدار نکلتے ہیں۔ ادھر تعلیم ختم ہوئی ادھر شادی کا بندھن ٹوٹ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ



روس میں طلاق کی شرح ۷۵ فیصد سے بھی زیادہ ہے۔

## غیر ملکی طلبہ

روسی طلبہ کے مقابلے میں غیر ملکی طلبہ کو زیادہ سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ انہیں ۸۰ سے ۱۰۰ روبل ماہانہ تک وظیفہ دیا جاتا ہے۔ یونیورسٹی میں سہم افغان طلبہ کو ۹۰ روبل کے ماہانہ وظیفے کے علاوہ ۱۰ امریکی ڈالر ماہانہ جیب خرچ الگ ملتا تھا۔ بعض طلبہ بلیک مارکیٹ میں ان ڈالرز کو پچاس روبل میں فروخت کر کے اپنے وظیفے کی رقم کو ۱۲ روبل تک پہنچا دیتے تھے۔ غیر ملکی طلبہ تعطیلات میں وطن جاتے ہیں تو وہ اپنی پر مختلف اقسام کی ایسی چیزیں ساتھ لے آتے ہیں جو روس میں نہایت مہنگے داموں فروخت ہو جاتی ہیں۔ بعض غیر ملکی طلبہ اس کام میں ایسی مہارت رکھتے ہیں کہ وہ پڑھائی سے زیادہ اس شغل میں دلچسپی لیتے اور لاکھوں کماتے ہیں۔ اگرچہ حکومت ایسے کاروبار کی حوصلہ شکنی کرتی ہے اور روسی عوام کا غیر ملکیوں سے لین دین کرنا قانونی طور پر جرم ہے، لیکن یہ پابندی چنداں کارگر نہیں ہوتی۔ غیر ملکی طلبہ ایسے کالے روپے کو شراب نوشی اور جنسی عیاشی پر لٹاتے ہیں۔ بعض نوجوان طلبہ تو برائی کی ایسی پستیوں میں گر جاتے ہیں کہ خود روسی معاشرے کیلیے براٹی کی مثال بن جاتے ہیں۔

روس میں جنسی بے راہ روی و ہاکی طرح پھیل رہی ہے۔ اس میں غیر ملکی طلبہ مزید اضافہ کرتے ہیں۔ وہ ترقی پسندی میں رویوں سے بازی لے جاتے ہیں۔ بعض جنس زدہ لڑکے روسی طلبہ اور طالبات کو مغرب میں چھپنے والے فحش رسالے دکھاتے ہیں، تو ان کی آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔ وہ رویوں کو بتاتے ہیں کہ مغرب میں عملاً وہ کچھ ہو رہا ہے جس کے تم خواب دیکھتے ہو۔ وہاں عفت اور جیا کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ مرد و زن کا اختلاط وہاں عام ہے۔ ماں، بہن اور بیٹی کی تمیز بھی باقی نہیں رہی۔ اجتماعی جنسی تسکین کے لیے من گھڑت قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ گھٹن کے شکار روسی طلبہ اور طالبات ایسے قصوں کو شوق سے سنتے ہیں۔ خصوصاً سادہ لوح طالبات تو ایسے نوجوانوں پر مرثی ہیں جو ان کو تصوراتی "کوہ قاف" کے دیس لے جاتے ہیں۔ ایسے لڑکے بیک وقت کئی لڑکیوں کے التفات کے مرکز ہوتے ہیں۔ سرکاری طور پر



ایسے رجحانات کو پسند نہیں کیا جاتا اور مقامی طلبہ کو بیرونی طلبہ سے آزادانہ اختلاط پر تنبیہ بھی کی جاتی ہے، لیکن روس کی نوجوان نسل ہر اس چیز کو گلے سے لگا لینا چاہتی ہے جس سے حکومت روکے۔ نوجوانوں کا ذہنی اضطراب روز بروز بڑھ رہا ہے اور وہ انتقاماً ایسی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔

## ہسپتال میں داخلہ

پہلے سمسٹر کے آخر میں معدے کی بیماری میں مبتلا ہو کر پھر ہسپتال جا پہنچا۔ دوسو بستر کا یہ ہسپتال ایک تین منزلہ عمارت میں تھا۔ یہاں زیادہ تر طلبہ اور سرکاری ملازمین داخل تھے۔ ہسپتال کے کئی وارڈ تھے۔ مختلف وارڈز میں مختلف بیماریوں کے مریضوں کو اس طرح ملا کر رکھا گیا تھا کہ ایک وارڈ میں کوئی تو کھانس رہا تھا اور کوئی پیٹ کے درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ میرے وارڈ میں چند افراد میری طرح معدے کی بیماری میں مبتلا تھے (روس میں معدے کی بیماری عام ہے) باقی جہانی کمزوری اور دوسرے امراض میں گرفتار تھے۔ ڈاکٹر باقاعدگی سے ہمارے چیک اپ کے لیے آتے اور تقریباً ہر ایک سے یہ بات ضرور کہتے ”پریشان نہ ہونا تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے“

ہسپتال میں مریض تو مختلف امراض میں گرفتار تھے لیکن علاج میں فرق بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ اکثر مریض اس بات سے پریشان رہتے تھے کہ ہر مریض کو ایک ہی قسم کی گولیاں دی جاتی تھیں۔ اکثر مریض گولیاں کھانے کے بجائے غسل خانے میں پانی کی نالی میں پھینک دیتے تھے۔ جب ڈاکٹروں کو معلوم ہوتا کہ مریض یہ گولیاں استعمال کرنے سے کتراتے ہیں، تو وہ بہت ناراض ہوتے اور ایسے مریضوں کو تنبیہ کی جاتی کہ آئندہ ایسا ہوا تو انہیں ہسپتال سے خارج کر دیا جائے گا۔

ہسپتال میں تین وقت کھانا ملتا ہے۔ روسیوں کو غیر ملکی مریضوں کے مقابلے میں مختلف کھانا ملتا ہے۔ روسی مریض کے کھانے پر ۸ کیوپک اور غیر ملکی مریض کے کھانے پر ۳ روبل خرچ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ہسپتال میں روسی میرے ساتھ بہت حد



کرتے تھے۔ کئی روسیوں نے کھلم کھلا غم و غصے کا اظہار کیا۔ ایک مرتبہ جب ہم کھانا کھا رہے تھے۔ ایک روسی مریض میرے پاس آیا اور مجھ سے مخاطب کر کے کہنے لگا :  
 ”روس امیر ملک ہے، مگر ہماری ساری کمائی تم غیر ملکی کھا جاتے ہو۔ دیکھ لو  
 میں خشک روٹی کھا رہا ہوں اور تم عیش کرتے ہو۔“

## طریق علاج

ہسپتال میں داخلے کے وقت ہر مریض کا خون معائنے کے لیے لیا جاتا ہے۔ معائنے کے لیے لیے جانے والے خون کی مقدار ۲۰ سی سی کے قریب ہوتی ہے۔ میرا اتنا خون نکالا گیا تو مجھے خاصی پریشانی ہوئی۔ میں نے ڈاکٹروں سے پوچھا بھی، لیکن مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ ایک الجزائر میں طالب علم جو پہلے ہی خون کی کمی سے دوچار تھا، معائنے کے لیے اس کا کئی بار اتنا خون نکالا گیا کہ وہ بے دم ہو کر گر پڑا۔ بد قسمتی سے ایک روز وہ چلتے ہوئے گرے۔ ۱۔ شیشے کے برتن ٹٹے کھانے کی وجہ سے مزید زخمی ہو گیا۔ اس کا اتنا ہوشائع ہو گیا کہ وہ مسلسل دو ہفتے بے ہوش پڑا رہا۔

روس میں مریضوں کی عیادت کرنے کے لیے اعزہ واقرباء بہت اہتمام کرتے ہیں۔ مریضوں سے ملنے کے اوقات میں ہسپتالوں میں تیمار داروں کا ہجوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ مریضوں کے لیے پھل اور کھانے کی چیزیں لے کر آتے ہیں۔ اکثر مریض ہسپتال میں ملنے والا پھیکا کھانا نہیں کھاتے، بلکہ گھروں سے آنے والا کھانا کھاتے ہیں۔ مریضوں کی زیادہ تعداد ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ڈاکٹروں سے جھوٹے سرٹیفیکیٹ حاصل کر کے ہسپتال میں داخلہ حاصل کرتے ہیں، تاکہ کارخانوں کی مصروف زندگی کی تھکن اتار سکیں۔ جو لوگ واقعی بیمار ہوتے ہیں وہ بھی ہسپتال اس لیے آتے ہیں کہ یہاں انہیں آرام مل جاتا ہے۔ ورنہ ہسپتالوں میں ہونے والے علاج سے کہیں بہتر علاج گھر میں رہ کر ہو سکتا ہے۔



## لینا سے واقفیت

بیماری کے دوران میں کلاس لیڈر نے میری بڑی مدد کی۔ وہ میری بیمار پڑوسی کے لیے آتا تو مختلف مضامین کے نوٹ بھی ساتھ لے آتا تھا۔ میں یہ نوٹ نقل کر لیتا۔ اس طرح تعلیم سے میرا رابطہ نہ ٹوٹا۔ ایک روز مجھے کچھ زیادہ تکلیف تھی اور میں طعام گاہ میں بیٹھا نوٹ لے رہا تھا کہ ایک لڑکی میرے پاس آ بیٹھی۔ پہلے تو اس نے مجھے ساتھ کھانے کی دعوت دی، میرے انکار پر اس نے پیش کش کی کہ اگر میں چاہوں تو وہ میرے نوٹے نقل کرنے میں میری مدد کر سکتی ہے۔ میں معدے کے شدید درد کی وجہ سے بے دم ہو رہا تھا، اس کی پیش کش کو غنیمت جانا۔ اس کا نام لینا تھا۔

بیماری کے دوران میں لینا نے میری بڑی خدمت کی۔ حالانکہ وہ خود بھی بیمار تھی، مگر وہ میرے کام کو دیا کرتی تھی، خصوصاً لکھنے میں ماہر اور خوش خط تھی۔ میں نے اس کے پوچھنے پر جب یہ بتایا کہ میرا تعلق افغانستان سے ہے، تو کہنے لگی کہ مجھے افغانستان دیکھنے کی بہت آرزو ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کی والدہ کا ایک دوست چند سال قبل افغانستان گیا تھا۔ واپسی پر اس نے افغانستان کے لوگوں کی جرأت، بہادری اور مہمان نوازی کی بہت تعریف کی تھی۔ اس نے اپنے والدین اور دوسرے اعزہ سے میرا تعارف کرایا اور ہر ایک کو بڑے فخر سے بتایا کہ میں افغان ہوں۔ افغان جو بہادر اور مہمان نواز ہوتے ہیں اور جب تعارف کے آخر میں وہ یہ کہتی کہ میں اس کا "دوست" ہوں تو میں دل میں خاصا پریشان ہوتا، مگر روسی تہذیب میں یہ عام سی بات ہے۔

## میرے ساتھ شادی کر لو

رفتہ رفتہ لینا میرے ساتھ اتنی بے تکلف ہو گئی کہ ایک روز مجھ سے کہنے لگی: "تم میرے ساتھ شادی کر لو"

میں لینا کی اس "فراخ دلانہ" پیش کش پر ہکا بکارہ گیا۔ پہلے تو میں نے بات ہنسی



میں ٹالنے کی کوشش کی، لیکن جب اسے سنجیدہ پایا تو دور یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ میرے ساتھ محبت کرتی ہے، تو مجھے تشویش ہوئی۔ اب میں نے اسے اُدبِ نیچ بتائی۔ یہ سمجھایا کہ روس اور افغانستان کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہے۔ ہماری تہذیبیں بالکل مختلف ہیں۔ وہ میری ہر دلیل کا جواب دیتی رہی اور اپنی بات پر اتنی مہر ہو گئی کہ میرے لیے ہسپتال میں دوسرا روم بن گئی۔ میں اس کی باتوں سے چڑتا، مگر وہ ذرا بھی بُرا نہ مانتی۔ میں اس سے چھپنے کی کوشش کرتا مگر وہ مجھے ڈھونڈ نکالتی۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگی:

”روس ہمارا آبائی وطن نہیں ہے، اس لیے اگر میں تمہارے ساتھ افغانستان چلی جاؤں گی، تو مجھے قطعی کوئی ملال نہ ہوگا۔“

اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس کا باپ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ٹھوکریں کھاتا ہوا کسی دوسرے ملک سے یہاں آیا تھا، لیکن جنگ کے بعد واپس نہ جاسکا۔ یتیموں کے کیمپ میں پلا، بڑھا اور اپنی ہمت سے یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم حاصل کی اور انجینئر بن گیا۔ اس کی ماں یوکرین کی رہنے والی ہے۔ اس لیے اگر وہ کوئی غیر ملکی شوہر منتخب کرے تو انہیں خوشی ہوگی۔

میں نے افغان معاشرے کے خدوخال بیان کرتے ہوئے لینا کو ڈرایا کہ وہاں جا کر تم اپنے آپ کو قیدی محسوس کر دو گی۔ وہاں عورت کو پردے میں رہنا پڑتا ہے تو اس نے کہا: ”تمہاری خاطر میں سب پابندیاں قبول کر لوں گی۔“

یہ حیرت بھی ناکام ہو گیا تو میں نے کہا:

”یقین کر دو بی بی! اگر یہ بات میرے اختیار میں ہوتی، تو میں کبھی تمہارا دل نہ توڑتا، مگر ہمارے معاشرے میں شادی بیاہ کے اختیارات والدین کے پاس ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے والدین مجھے تمہارے ساتھ شادی کی اجازت کبھی نہ دیں گے۔“

اپنے ہاتھ سے بازی نکلتے دیکھ کر اس نے اپنے مطالبے میں لچک پیدا کر دی۔

کہنے لگی: ”اچھا چلو، ہم پانچ برس کے لیے رشتہ ازدواج میں بندھ جاتے ہیں۔۔۔“



تہاری تعلیم مکمل ہو جائے تو تم مجھے چھوڑ کر چلے جانا۔“

میں نے حیران ہو کر کہا: ”ایسی شادی کا تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟“

میرے اس سوال کے جواب میں لینا نے کہا: ”میرے والدین ہر قیمت پر میری شادی کر دینا چاہتے ہیں اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ میری شادی کسی ایسے آدمی سے ہو جائے جو شہر میں اقامت رکھتا ہو۔“

### شادی یا سودا

اب مجھے اصل صورتِ حال کا علم ہوا۔ لینا کی طرح روس کی اکثر دیہاتی لڑکیوں اور ان کے والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ شہر چلے جائیں اور وہاں کوئی مستقل ملازمت حاصل کر سکیں۔ دیہی علاقوں کے اکثر نوجوان انجینئروں، ڈاکٹروں اور دوسرے ملازمین کو دور دراز کے دیہات اور وسط ایشیا کی ریاستوں میں بھیج دیا جاتا ہے اور کوئی روپی لڑکی یہ نہیں چاہتی کہ اُن کے ساتھ شادی کر کے بڑے شہروں کی پُرساؤ زندگی سے محروم ہو جائے۔ اس سے بچنے کے لیے بہت سی لڑکیاں اور بعض لڑکے بھی ایسی عارضی شادیوں کا سہارا لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ شادی محض سودا ہوتی ہے۔ ضرورت مند لڑکی یا لڑکے کو چند سو یا ہزار روپے کے بدلے اپنے لیے ایسا شوہر یا ایسی بیوی مل جاتی ہے جو نمائشی طور پر شادی کے رجسٹر پر دستخط کر دے۔ عموماً حکومت یہ عذر تسلیم کر لیتی ہے کہ چونکہ فلاں عورت یا شوہر یا فلاں شوہر کی بیوی شہر میں مقیم ہے اس لیے اسے دیہات میں یا دور دراز کے علاقے میں نہ بھیجا جائے۔ جب خطرہ دور ہو جاتا ہے، تو عارضی رشتے خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

لینا کے والدین مجھ سے ملے۔ بڑی ”شفقت“ سے میرا حال پوچھا اور پھر طرح طرح کی ترغیبات سے مجھے ہموار کرنے کی کوشش کی۔ اگر میں لینا سے شادی کر لوں گا تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا، بلکہ مجھے ”کچھ نہ کچھ“ ملے گا۔ لینا کو بھی شہر میں رہنے کا موقع مل جائے گا اور وہ میری وفادار بیوی بن کر رہے گی، وغیرہ وغیرہ۔ پہلے تو



میں نے نرمی سے ان کی بات ٹالنے کی کوشش کی، مگر جب وہ گھیرا تنگ کرتے نظر آئے تو میں نے قدرے سختی سے کہا کہ اصرار نہ کریں، ورنہ میں اپنی یونیورسٹی کی انتظامیہ کو بتا دوں گا۔ اس طرح میری جان لینا اور اس کے والدین سے چھوٹ گئی۔

## روسی ہسپتالوں کی اقسام

ہسپتال میں میرا علاج غیر تسلی بخش تھا۔ معدے کی معمولی تکلیف اتنی بڑھ چکی تھی کہ مجھے دوسرے سمٹر کا امتحان بھی ہسپتال سے دینا پڑا۔ امتحان کے بعد یونیورسٹی انتظامیہ سے درخواست کی کہ مجھے کسی اچھے ہسپتال میں بھیجا جائے۔ بڑی کوششوں کے بعد مجھے دوسرے ہسپتال میں داخلہ ملا۔

روس میں ہسپتالوں کی تین اقسام پائی جاتی ہیں :  
اعلیٰ درجے کے ہسپتال جو اعلیٰ حکام اور کمیونسٹ پارٹی کے اہم اراکین اور عہدیداروں کے لیے مخصوص ہیں۔ ان ہسپتالوں میں علاج معالجے کی جدید ترین سہولتیں میسر ہیں، لیکن یہاں صرف درجہ اول کے شہری ہی بار بارہا سکتے ہیں۔ عوام کے یہاں "پہ" جلتے ہیں۔

ہسپتالوں کی دوسری قسم پارٹی کے متوسط درجے کے کارکنوں، یونیورسٹی اساتذہ کارخانوں کے اعلیٰ افسروں اور پولیس اور فوج کے عہداروں کے علاج کے لیے ہے۔ تیسرے درجے میں عام مزدوروں، کسانوں اور تیسرے درجے کے شہریوں کا علاج ہوتا ہے۔ طلبہ اور دوسرے غریب طبقے کے افراد ایسے ہی ہسپتالوں میں علاج کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ علاج تو یہاں بھی ہوتا ہے، لیکن مریضوں پر پوری توجہ صرف نہیں کی جاتی اس لیے بہت کم مریض یہاں سے پوری طرح شفا یاب ہو کر واپس جاتے ہیں۔ اگرچہ یہاں بھی دوائیں مفت دی جاتی ہیں، ڈاکٹروں کے معائنے کی فیس نہیں لی جاتی، خوراک بھی مفت ہے، لیکن طریق علاج ایسا ہے کہ جس سے بیماری دور ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتی ہے۔ وجہ شاید یہ ہو کہ ڈاکٹر اپنے مریضوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔



## قابل تقلید روایت

روس میں ڈاکٹروں کو وہ عیش نہیں ملتا جو ہمارے غریب ممالک کے ڈاکٹروں کو میسر ہے۔ وہاں کسی قسم کے پرائیویٹ کلینک یا لیبارٹری کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس طرح عوام کو ٹوٹنے کے مواقع ڈاکٹروں کو بالکل حاصل نہیں ہیں۔ اگر کوئی ڈاکٹر خفیہ طور پر کسی مریض کو دیکھتا یا معاوضہ لیتا ہے، تو قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایسا کر سکتا ہے یا پھر ایسے ڈاکٹر جن کی ادبیت تک رسائی ہو، وہ مریضوں کے گھروں پر جا کر ان سے بھاری معاوضہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر بھی اس کام میں خطرہ ہے جس کا راز افشا ہو جائے تو اس کی شامت ضرور آتی ہے۔

## امراء کے ہسپتال میں

میں چاہتا تھا کہ روسی زبان پر پوری قدرت حاصل کر لوں۔ تیسرے سمسٹر کا آغاز ہونے والا تھا اور میں مزید لیکچر ضائع نہ کرنا چاہتا تھا، مگر بیماری سے نجات کی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ کئی مرتبہ ڈاکٹروں سے اجازت مانگی، ہمیشہ ایک ہی جواب ملا: ”جب تک تم اجازت نہ دیں گے تم نہیں جا سکتے“ پھر ایک روز لیڈی ڈاکٹر سے تمام صورت حال کہہ سنائی اور اس سے پوچھا کہ مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا؟ اس نے بتایا کہ ہو سکتا ہے سال بھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ ٹھیک ہونے میں لگ جائے۔ یہ سن کر میری پریشانی اور بڑھ گئی۔ اس خاتون نے مجھے راز دارانہ انداز میں بتایا کہ اگر میں جلد صحت یاب ہونے کا خواہاں ہوں تو کالینن کے شفا خانے میں داخلے کی کوشش کروں۔ ورنہ اس ہسپتال میں آنے والے تو علاج کے لیے نہیں، مختلف صربوں سے آرام کرنے آتے ہیں۔

کالینن ہسپتال میں داخلے کے لیے کسی بااثر شخصیت سے تعلق ضروری تھا؛ چنانچہ میں نے اپنے شعبے کے سربراہ کے ذریعے کوشش کی تو مجھے وہاں داخلہ مل گیا۔



بلاشبہ اس ہسپتال کا طریق علاج بہت اچھا تھا۔ داخلے کے ساتھ ہی مجھے ایک کتا بچہ دیا گیا جس میں میری بیماری کی جزئیات تک درج کر دی گئیں۔ پھر صرف پندرہ روز میں میری بیماری کا قلع قمع ہو گیا اور مجھے ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔

### جشنِ آزادی منایا

دنک میں دو افغان طالبات بھی زیرِ تعلیم تھیں۔ دونوں ہماری یونیورسٹی سے کچھ فاصلے پر ایک میڈیکل کالج میں پڑھتی تھیں۔ انہیں جب پتہ چلا کہ اسی شہر میں ایک افغان طالب علم موجود ہے تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ اس کے بعد میں کئی بار ان کی خبر گیری کرنے جاتا رہا۔ افغانستان کا یومِ آزادی آیا، تو میں نے فیصلہ کیا کہ ایک مختصر سی تقریب منعقد کروں۔ ان دونوں بہنوں کو بھی دعوت دی، وہ بھی آئیں۔ میں نے اپنے ہاسٹل کے کمرے کو جھنڈیوں سے سجایا۔ ہم نے اپنا قومی لباس پہنا۔ کئی روسی طلبہ بھی مبارک باد پیش کرنے آئے۔ دوپہر کے وقت جب افغان بہنیں کھانا تیار کر رہی تھیں میں نے سوچا نماز پڑھ لوں۔ ابھی میں فرض ادا کر رہا تھا کہ باہر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دوبارہ دستک ہوئی۔ میری نماز مکمل نہ ہوئی تھی اس لیے آنے والے نے دروازے کو خود ہی کھولا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں نے سلام پھیرا تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، مختلف شعبوں کے سربراہ، اساتذہ اور غیر ملکی طلبہ کے امور کے نگران افسر میرے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے فرداً فرداً مصافحہ کیا اور ان سب کو اپنے ہاں آنے پر خوش آمدید کہا۔

وائس چانسلر صاحب کچھ حیران سے تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے: ”ابھی جب تم تمہارے کمرے میں آئے تو تم نے تو ہماری دستک پر باہر نکلے نہ ہمارے ساتھ مصافحہ کرنے کی کوشش کی، یہ تم خاموشی سے کیا اٹھ بیٹھ رہے تھے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

میں نے انہیں بتایا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آج کے جشنِ آزادی کی مناسبت سے



ہم پر اپنے خدا کے حضور سجدہ شکر خاص طور پر واجب ہے جس نے ہمیں آزادی جیسی نعمت سے نوازا ہے۔ وائس چانسلر صاحب میری بات سے خاصے متاثر ہوئے اور کہنے لگے: ”بہت اچھی بات ہے۔ ہر قوم کو اپنے رسوم و روایات کی پابندی کرنی چاہیے“ انہوں نے مزید کہا کہ ان کی بوڑھی والدہ پابندی سے کلیسا جاتی اور باقاعدگی سے تمام رسوم میں حصہ لیتی ہیں۔ اس کے بعد تمام اساتذہ نے ہمیں جشن استقلال پر مبارک باد دی اور تحائف پیش کیے۔

رخصت ہونے سے پہلے وائس چانسلر نے مجھے بتایا کہ آئندہ سنیچر کو انٹر کلب میں بھی افغانستان کا جشن استقلال منایا جائے گا۔ میں نے مناسب الفاظ میں ہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

سنیچر کو غیر ملکی طلبہ کے کلب میں افغانستان کا جشن آزادی بھرپور طریقے سے منایا گیا۔ اس تقریب میں یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ کیونسٹ پارٹی کے اہم عہدیداروں اور مقامی کارخانوں کے اعلیٰ افسروں نے شرکت کی۔ طلبہ کی کثیر تعداد بھی آئی تھی۔ تقریب کے آغاز میں مجھے افغانستان کے بارے میں تعارفی کلمات کہنے کا موقع ملا۔ میں نے افغانستان کی تاریخ کے حوالے سے مختصر اچند باتیں کیں۔ میں نے کہا:

”افغانستان کی تاریخ حریت کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ افغانوں نے کسی جارح کے سامنے کبھی سپر نہیں ڈالی، انگریزوں نے جب پولی دنیا پر استعماریت کا جھنڈا گاڑ لیا، تو ہمارے ملک کا رخ کیا تھا، لیکن انہیں منہ کی کھا کر واپس جانا پڑا تھا“

افغانوں کے اسلامی تشخص کے بارے میں بتایا:

”افغان مسلمان اپنی قوم، وطن اور آزادی کو اپنے دین کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔ ان کی ملی غیرت کا عالم یہ ہے کہ کوئی افغان اسلام کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا“

بعد میں یونیورسٹی کے علمی کمیونزم کے شعبے کے سربراہ کو دعوت خطاب دی



گئی۔ انہوں نے روس اور افغانستان کے تاریخی روابط کا تذکرہ یوں کیا :  
 ”لینن نے افغانستان سے خوش گوار تعلقات رکھے اور اس پالیسی پر  
 بار بار زور دیا۔ ۱۹۱۹ء میں افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کا سب سے  
 پہلا اعلان روس نے کیا۔ آج بھی ہماری یہی کوشش ہے کہ افغانستان کے  
 ساتھ ہمارے تعلقات کو فروغ ملے۔ ہم نے کبھی افغانستان کے اندرونی  
 معاملات میں دخل اندازی کی ہے نہ کریں گے۔“

### یہودی پروفیسر

نئے سسٹر کا آغاز ہوتے ہی ہمیں پڑھائے جانے والے اکثر مضامین تبدیل ہو  
 گئے۔ سوائے کیونسٹ پارٹی کی تاریخ کے۔ یہ مضمون ہمیں ایک یہودی نشریات خاتون  
 اکاشیزینی اسخا کولینی پڑھاتی تھیں۔ تدریس کے دوران وہ ہمیں تلقین کرتیں کہ اپنے ملکوں  
 میں واپس جائیں، تو کیونز م کی اشاعت کریں۔ چونکہ ہم میں سے اکثر طلبہ کا تعلق مسلم  
 ممالک سے تھا خصوصاً اس خاتون کے شاگردوں میں شام، لبنان، عراق، بنگلہ دیش،  
 افغانستان، لیبیا، الجزائر، سوڈان، فلسطین اور صومالیہ کے طلبہ زیادہ تھے، اس لیے وہ  
 بڑی ہمدردی سے مسلم ممالک کی بد حالی اور پس ماندگی کا ذکر کرتیں۔ ان کا لہجہ ایسا ہوتا جیسے  
 وہ ہمارے عوام کے غم میں کڑھ رہی ہوں، لیکن ہمیشہ ان کی تان اس پر ٹوٹتی کہ چونکہ ابھی  
 تک مسلم ممالک ازمنہ قدیم کے نظریات پر چلتے ہیں اس لیے وہ ترقی نہیں کر سکتے۔  
 وہ ہمیں تاکید کرتیں کہ ان کہنہ افکار کا مقابلہ کریں۔ یہ اس صورت میں ممکن ہو گا جب آپ  
 یہاں سے ذہنی اور فکری طور پر مالا مال ہو کر جائیں گے۔ وہ کیونز م کو خالصتہً علمی اور  
 انقلابی نظریہ قرار دیتیں، لیکن کیونز م کیا ہے، اس کے بارے میں وہ بہت کم بتائیں،  
 اس کے برعکس وہ زیادہ وقت بحث و مباحثے میں گزار دیتی تھیں۔ وہ ہمیں تو قدامت سے  
 نفرت دلاتیں اور ہر وقت انقلاب کا ذکر کرتیں، لیکن یہودیوں کی روایت اور قدامت کی  
 تعریف میں ہر وقت رطب اللسان رہتی تھیں۔ روس کے کیونسٹ انقلاب میں یہودیوں



کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے فخر سے ان کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔

۱۹۴۳ء کی جنگ میں اسرائیل کو بعض محاذوں پر ہزیمت ہوئی تو اکاتیرنی اتنی پشیمردہ ہوئیں کہ کئی روز تک اس موضوع پر بات کرنے سے بھی کتراتی رہیں۔ بعد میں وہ اسرائیل عرب تنازعے میں اسرائیل کو مبنی برحق ثابت کرنے لگیں۔ اسرائیل کی تعریفیں کرتے ہوئے کبھی کبھار وہ امریکہ کے کردار کو بھی سراہتیں۔ حالانکہ روس میں امریکہ کو گالیاں دینا ایک عام فیشن ہے۔

### ہر حال میں غیر جانبداری

روسی معاشرے میں فرد کی آزادی حکومت کے رحم و کرم پر ہے۔ کسی شخص پر چانک کوئی الزام لگا کر اسے سلاخوں کے پیچھے دھکیل دینا یا دور دراز جلا وطن کر دینا، بیگار میں پکڑ لینا معمولات سے ہے۔ حالات نے عوام کی ایسی تربیت کی ہے کہ وہ بڑے بڑے مسائل کو سرسری نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہ حقائق سے آنکھیں چراتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے کسی شخص پر سنگین الزام عائد کر دیا جائے یا دباؤ ڈالا جائے تو کسی میں یہ جرات نہیں کہ وہ حقیقت حال کا سراغ لگانے کی کوشش کرے۔ کسی شخص کو پکڑ لیا جائے، تو اس کی ماں، بیوی اور بچے گھر میں چھپ کر تورہ سکتے ہیں، لیکن تہمت نہیں کر سکتے کہ کسی سے پوچھ لیں کہ آخر پکڑے جانے والے کی خطا کیا تھی؟ میں نے اس رجحان کے بارے میں کئی روسی طلبہ سے گفتگو کی۔ مختلف باتیں سننے میں آئیں، لیکن ہر ایک نے یہ بات ضرور کی کہ وہ اشتراکی معاشرے میں رہتے ہیں اس لیے انہیں ہر حال میں غیر جانبدار رہنا ہے۔

”غیر جانبداری“ عوام کی فطرت کا جزو لازم بن چکی ہے۔ ایک صاحب جو خود

عقاب کی زد میں آچکے تھے، کہتے تھے:

”حکومت کا حق ہے کہ بورژوائیت کے اثرات کو ہر ممکن طریقے سے ختم کرے۔ اسی لیے عوام حکومت کا ساتھ دیتے ہیں“



جب میں نے ان سے پوچھا کہ اگر حکومت کوئی غیر منصفانہ اقدام کرے تو کیا عوام کو اس کے خلاف آواز اٹھانے کا حق بھی حاصل ہے؟ تو اس بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

### کیونسٹ کے گھر کا قبلہ، امریکہ

ایگزیکٹو اینڈریو پیچ نامی ایک انجینئر سے میری شناسائی تھی۔ وہ دنسک میں مشینوں کے پرزے تیار کرنے والے ایک کارخانے میں ملازم تھا۔ چونکہ ہم اس کارخانے میں جاتے تھے اس لیے اس سے بات چیت کا موقع ملتا تھا۔ وہ کیونسٹ پارٹی کا مخلص کارکن تھا۔ ہمارے ساتھ خاصی بے تکلفی سے باتیں کرتا۔ گھر بھی لے جاتا اور ہم چائے اور کافی پر گپ شپ کرتے۔ کئی باتیں وہ چھپا جاتا، بعض اوقات اچانک بات کرتے ہوئے موضوع تبدیل کر دیتا۔ اس کی بیوی بے تکلف خاتون تھی۔ اپنے شوہر کی ڈپلومیسی کے برعکس وہ جو جی میں آتا کہہ دیتی تھی۔ اس کے دربیٹے اور ایک بیٹی۔ نوجوان کیونسٹ تنظیم سے وابستہ تھے۔ کیونسٹزم سے اتنی مناسبت کے باوجود وہ سب کے سب ”مغرب“ کے دیوانے تھے۔ مغربی لباس اور مغربی موسیقی کے دلدادہ اور مغرب کی بنی ہوئی اشیاء پر فریفتہ۔ ان کے گھر میں آرائش کی اکثر چیزیں مغربی مالک کی بنی ہوئی تھیں جو وہ بلیک مارکیٹ سے خرید کر لائے تھے۔

اندریو پیچ کے بیوی بچے روسی حکومت کی پالیسیوں پر اکثر تنقید کرتے تھے اور وہ خود اس صورت حال سے خوش نہ تھا۔ کئی بار وہ اپنے بچوں کی باتوں سے چڑھتا اور بڑی اداسی سے کہتا کہ میں انہیں مخلص کیونسٹ بنانا چاہتا ہوں، لیکن ان سب کا قبلہ امریکہ ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ جب اینڈریو پیچ مجھے حکومت کی شاندار ترقی پسندانہ پالیسیوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا تو اس کا لڑکا یا لڑکی بیچ میں بول اٹھتے: ”لوگ تو اس سے خوش نہیں ہیں۔“



## چوتھا باب

### مادی ترقی اور روحانی زوال

روس نے گزشتہ چالیس برس میں زبردست ترقی کی ہے خصوصاً صنعتی پیداوار اور جدید اسلحے کی تیاری میں تو ناقابل یقین حد تک کامیابیاں حاصل کر لی ہیں۔ کروڑوں مربع کلومیٹر وسعت رکھنے والے اس ملک کا بیشتر علاقہ تیل بستی میدانوں اور صحراؤں پر مشتمل ہے۔ انتہائی شمال میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں سال کا اکثر حصہ زمین پر برف کی تہہ جمی رہتی ہے۔ روس کے حصے میں سمندر بھی ایسے ہی آئے ہیں جن کی سطح پر برفانی ٹودے تیرتے ہیں۔ اتنے مشکل حالات میں روسیوں نے اپنے ملک کو پس ماندہ ملکوں کی صف سے نکال کر دنیا کی ایک سپر پاور بنا ڈالا ہے۔ معاشرے میں اگرچہ امیر غریب کا فرق موجود ہے، شہر اور دیہات کے باسیوں کی بود و باش اور طرز زندگی میں تفاوت ہے، لیکن بحیثیت مجموعی حالت بہت بہتر ہوئی ہے۔ عام لوگ اپنی معاشی حالت سے غیر مطمئن نہیں، لیکن جن لوگوں نے ماضی کا روس اور جنگ سے پہلے کا دور دیکھا ہے وہ بہت مسرور ہیں۔

صنعتی ترقی کے سلسلے میں حکومت نے وسط ایشیا کے اقلیتی علاقوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہاں بھی سینکڑوں صنعتی اور زرعی یونٹ کام کر رہے ہیں۔ ہزاروں مربع کلومیٹر بنجر زمین آباد کی گئی ہے۔ لوگوں میں بیروزگاری ختم کرنے کے لیے بھی ٹھوس منصوبے بنائے گئے ہیں۔



یہ تو مادی ترقی کا مسئلہ ہے، لیکن روحانی طور پر روس کا معاشرہ تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے۔ کیونکہ زمین نے کلیسا اور مسجد کو ہی مقفل نہیں کیا، لوگوں کی زبانوں پر بھی تالے ڈال رکھے ہیں جو خدا اور آخرت کے تصور پر اب بھی یقین رکھتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں پورا معاشرہ اس ذہنی سکون سے محروم ہو گیا ہے جو صرف خدا پر یقین اور حیات بعد الموت پر اعتبار کر کے ہی حاصل ہوتا ہے۔

اچھی قدریں مٹ گئیں، لیکن ان کی جگہ اچھی روایت نے نہیں لی۔ روسی سماج کا پرانا ڈھانچہ توڑنے کا کام تو کسی حد تک مکمل ہو گیا ہے، لیکن نئی تعمیر ابھی شروع نہیں کی گئی جس معاشرے میں معبود اور خالق ہیں سینماؤں اور رقص گاہوں میں بدل دیئے جائیں، خدا ترسی اور خدا شناسی وہاں سے رخصت ہو جاتی ہے۔

وسائل پیداوار ہاتھ میں لینے سے حکومت کو ایک فائدہ ضرور حاصل ہوا ہے۔ لوگوں میں احتجاج یا مزاحمت کرنے کی سکت ختم ہو گئی ہے۔ انقلاب کی ساٹھ سالہ تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ اگر کہیں سے احتجاجی تحریک ابھری ہے، تو وسائل نہ ہونے کی بنا پر جلد ہی دم توڑ گئی۔ روسی عوام ہڑتال، مظاہروں اور جلسے جلوسوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جن دنوں نجی زرعی زمینیں چھین کر سرکاری فارموں میں تبدیل کی جا رہی تھیں، لوگوں نے مزاحمت کی تھی۔ حکومت نے مزاحمت کو بزورِ طاقت کچل کر رکھ دیا۔

چمرچل نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ سٹالین نے ایک ملاقات میں بتایا کہ روس نے اجتماعی کاشتکاری کے دوران میں بیس لاکھ افراد کی قربانی دی ہے۔ ہمارے ایک استاد نے بتایا کہ ۱۹۳۲ء میں یوکرین کے مزدوروں نے احتجاجی مظاہرے کیے تو حکومت نے وہاں مصنوعی قحط پیدا کر دیا۔ باہر سے ایک دانہ غلہ اندر آنا روک دیا گیا۔ ہزاروں لوگ بھوک سے مر گئے۔ پھر کسی کو احتجاج کی ہمت نہ ہوئی۔

آپ کسی روسی باشندے سے ملیں، تو وہ آپ کی خیریت پوچھنے اور اپنی خیریت بتانے سے پہلے کیونکہ زمین کی تعریف کرے گا، لیکن اگر آپ اُسے یقین دلا سکیں کہ آپ کا تعلق "کے جی بی" سے نہیں ہے تو وہ فوراً ہی محذرت کرے گا کہ اسے آپ کے



بارے میں غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کمیونزم پر تین حرف بھیجتے ہوئے وہ اس کے بانیوں کو شیطان کے چیلے قرار دینے سے بھی نہ چڑھ کے گا۔ میرا ایک روسی طالب علم ساتھی اکثر بڑی حسرت سے کہا کرتا تھا: "کاش ہم کمیونزم کو جبر سے اور جبر کو کمیونزم سے الگ کر کے دیکھ سکتے!"

جدید روس کے بانیوں میں سے ایک، شالین نے اپنی موت سے ایک روز پہلے حکم دیا کہ کرملین کے تمام ڈاکٹروں کو گرفتار کر لیا جائے اور انہیں عبرتناک سزائیں دی جائیں۔ اپنے خصوصی معالج ڈاکٹر فرساگرادوف کے بارے میں تو اس نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں میں کیلیں ٹھونک کر اسے دیوار پر لٹکا دیا جائے۔ دوسرے ڈاکٹروں کو کوٹے مارنے کا حکم دیا۔ اس کا انکشاف شالین کے جانشین خروشیف نے کیا۔

### مغموم اور تنہا لوگ

کریوے روگ میں قیام کے دوران ایک روز ایک خاتون سے ملاقات ہوئی۔ میں نہر کے کنارے گھوم رہا تھا کہ وہ میرے پاس آکر مجھ سے مخاطب ہو کر میرا حال احوال پوچھنے لگی جب اسے معلوم ہوا کہ میں غیر روسی اور طالب علم ہوں تو اس نے مجھ سے درختوں کی کہ وہ چند باتیں کرنا چاہتی ہے۔ اس نے کہا۔ اگر میں نے اس کی باتیں نہ سنی تو گھٹن سے اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ اس کے بعد اس نے طویل داستان سنائی جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا:

"میرا شوہر ایک کارخانے میں ملازم تھا۔ معمولی سے مسئلے پر اسے ملازمت سے نکال دیا گیا ہے۔ میں کپڑے کی ایک دکان پر کام کرتی ہوں۔ مجھے صرف ستر روپل ماہانہ ملتے ہیں۔ ہمارے پاس رہائش کے لیے ٹھکانہ تک نہیں۔ میں ایک دوسری عورت کے پاس عارضی طور پر رہائش پذیر ہوں جبکہ میرا خاوند در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ کہیں ایک دو روز کے لیے کام ملتا ہے، پھر بے روزگار ہو جاتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے بڑے افسر اس سے



ناراض ہیں۔“

اس خاتون کا خیال تھا کہ شاید مقامی کارخانے کے اعلیٰ افسر سے میری جان پہچان ہو اور میں اس سے اس کے خاوند کی سفارش کر سکوں، تاکہ وہ اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیں، لیکن میں اس خاتون کو تسلی کے دو فقروں کے سوا کچھ نہ دے سکا۔

جدید نظام نے فرد کی زندگی کو آسائش کے ساتھ ساتھ الجھنوں سے بھی دوچار کر دیا ہے۔ دوسرے مغربی ممالک کی طرح روس میں بھی لوگ بے پناہ انفرادی مصائب میں مبتلا ہیں۔ اس محرومی کی شدت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ لوگوں سے ذاتی تسکین کا سہارا، مذہب بھی چھین لیا گیا ہے، کم آمدنی والے لوگ بنیادی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ معاشرے میں نفسا نفسی کی حالت ہے۔ کسی کو دوسرے کے دکھوں کا مداوا کرنے کا یارا ہے نہ فرصت۔ شراب کو تنہائی کا بہترین رفیق خیال کیا جاتا ہے، لیکن شراب کے اخراجات پورے کرنے بھی عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔

میرے اکثر طالب علم ساتھی مجھ پر رشک کرتے تھے کہ میں شراب نہیں پیتا اور شراب پر اٹھنے والے بیس روپل ماہانہ کے فاضل مصارف بچا لیتا ہوں۔

چھ برس روس میں رہنے کے بعد میں نے اس حقیقت کا سراغ پایا کہ لوگ شراب شوق کی خاطر نہیں، ناگزیر سمجھ کر پیتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں اپنے ایک ہم سبق کی مثال دوں گا جس کا نام دلو دیا تھا۔

### غموں کا سہارا، شراب

دلو دیا یونیورسٹی میں داخل ہونے سے پہلے لازمی فوجی خدمات انجام دے چکا تھا۔ اس کے صلے میں اس کی ایک ٹانگ ناکارہ ہو گئی تھی اور بلیا کھی کے سہارے

۱۔ ایک مختلط اندازے کے مطابق ہر روسی شہری اپنی آمدنی کا دس فیصد حصہ شراب کی نذر کر دیتا ہے۔



چلتا تھا۔ دلو دیابے پناہ شراب پلتیا اور کلاس میں بھی شراب کی ایک بوتل اپنے پاس رکھتا تھا۔ وہ مجھے اکثر سائبریا میں فوجی ملازمت کے دوران پیش آنے والے واقعات سناتا۔

ایک روز اس نے بتایا کہ شدید برف باری میں میلوں پیدل چلنے کی وجہ سے اُس کا پاؤں سوج گیا، لیکن بروقت علاج کی سہولت نہ ملی۔ چھ ماہ تک کیمپ میں بے یار و مددگار پڑے رہنے کے بعد جب اسے چھٹی ملی، پھر بھی ڈاکٹروں نے اس کے علاج کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہ دی۔

میں اسے مستقل علاج کرنے کا مشورہ دیتا تو وہ کہتا کہ ہسپتال والے گولیاں دے کر رخصت کر دیتے ہیں۔ ہسپتالوں میں مستقل داخلہ غریبوں کو نہیں دیا جاتا۔ ایک روز دلو دیابے نے بتایا کہ وہ ایک ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ اس نے پرائیویٹ طور پر علاج کرنے کے پانچ سو روبل مانگے۔ ایک غریب طالب علم جس کا ماہانہ وظیفہ محض 30 روبل تھا، اتنی رقم کہاں سے لاتا!

میں اسے شراب پینے سے منع کرتا تو وہ کہتا: ”تم خوش نصیب ہو، تمہیں کوئی غم نہیں۔ مجھ سا بد نصیب شراب نہ پیے تو کیا کرے گا؟“

دلو دیابے قسوی ہسپتال میں انجکشن لگوانے جایا کرتا تھا۔ ایک روز خوش خوش واپس آیا۔ کہنے لگا: ”میں نے ہسپتال کی ایک نرس سے شادی کر لی ہے۔ اس کی تنخواہ نوے روبل ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ میرا علاج کرائے گی۔“

دلو دیابے کی بیوی نے اس کی ہر ممکن مدد کی اور مقدور بھر علاج کرایا، لیکن اس کے حالت سنبھلنے کی بجائے بگڑتی چلی گئی۔ رفتہ رفتہ وہ پھر پہلی ڈگر پر آگیا۔ یونیورسٹی آنے جانے کے قابل نہ رہا۔ کچھ روز تک تو بیوی کے پیسوں پر شراب پلتی رہا پھر بھیک مانگنے تک نوبت آگئی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ رات کے وقت میری آنکھ اچانک کھلتی تو مجھے

دلو دیابے کی چارپائی کے نیچے بے سدھ سویا ہوا دکھائی دیتا۔  
میں اسے بیدار کرتا تو بڑبڑا کر معذرت کرتا: ”معاف کرنا۔ میں دنیا کا ٹھکرایا



ہوا انسان ہوں۔ صبح چلا جاؤں گا۔“  
صبح وہ چلا جاتا اور کئی کئی روز تک اس کا پتہ نہ چلتا۔ آخر کار وہ مستقل طور پر لاپتہ ہو گیا۔ ممکن ہے کسی ہسپتال میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہو گیا ہو یا کسی دوسرے شہر میں بھیک مانگ کر مزید صدمے پہنچنے کے لیے زندہ ہو۔

### دروغ گوئی۔ ایک معاشرتی ضرورت

روسیوں کی ایک عادت جس کا میں یہاں خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں، حد سے بڑھی ہوئی دروغ گوئی ہے۔ وہ حقائق کو منہ کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے زمین و آسمان کے قلابے ملا تے ہیں، لیکن کسی دوسرے کی ہزار دلیلوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ہمارے ایک روسی استاد مینخائیل نے لیکچر کے دوران کئی بار کہا :

”دوسروں کو فریب دینا ہماری فطرتِ ثانیہ بن چکا ہے۔ ہم سے یہ کام غیر شعوری طور پر سرزد ہوتا ہے۔“

وہ اس کمزوری کا سبب قومی طور پر احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کو قرار دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دوسروں کے مقابلے میں ہم اپنے آپ کو حقیر جانتے ہیں۔ جہاں ہمارا پہلو دبتا ہے وہاں ہم جھوٹ بولتے ہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عام لوگ بے تحاشا جھوٹ بولتے ہیں۔

اعلیٰ حکام کارخانوں، سکولوں اور زرعی فارموں کے معائنے پر آتے ہیں، تو مقامی عہدیداران کو خوش کرنے کے لیے حقائق چھپاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ایسی تصویب پیش کی جاتی ہے جس سے ترقی اور کامرانی کا تاثر دیا جاسکے۔ پھر معائنے کے بعد جب یہی اعلیٰ افسر واپس جاتے ہیں، تو اپنے بڑوں کو رپورٹ پیش کرتے وقت اس جھوٹ میں کئی گنا اضافہ کر دیتے ہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ٹیلی ویژن پر خوشخبری سنائی جاتی ہے، فلاں مقام پر اجتماعی



کاشتکاری کے فارم پر غلہ مقررہ مقدار سے اتنا زیادہ پیدا ہوا، اس سال گوشت، دودھ اور انڈوں کی پیداوار میں اتنے فیصد اضافہ ہوا ہے، لیکن دعووں کا موسم گزرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ روس اپنی ضرورت کے لیے کینیڈا، امریکہ اور آسٹریلیا سے کرڈروں ٹن اناج درآمد کرتا ہے۔ اس وقت حکومت اپنے منصوبہ سازوں سے نہیں پوچھتی کہ تمہارا فاضل غلہ کہاں گیا؟ گندم، انڈے، گوشت اور دوسری اشیائے ضرورت کی تمام سال قلت رہتی ہے، لیکن اجتماعی فارموں والے ہمیشہ ریکارڈ توڑتے نظر آتے ہیں۔ دعوے کرنے والوں سے کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ اضافی پیداوار آخر کہاں جاتی ہے؟

کیونسٹ پارٹی کے اجلاسوں اور کسومول کمیٹیوں کی کانفرنسوں میں سالانہ اور پنج سالہ منصوبے بنتے ہیں۔ ان منصوبوں پر عمل درآمد کے دوران جو رپورٹیں مرتب کی جاتی ہیں ان کے مطابق ہر کارخانہ اور کلخوز (اجتماعی کاشتکاری کا یونٹ) پیداوار میں اول یا دوم آتا ہے۔ معیار کے لحاظ سے بھی ان کی پروڈکشن پر نمبر ایک کی مہر لگتی ہے، لیکن اس معیار کی قلعی اس وقت کھل جاتی ہے جب جاپان اور دوسرے مغربی ممالک کی اشیاء دنیا بھر کی منڈیوں میں جگہ پاتی ہیں اور روسی اشیاء کو نسبتاً سستی ہونے کے باوجود کوئی نہیں پوچھتا۔

### غیر طبقاتی معاشرے کے دو طبقے

روس کا ایک طبقہ بلاشبہ ایسا ہے جو عیش و آرام کی زندگی گزارتا ہے۔ یہ لوگ بڑے شہروں میں آباد ہیں اور باہر سے آنے والے لوگ زیادہ تر اسی تحفظ یافتہ طبقے کو دیکھتے ہیں۔ روسی ذرائع ابلاغ ان ہی لوگوں کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے یہ مزے کیونرم کی وجہ سے ہیں۔ روس جانے والے اس طبقے کو روس کا نمائندہ خیال کرتے ہیں، وہ اس مظلوم طبقے کی حالت سے آگاہ نہیں ہو سکتے جو حالات کی چکی میں پس رہا ہے۔ وہ مزدور اور کاشتکار جو دیہات میں جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ جو خون پسینہ ایک کرتے ہیں، انہیں بہت کم اجرت ملتی ہے۔ انہیں یہ تسلی دی جاتی ہے کہ جب کیونرم پوری طرح آجائے گا تو تم بھی عیش کر دو گے۔



غریب طبقہ زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہے۔ اکثر دیہات اور چھوٹے شہروں میں گوشت کی راشننگ ہے۔ دودھ، دیہی، بنا سیتی، مکھن اور دوسری اشیائے خورد و نوش ہفتوں نہیں ملتیں۔ دکانوں پر اشیائے ضرورت کے خریداروں کا اردہام ہوتا ہے۔ بعض اوقات سارا سارا دن قطاروں میں کھڑے رہنے کے بعد بھی مطلوبہ چیز نہیں ملتی۔ خاندان کے بوڑھے افراد ضروریات زندگی کے حصول کے لیے علی الصبح گھروں سے نکلتے اور سٹوروں کے کھلنے سے پہلے قطاروں میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ دن بھر کھڑے رہنے کے بعد انہیں کچھ نہیں ملتا اور شام کو بے نیل مرام واپس چلے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ جب ایک غیر ملکی ڈاکٹر سے میں نے پوچھا کہ انہیں روس آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے تو انہوں نے جواب دیا :

”چار برس ہو چکے ہیں، لیکن دو برس قطاروں میں کھڑے ہو کر گزار دیے۔“

طالب علموں کے لیے اشیائے صرف کی خریداری بڑا مسئلہ تھا کیونکہ وقت ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا، اس لیے جب قطار میں کھڑے کھڑے گھنٹے گزر جاتے تو سخت ذہنی کوفت ہوتی۔ کئی بار میں انتظار سے اکتا کر خالی ہاتھ واپس آ جاتا۔ لوگ مجھے قطار سے نکل کر واپس جاتے دیکھ کر بہت حیران ہوتے تھے۔ دیگر اشیاء کا تو کیا ذکر، خشک روٹی خریدنے کے لیے بھی کئی گھنٹے قطار میں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ ہوٹلوں میں کھانا کھانے جاتے تو کئی گھنٹے قطار میں کھڑے رہ کر باری آتی۔ مخلوط طعام گاہوں میں اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ وہاں مجھ جیسے کسی بے صبرے کے لیے کھانا کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر ایسے ہوٹلوں میں کھانا غیر معیاری بھی ہوتا ہے، لیکن کم آمدنی والے لوگ ان ہوٹلوں کا رخ کرتے ہیں اس لیے کہ وہاں کھانا سستا ہوتا ہے۔

روس میں گوشت کا حصول ایک مشکل کام ہے۔ عام سٹوروں پر گوشت کی



بہت کم مقدار آتی ہے جو بہت تھوڑے ہاتھوں تک پہنچتی ہے۔ اکثر طلبہ یونیورسٹی کے اساتذہ سے درخواست کرتے تھے کہ ان کے لیے گوشت کا انتظام کر دیں۔ چونکہ اساتذہ کے لیے گوشت کا خصوصی کوٹہ یونیورسٹی بھیجا جاتا ہے اس لیے بعض اوقات وہ اپنے حصے سے طلبہ کو بھی نواز دیتے ہیں۔ اکثر اوقات اساتذہ بھی شکوہ کناں رہتے ہیں کہ ان کا حصہ کم اور غیر معیاری ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ان کی شکایت بے جا تھی، کیونکہ عام لوگوں کی حالت ان سے کہیں زیادہ قابلِ رحم تھی۔

ہمارے اساتذہ کو خاصی مراعات حاصل تھیں، لیکن وہ بھی قسمت کے شاکہ رہتے تھے۔ شکایت کا موضوع اکثر یہ ہوتا کہ مراعات یافتہ طبقہ عیش کرتا ہے۔ انہیں روزانہ تازہ گوشت ملتا ہے۔ ان کے حصے میں مچھلی، تازہ سبزیاں اور اعلیٰ قسم کی دودھ کا (شراب) آتی ہے۔ اساتذہ کو کیا ملتا ہے، ان کی بچی ہوئی تلچھٹ! امیر اور غریب کے درمیان فرق ہماری ایک معلمہ نے واضح کیا۔ جب اس کی معصوم بچی نے اس سے پوچھا کہ اعلیٰ افسروں اور ہمارے درمیان کیا فرق ہے تو ماں نے اسے بتایا :

”بیٹی اعلیٰ افسر وہ ہوتے ہیں جنہیں سال بھر مٹاڑ کھانے کو ملتے ہیں، لیکن ہم لوگ صرف گرمیوں کے موسم میں اس نعمت سے مستفید ہوتے ہیں۔“

### مراعات یافتہ طبقہ

مراعات یافتہ طبقے کے لیے خصوصی سٹور ————— بنائے گئے ہیں جن میں اعلیٰ قسم کا غیر ملکی کپڑا اور سامان آرٹس ملتا ہے۔ فرانس کے پرفیومز، جاپانی ٹیپ ریکارڈز، جرمنی کے بنے ہوئے ٹرانزسٹرز، سکاٹ لینڈ کی وسکی اور امریکی سگریٹ نہایت سستے داموں وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ عام آدمی ان چیزوں کے حصول کے صرف خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔



مراعات یافتہ طبقے میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق موجود ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی شعبے کے اعلیٰ عہدیداروں، پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے مقتدر ممبروں، وزراء، پولٹ بیورو کے اراکین اور ان کے اہل خانہ کو مفت کوپنوں کے ذریعے اشیائے ضرورت کا مخصوص کوٹا ملتا ہے۔ ان لوگوں سے ان چیزوں کی قیمت نہیں لی جاتی۔ دوسرے درجے میں مسلح افواج کے اعلیٰ افسر، کوہ پیماء، فضائی علوم کے ماہر اور لینن پرائز یافتہ مصنفین آتے ہیں۔ انہیں بھی اعلیٰ معیار کی چیزیں برائے نام قیمت پر دی جاتی ہیں۔

اس کے بعد اخبارات کے ایڈیٹروں اور سٹیج کے فنکاروں اور مختلف اداروں کے اعلیٰ عہدیداروں کا درجہ آتا ہے۔ ان لوگوں کو مختلف کارناموں کے بدلے میں مالی انعامات دیئے جاتے ہیں۔ ایسے انعامات وہ مختلف قسم کے کارڈوں اور کوپنوں کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ "انعامات" کا تعین عہدیداروں کے مقام اور مرتبے کے مطابق کیا جاتا ہے۔ عام لوگ مراعات یافتہ طبقوں کو حاصل مراعات اور انعامات کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ انہیں تو بس اتنا معلوم ہے کہ اعلیٰ طبقوں کے لوگ "بورژوائی" زندگی بسر کر رہے ہیں۔

### کلاس فیلو کی شادی میں شرکت

ہمارے ایک کلاس فیلو سر یوٹرا کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کی منگیتر لیدا بھی ہماری سہم جماعت تھی۔ سر یوٹرا کے والد شہر کے ایک بڑے کارخانے کے انتظامی سربراہ تھے۔ شادی کے انتظامات شہر کے ایک معروف ہوٹل میں کیے گئے تھے، لیکن دولہا کے دوستوں اور خاص رشتہ داروں کو گھر پر خصوصی دعوت دی گئی۔ ہمیں ہاسٹل سے بڑی کاروں میں لے جایا گیا۔ گھر کے وسیع مہمان خانے میں شاندار ضیافت کی گئی۔ کوئی پچاس کے قریب افراد ہوں گے۔ وسیع و عریض میزیں مشروبات، ماکولا سے بھری ہوئی تھیں۔ ماسکو کی ووڈ کا اور امریکی و سکی پہلو بہ پہلو موجود تھی۔ انواع



واقسام کے پھل اور کھانے اس کے علاوہ تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے زندگی میں پہلی بار اتنی بڑے تکلف ضیافت دیکھی تھی۔ مہمان خانے کا فرنیچر اور دوسری اشیاء اتنی قیمتی تھیں کہ یہ کسی کیونسٹ افسر کا گھر معلوم نہ ہوتا تھا، کسی شہزادے کا محل نظر آتا تھا۔

تقریب کے آغاز میں سر یوٹرا کے باپ نے رسمی کلمات کہے۔ شراب کا سنہری پیالہ اٹھا کر اس نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا :  
 ”مجھے شرمندگی ہے کہ میں آپ کے شایان شان استقبال نہ کر سکا۔  
 سر یوٹرا ایک محنت کش خاندان کا لڑکا ہے، اس لیے آپ کو اس تقریب میں زیادہ شاندار چیزیں نہ ملیں گی۔“

دوپہر کے کھانے کے بعد مہمانوں کو شہر سے تین چار کلومیٹر دور، واپچائے جایا گیا۔ یہ واپچا تقریباً ڈیڑھ ایکڑ زمین پر بنایا گیا تھا۔ عمارت آراستہ و پیراستہ کمروں اور ایک تہہ خانے پر مشتمل تھی۔ باہر خوبصورت باغیچے میں لہلہاتے پھول، سیب، ناشپاتی اور دوسرے پھلوں کے درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ تھوڑی سی زمین میں مختلف قسم کی سبزیوں کا کافی کٹی تھیں۔ تھوڑی دیر کے لیے واپچے میں سیر و تفریح کے بعد ہمیں عمومی تقریب میں شرکت کے لیے ہوٹل لے جایا گیا۔ ہوٹل میں سینکڑوں افراد کا اجتماع تھا۔ یونیورسٹی اساتذہ کے علاوہ شہر کے سرکردہ افراد موجود تھے۔ ہوٹل میں بھی نہایت اعلیٰ انتظام کیا گیا تھا۔ قسما قسم کھانے، رنگارنگ مٹھائیاں اور قیمتی شرابیں موجود تھیں۔ سر یوٹرا کے والد کے رسمی کلمات ادا کرتے ہی برتن کھنکھانے لگے۔

کھانے کے بعد محفل رقص برپا ہوئی۔ ہوٹل کے وسیع ہال کے چمکیلے فرش پر سینکڑوں مرد اور عورتیں تھرکنے لگے اور آرکسٹرا پر شادی کی دھنیں بجائی گئیں۔

۱۔ شہروں کے باہر روس کے اُمراء ایسی عشرت گاہیں بنواتے ہیں جہاں وہ فرصت کے اوقات گزار سکیں۔ ان عشرت گاہوں کو ”واچا“ کہا جاتا ہے۔



رقص و سرود کے یہ ہنگامے روس میں ہر خوشی کے موقعے کا لازمی حصہ ہیں۔ میں اپنے ایک استاد کے ہمراہ بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ میں بھی دوسروں کی طرح کسی 'ساتھی' کو چن کر رقص میں شرکت کروں، مگر میرے لیے یہ ایک غیر دلچسپ نظارہ تھا۔ میں اس تہذیب کا فرد تھا جہاں عورت ماں ہے، بہن ہے اور بیوی ہے، رقص کی ساتھی نہیں ہے۔

مختل رقص کے اختتام پر مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور ایک صاحب نے کھڑے ہو کر سر یوٹرا اور اس کے والد کو کامیاب شادی پر مبارکباد پیش کی۔ یہ صاحب اسی کارخانے کے کارکن تھے جہاں سر یوٹرا کے والد جنرل مینجر کے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے کارخانے کے سربراہ کی توصیف کرتے ہوئے کہا:

”اس تقریب کے انعقاد سے روسی معاشرے کے بلند معیار زندگی کا

بخوبی اندازہ ہوتا ہے جو لوگ محنت کرتے ہیں ان کے بچے نہ صرف ناز

و نعم سے پرورش پاتے ہیں، بلکہ ان کی ازدواجی زندگی بھی پرمست ہوتی

ہے۔“

### جمعہ گل کی شادی

یہ تو تھا اعلیٰ طبقے کے ایک فرد کی شادی کا منظر اور اب غریب طبقے کے ایک نوجوان کی شادی کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجئے۔ ہمارا ایک ہم جماعت جو ماکلو فے (جمعہ گل) نسلاً قازق تھا، دنسک میں رہتا تھا۔ اس کی شادی میں کل پانچ افراد شریک تھے۔ ان میں تین مقامی آدمیوں کے علاوہ ہم دو غیر ملکی بھی تھے۔ جمعہ گل کی شادی سر یوٹرا کی شادی سے کچھ ہی روز بعد میں ہوئی۔ شادی میں شریک ہونے سے پہلے ہمارے ایک دوست نے ہمیں بتایا کہ جمعہ گل ایک غریب لڑکا ہے اس لیے ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے، چنانچہ ہم سب دوستوں نے تھوڑا تھوڑا چندہ جمع کیا اور شادی میں شریک ہونے سے پہلے کچھ ضروری اشیاء خرید لیں۔ ان چیزوں میں مچھلی کا ایک



ڈوبہ، بھنا ہوا گوشت اور کچھ مشروبات شامل تھے۔ ہم جمعہ گل کے گھر بیچے، تو اس نے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ شادی کی یہ تقریب صرف ایک گھنٹے میں اختتام پذیر ہو گئی۔ جمعہ گل کی بیوی روسی تھی اور ایک مقامی سٹور میں ملازم تھی۔

جمعہ گل نے بعد میں مجھے بتایا کہ یہ شادی اس نے مجبور ہو کر کی ہے۔ اس نے کہا، میں مسلمان ہوں اور ہم غیر مسلم لڑکیوں سے شادی کرنا پسند نہیں کرتے، لیکن چونکہ میں بے حد غریب والدین کا بیٹا ہوں اور اپنے تعلیمی اخراجات کے لیے مجھے پیسوں کی ضرورت تھی اس لیے میں نے اس لڑکی کو تلاش کر کے اس سے شادی کر لی۔ وہ خود بھی کسی اچھے بڑ کی تلاش میں تھی۔ اس طرح ہماری شادی ایک طرح کا سمجھوتہ ہے۔

### امیروں کے روبل بھی الگ ہیں

روس کے مختلف شہروں میں "برڈز کا" کہلانے والے ایسے سٹور بنائے گئے ہیں جو اعلیٰ طبقے کے لوگوں کیلئے مخصوص ہیں۔ صرف ماسکو شہر میں ایسے سٹورز کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔ برڈز کا میں مراعات یافتہ لوگ ہی جاسکتے ہیں، عوام کو وہاں جانے کی اجازت نہیں۔ نہ وہ ان سٹوروں سے کچھ خرید کر لاسکتے ہیں۔ اس لیے کہ وہاں عام سکہ نہیں چلتا، مخصوص سکہ ہی کام آسکتا ہے۔ عوام کے روبل یہاں کھوٹا سکہ شمار ہوتے ہیں۔ ان سٹوروں پر طلائی روبل چلتے ہیں۔ ایسے طلائی روبل اعلیٰ احکام ڈپو میٹس، صحافیوں، شاعروں، ادیبوں اور بلند منصب افسروں کے پاس ہی ہوتے ہیں۔

برڈز کا میں دنیا کی ہر چیز مل سکتی ہے۔ اس لیے بہت سے لوگ طلائی روبل کے حصول کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ وہ بازار میں نہ ملنے والی چیزیں بھی خرید سکیں۔ بلیک مارکیٹ میں طلائی روبل تو مل جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی کہ آدمی اس کے ذریعے برڈز کا میں داخل ہو کر مطلوبہ چیز خرید سکے گا۔ اس لیے کہ برڈز کا میں داخلے کے لیے خصوصی اجازت ناموں کی ضرورت بھی پڑتی



ہے۔ مجھے کئی طلبہ نے طلائی روپل دکھائے، مگر ان کا کہنا تھا وہ اس کے باوجود دروازے میں نہیں جاسکتے۔ کئی لڑکے اس موضوع پر اپنے غم و غصے کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ اپنے ملک میں دوسرے درجے کے شہری ہیں اور یہ کہ روس میں آزادی اور مساوات کا نعرہ محض ڈھونگ ہے۔

غیر ملکیتوں کو خصوصی سٹوروں پر خریداری کی سہولت حاصل ہے۔ وہ مختلف اشیاء کی قیمت ڈالر میں ادا کر سکتے ہیں۔ اس لیے مقامی لوگ غیر ملکی سیاحوں اور طلبہ کے ساتھ حفیہ روابط استوار کر لیتے ہیں، تاکہ ان کے ذریعے خصوصی سٹوروں پر بکنے والی اعلیٰ معیار کی چیزیں خرید سکیں۔ اس ضمن میں ایک مشکل ڈالر کے حصول کے سلسلے میں پیش آتی ہے۔ بلیک مارکیٹ میں ڈالر کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ ایک سو روپل کے صرف بیس ڈالر ملتے ہیں۔ اس طرح اگر کوئی روسی کسی غیر ملکی کے ذریعے کوئی چیز خریدتا ہے تو اسے کئی گنا زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

### کنبہ پروری

یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ روس میں اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کے لیے بنیادی شرط رسوخ اور سفارش ہے۔ ذہانت اور اہلیت کی بنیاد پر آدمی معمولی نوعیت کی ملازمت تو حاصل کر سکتا ہے، لیکن کلیدی عہدے تک صرف وہی پہنچ سکتا ہے جو کسی اعلیٰ عہدیدار کا بیٹا یا بھتیجا ہو۔ کیونسٹ پارٹی میں اہم پوزیشن رکھنے والا ہر شخص اپنے عزیز و اقارب کو اعلیٰ عہدوں کے لیے نامزد کر سکتا ہے۔ چونکہ ایسے لوگوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے اس لیے انہیں رتبے اور منصب کے تناسب سے سفارش کا حق دیا جاتا ہے۔ جو زیادہ اونچی کرسی پر فائز ہے وہ اپنے بیٹے کو اونچی کرسی تک پہنچا سکتا ہے۔ غریب کا بیٹا چاہے کتنا ہی اہل ہو، کارخانے کے مینجر اور اجتماعی فارم کے سربراہ کے عہدے سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

تقرر کی طرح برطرفی اور ترقی کی طرح تنزلی کا بھی کوئی متعین اصول نہیں ہے۔



آن کی آن میں کوئی شخص سطح زمین سے اٹھا کر آسمان کی رفعتوں تک پہنچا دیا جاتا ہے اور کسی دوسرے کو بلند یوں سے پتییوں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق اگر کوئی چیز کسی کو روس میں ترقی دلا سکتی ہے، تو وہ خوشامد اور موقع شناسی ہے۔ ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم کر لینا، اپنے سے بڑوں کی ہر جائزہ اور ناجائز بات کی توصیف کرنا اور اپنی کوئی رائے نہ رکھنا ایسی ”خوبیاں“ ہیں جن کے بل پر معمولی اہلکار اعلیٰ عہدوں پر جا پہنچتے ہیں۔

روس میں تنقید و محاسبے کی روایت موجود ہی نہیں۔ اختلاف رائے کو ”بوزردائی“ قرار دے کر ملک سے نکال دیا گیا ہے۔ اگر کوئی اس کی جسارت کر بیٹھے، تو اچانک برطرنی یا تنزلی سے دوچار ہو سکتا ہے۔ تنزلی کا نذر نامہ عام طور پر ان لوگوں پر گرتا ہے جن کا کیونسٹ پارٹی میں رسوخ نہیں ہوتا یا وہ خود کیونسٹ پارٹی کے رکن نہیں ہوتے۔ اسی لیے عام لوگ سرکاری ملازمت کے حصول سے پہلے کیونسٹ پارٹی کی رکنیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونسٹ پارٹی کا رکن ہونا اتلیار اور عزت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اعلیٰ طبقے میں شمار ہونے کے لیے کیونسٹ پارٹی کی رکنیت حاصل کرنا ضروری ہے؛ چنانچہ بعض ایسے لوگ جو اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کے باوجود کمتر خیال کیے جاتے ہیں، محض اس لیے کہ وہ کیونسٹ پارٹی کے رکن نہیں ہوتے۔ انہیں وہ مراعات حاصل نہیں ہوتیں جو ان کے ہم مرتبہ کیونسٹ افسروں کو حاصل ہوتی ہیں۔

### لودا سے لودمیلا تک

ایک روز میں ایک پارٹی میں بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان لڑکی میرے پاس پنج پر آکر بیٹھ گئی اور مجھ سے تعارف کی خواہاں ہوئی۔ میں نے اس سے مختصر بات کر کے پیچھا چھڑانا چاہا، مگر وہ گلے ہی پڑ گئی۔ لڑکی کا نام لودا تھا۔ وہ ایک مقامی رستورن میں برتن دھوتی تھی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد لودا نے اظہارِ مدعا یوں کیا کہ وہ



شادی کے لیے کسی موزوں نوجوان کی تلاش میں ہے اور اگر میں اس سے شادی کرنا پسند کروں، تو اسے بے حد خوشی ہوگی۔ میں نے بڑی عاجزی سے اس کی خواہش پوری کرنے سے معذرت کی۔

اس کے بعد کئی بار لودا نے مجھ سے ملنے کی کوشش کی اور مجھے مسلسل پریشان کر رہی۔ بازار میں، پارک میں اور کبھی اچانک رستے میں ملتی اور گھنٹوں پچھپا نہ چھوڑتی۔ کئی بار وہ میرے ہاسٹل بھی آئی، لیکن میں نے ہر بار اسے مایوس کر کے ٹوڑا دیا۔ اس کے بعد لودا سے خاصی مدت تک ملاقات نہ ہوئی اور میں اسے تقریباً بھول ہی گیا تھا کہ اچانک کسی تقریب میں دکھائی دی۔ کچھ عرصہ پہلے اور اب کی لودا میں زمین و آسمان کا فرق آچکا تھا۔ وہ نہایت خوبصورت زرق برق لباس پہنے ہوئے تھی اس کا چہرہ مہرہ اور انداز و اطوار پوری طرح تبدیل ہو چکے تھے۔ اس نے مجھے دیکھا تو تیر کی طرح میری طرف آئی۔ میں نے پوچھا: ”لودا، آج کل تم کہاں کام کرتی ہو؟“

اس نے فخریہ انداز میں بتایا: ”میں لودا نہیں لودمیلا ایگزیکٹو ٹرہ ہوں۔ اب میں دو سال پہلے کی برتن صاف کرنے والی لڑکی نہیں، بلکہ ریسٹوران کی مینجر ہوں۔“

مجھے اس پر حیرت تھی کہ دو برس میں لودا، لودمیلا ایگزیکٹو ٹرہ اور برتن صاف کرنے والی لڑکی کیفے کی مینجر کیسے بن گئی! اس نے یہ کہہ کر میری حیرت رفع کر دی: ”میں نے کیونسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کر لی ہے۔ اب میں آزادی سے چل پھر سکتی ہوں معاشرے میں تمہاری طرح میری بھی عزت ہے، وقار ہے۔ اب بتاؤ کرتے ہو میرے ساتھ دوستی؟“

میں اس کی بات پر ہنسنا اور اسے یوں جواب دیا: ”اب تو ہماری دوستی اور بھی مشکل ہو گئی ہے کہ تم کیونسٹ بن چکی ہو اور میں مسلمان ہوں۔“

میری بات سے وہ ذرا خفا نہ ہوئی۔ بدستور اپنائیت کا اظہار کرتی رہی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ میزوں سے چھوٹے برتن جمع کر کے دھویا کرتی تھی تو اسے صرف ۶۰ روپے ملتے تھے اور اس کی کوئی عزت نہ تھی۔ ایک دوست نے اس کی مدد کی اور



وہ کیونٹ پارٹی کی رکن بن گئی اور دوسرے ہی روز وہ رستوران کی مینجر بنا دی گئی۔ اب اسے ۲۵۰ روپل ماہانہ تنخواہ ملتی ہے اور کام بھی برائے نام لیا جاتا ہے۔  
 ”لو دیلا ایگزٹر نے مجھے ایک بار پھر شادی کی پیش کش کرتے ہوئے

کہا :  
 ”مجھے رہائش کے لیے اچھی جگہ ملی ہوئی ہے۔ اگر تم مجھے اپنی شریک جیتا بناؤ، تو شاندار مکان مل جائے گا۔“

میں نے اسے نئی ملازمت پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے دین میں کسی دوسرے نظریے کے پیروکاروں کے ساتھ چلنا ممکن نہیں۔ لو دیلا نے کہا وہ کیونٹ کو دل سے نہیں، مجبوراً اپنا لئے ہوئے ہے اور یہ کہ اس کی طرح ہزاروں لوگ ایسے ہی جو ملحد نہ ہونے کے باوجود کیونٹ پارٹی کے رکن بنے ہوئے ہیں۔ اس کی یہ بات درست تھی۔ میں ایسے نام نہاد کیونٹوں سے پہلے بھی مل چکا تھا، جن کے دلوں پر مذہب کی چھاپ بہت گہری تھی، لیکن جو مادی منفعت کی خاطر اشتراکیت کا کلمہ پڑھتے تھے۔

### کیونٹ بھی، مسلمان بھی

ایک مرتبہ جب مجھے علاج کے لیے قفقاز میں گاریبا گلوچ کے سینٹی ٹوریم بھیجا گیا تو میری دو ایسے افراد سے ملاقات ہوئی جو مسلم علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے آپ کو مسلمان بتاتے تھے۔ ایک ازبک تھا دوسرا تاجک۔ ازبک کا نام رشیدوف اور تاجک کا نام احمدوف تھا۔ یہ دونوں بھی میری طرح علاج کی غرض سے گاریبا گلوچ آئے ہوئے تھے۔ احمدوف کا دایاں ہاتھ حادثے میں کٹ گیا تھا اور وہ بہرا بھی ہو چکا تھا، کیونٹ پارٹی کا رکن تھا۔ اس کا ازبک ہمراہی رشیدوف کیونٹ تھا، مگر دونوں اسلام سے وفاداری کا دم بھرتے تھے۔  
 میں نے کیونٹ احمدوف سے پوچھا : ”یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص بیک



وقت مسلمان بھی ہو اور کیونسٹ بھی؟

اس نے عجیب جواب دیا: ”ہمارے لیے یہ بات عین ممکن ہے۔ اس لیے کہ تاجکستان اور دوسری مسلم ریاستوں کے اکثر مسلمان دل سے اسلام پر قائم ہیں لیکن ظاہری طور پر کمیونسٹزم کو بھی اپنائے ہوتے ہیں۔“

اپنے کیونسٹ بننے کا حال اس نے یوں بتایا کہ کارخانے میں کام کرتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ کٹ گیا۔ اس کے کندھوں پر نو پنجوں اور ایک بیوی کی پرورش کی ذمہ داری تھی۔ بیوی کام نہیں کر سکتی اور بچے چھوٹے تھے۔ اس کا معذور وجود گیارہ افراد کے کنبے کا بوجھ نہ اٹھا سکتا تھا۔ اگر وہ کمیونسٹ پارٹی کا رکن نہ بنتا تو اس کا خاندان فاقوں سے دوچار ہوتا۔ کمیونسٹ بننے کی وجہ سے اسے کارخانہ پنشن دیتا ہے جس سے اس کی گزراوقات بخوبی ہو جاتی ہے۔ اس نے بتایا کہ جو مسلمان کمیونسٹ پارٹی میں شامل نہیں ہوتے ان کا جینا حرام کر دیا جاتا ہے، اس لیے وہ ظاہری طور پر کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کر لیتے ہیں، لیکن عقیدہ تو دل کی خوشی کا نام ہے۔ کسی کو زبردستی کافر تو نہیں بنایا جاسکتا۔

### پارٹی میں داخلہ آسان نہیں

اس کمیونسٹ مسلمان کی بات کسی حد تک درست تھی، لیکن کمیونسٹ پارٹی کا رکن بننا آسان کام نہیں۔ اس اعزاز کے حصول کے لیے خصوصی مہارت، اپروچ اور کمیونسٹ دوستوں کی خوشنودی کی ضرورت پڑتی ہے۔ عملاً ثابت کرنا پڑتا ہے کہ رکنیت کا خواہشمند مذہب کا دشمن ہے۔ اپنے آپ کو فرمانبردار اور خوشامد کے فن میں طاق بنانا پڑتا ہے اور جب کوئی شخص کمیونسٹ پارٹی کا رکن بن جائے تو اس کی گلو خلاصی ممکن نہیں رہتی۔ رکن بننے کے بعد پارٹی کی وفاداری ہر عقیدے سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس پر پورا نہ اتر سکے، تو اسے نہ صرف پارٹی میں اپنے استحقاق سے محروم ہونا پڑتا ہے، بلکہ بعض اوقات زندگی سے بھی ہاتھ دھوئے پڑتے ہیں۔



کیونست پارٹی کے کئی لوگوں سے میری ملاقات ہوئی۔ ان کے ظاہری اطوار پارٹی کی وفاداری ظاہر کرتے تھے، لیکن اندر سے وہ مختلف تھے۔ پارٹی میں پہنچ کر مزے میں وہ رہتا ہے جو اپنے دل و دماغ کی بات پر نہ چلے اور اپنے کانوں اور زبان پر تالے لگالے۔ پارٹی کی ہر پالیسی پر آنکھیں بند کر کے سر ہلا دینا ہر کامیاب کیونست کا شیوہ ہوتا ہے۔ ضمیر کو سلا دینے والے عیش کرتے ہیں اور جن بے صبروں سے کبھی ضمیر کی آواز پر سراٹھانے کی حرکت سرزد ہو جاتی ہے، ان کو سائبیریا کی تخیلستہ دوزخ میں دھکیل دیا جاتا ہے جہاں وہ زندگی کے باقی دن وہ یونٹیم کی کانوں میں کھلٹی کرتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔

### کے جی بی کے ایجنٹ

آگے بڑھنے اور مراعات حاصل کرنے کا دوسرا راستہ یہ ہے کہ آدمی روس کے جاسوسی ادارے کے جی بی سے منسلک ہو جائے۔ اس ادارے سے منسلک ہونے والے شخص کو بھی شخصی آزادی اور عقیدے کی قربانی دینی پڑتی ہے، لیکن اس کے بدلے وہ اپنی جان و مال کے لیے تحفظ حاصل کر لیتا ہے۔ بہت سے مسلمان یہ سوچ کر اس ادارے سے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ کوئی شخص ان کی جان و مال سے تعرض نہ کرے۔

جو لوگ کیونست پارٹی میں شمولیت اختیار کرتے ہیں نہ کے جی بی کے رکوع بنتے ہیں وہ روس کے مشکوک شہری قرار پاتے ہیں، خاص کر جب کہ وہ مسلمان بھی ہوں تو انہیں ملک دشمن سمجھا جاتا ہے۔ ایسے لوگ گویا شیر کے کپھار میں رہتے ہیں، ہر وقت جان کے خطرے سے دوچار۔ پھر بھی آخرین ہے ان لاکھوں مسلمانوں کو جو اس عالم میں بھی اسلام کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

سینی ٹوریم میں مجھے احمد دف نے بتایا کہ جو لوگ کے جی بی سے وابستہ ہو جاتے ہیں انہیں ایسی تربیت دی جاتی ہے کہ انسانی عظمت و شرافت کا تصور ان کے لیے



بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے وہ ایسی سرگرمیاں دکھاتے ہیں کہ انسانیت انگشت بندہاں رہ جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنے ماں باپ کی جاسوسی کرنے سے بھی نہیں شرماتے۔

عبادت گزار مسلمانوں کو تلاش کرنے کے لیے مسلمانوں کو آلہ کار بنایا جاتا ہے۔ ضعیف الایمان مسلمانوں کو اپنے ہم عقیدہ لوگوں کی جاسوسی کے بدلے میں بڑی بڑی مراعات دی جاتی ہیں۔ کے جی بی کا نظام ایسا خفیہ ہے کہ کسی کو معلوم نہیں ہو پاتا کہ کون اس ادارے کا کارندہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روسی معاشرے میں ماں باپ اپنے بچوں سے بھی اپنے راز چھپاتے ہیں۔ معاشرے میں افراد کا اعتماد ایک دوسرے پر ختم ہو چکا ہے۔

### خفیہ نمازیں

روس جانے کے بعد میں ہمیشہ آزادی سے نماز ادا کرتا رہا، لیکن جتنے روز میں قفقاز کے سینی ٹوریم میں رہا، اپنے مسلمان دوستوں کی خاطر قریبی جنگل میں جا کر خفیہ طور پر نماز پڑھتا رہا، تاکہ میرا عبادت کرنا اور ان کے ساتھ ملنا انتظامیہ کو شک میں مبتلا نہ کر دے۔ بعض اوقات وہ بھی گھومنے کے بہانے میرے ساتھ چلے جاتے اور کسی جھاڑی یا درختوں کے جھنڈ میں میرے ساتھ باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔ نماز کے بعد ان کے چہروں پر مسرت و انبساط چھا جاتی اور ہم تینوں دیرانے میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔

وہ دونوں مسلم ریاستوں میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں بہت تشویش میں مبتلا تھے۔ کہتے تھے موجودہ نسل کمیونسٹ انقلاب کے بعد پیدا ہوئی اور کمیونزم کے سائے میں پروان چڑھی ہے۔ ان کے ذہنوں سے اسلام کو اس طرح کھرچا گیا ہے کہ ان سے اسلام کے لیے کسی خیر خواہی کی توقع مشکل ہے۔ عربی رسم الخط پر پابندی لگنے سے اسلامی کتابوں اور قرآن پاک سے استفادہ



کرنے کی صورت خود بخود ختم ہو گئی ہے۔ اسلام کی تعلیم دینا جرم ہے۔ ایک بات پر وہ دونوں متفق تھے کہ جو لوگ اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور جن کا عمل اسلام کے خلاف ہے، وہ بھی اسلام کے نام پر جان دیتے ہیں۔ یہ اسلام کا زندہ معجزہ ہے کہ ظاہراً جو لوگ کمیونزم کے شیدائی ہیں وہ بھی دل میں اسلام سے عقیدت رکھتے ہیں۔

ایک روز میرے تاجک دوست احمدوف نے بڑی افسردگی سے کہا: ”ملت اسلامیہ نے ہمیں بھلا دیا ہے اور روسی حکومت پوری طاقت سے ہمیں اشتراکی نظام میں جذب کر دینا چاہتی ہے۔ وہ ہمیں ہمارے درخشاں ماضی سے کاٹ دینا چاہتی ہے کہ ہم امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ اور نظامیؒ جیسے گنج ہائے گراں مایہ کو بھول جائیں جو ہماری خاک سے اٹھے تھے۔“

میں نے ایک موقع پر جب احمدوف کو ٹوکا کہ وہ شکایت ہم سے کیوں کرتے ہیں جب کہ خود انہوں نے روسیوں کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ کم از کم روسی تو یہی کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی پُروردعوت پر آئے اور انہیں ظالم حکمرانوں سے نجات دلائی، تو انہوں نے کہا:

”یہ بات ایسی ہی ہے کہ جیسے آج وہ پاکستان، ایران یا افغانستان پر حملہ کر دیں اور کل ان ممالک پر قبضہ کر کے کہہ دیں کہ ہمیں وہاں کے عوام نے آنے کی دعوت دی تھی۔“

### بھٹیر یا انسان نہیں بن سکتا

ایک دن احمدوف نے ایک ایسی بات کہی جو اُس وقت (۱۹۷۴ء) میری سمجھ میں نہ آ سکی تھی، لیکن ۱۹۷۹ء میں جب روس نے افغانستان پر قبضہ کر لیا تو مجھے وہ بات یاد آئی جو گاریاچی گلوچ سینی ٹوریم میں اس تاجک بھائی کے منہ سے نکلی تھی۔ اس نے کہا تھا:



”افغانستان نے وسط ایشیا کے مسلمانوں کے انجام سے عبرت حاصل نہیں کی۔ روس آپ کے ملک میں بڑے بڑے کارخانے تعمیر کر رہا ہے اور چوڑی چوڑی سڑکیں بنوا رہا ہے، تو آخر کس لیے؟ اور یہاں تک کہہ کر اُس نے یہ شعر پڑھا تھا۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود  
گرچہ با آدمی نہرگ شود

اس نے اپنے ملک پر روسی طوفان آنے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا: ”میں اُس وقت بہت چھوٹا تھا۔ ہمارے بزرگوں پر جو گزری اس کا تذکرہ ہی سنا ہے۔ وہ روسی مظالم یاد کر کے رو دیا کرتے تھے کوئی گھرا یا نہ تھا جس کا کوئی نہ کوئی فرد شہید یا لاپتہ نہ ہو گیا۔ روسی گلی کوچوں کے اندر گھس گئے تھے۔ جو بھی نظر آتا قتل کر دیا۔

اس بربریت کے خلاف ماسکو میں بھی آوازیں بلند ہوئیں، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ لوگوں نے اپنے ہاتھوں اپنی بیٹیوں کے گلے گھونٹ دیئے۔ اپنی کھڑی فصیلیں جلا دیں اور ہتھیار لے کر جنگلوں میں چلے گئے۔ وہاں کمیونسٹوں کے خلاف مسلح مزاحمت شروع کی جو بسماچی تحریک کے نام سے خاصا عرصہ جاری رہی۔ یہ مجاہدین آخری سانس تک لڑتے رہے، لیکن ۱۹۳۲ء میں کمیونسٹوں نے مخالفت کا مکمل خاتمہ کر دیا۔“

تاجک مسلمان نے بتایا کہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد روس نے لوگوں کو تاجک، ازبک اور ترکمان کے نام سے مختلف قومیتوں میں بانٹ دیا۔ مختلف قبائل کو ایک دوسرے کے خلاف اکسایا اور نفرت کے بیج بوئے۔ مدارس اور مساجد کو

بھیڑ یا آدمی کے ہمراہ رہ کر کتنا ہی نیک نیت ہو جائے، انجام کار اس کا بھیڑ یا اپن ظاہر ہو کر رہتا ہے۔



سما کر کے ان کی جگہ کلب اور تھیٹر تعمیر کر دیئے۔ عربی رسم الخط کو ختم کر کے روسی رسم الخط رائج کر دیا۔ اس طرح مسلمان تہذیب اپنے ملی تشخص سے محروم ہوتے چلے گئے اور اسلامی تہذیب کے کھنڈرات پر روسی تہذیب کی بنیاد اٹھانی لگی۔

### امیروں کے چو نچلے

اوپر ہم نے روس کے اعلیٰ طبقے کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بتانا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ اعلیٰ طبقے کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک خاص علامت موٹر کار ہے۔ کرملین کے محلات میں رہنے والوں کی مخصوص کاریں ملک کا کوئی عام شہری استعمال کرنے، بلکہ چھوٹے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ان خاص قسم کی کاروں کو زریں کہا جاتا ہے۔ ایسی گاڑیاں اوپر کے گنتی کے چند افراد کے پاس ہی ہوتی ہیں۔ ان گاڑیوں کے شیشے گہرے رنگ کے وینز پر دوں سے ڈھکے جاتے ہیں، تاکہ ان میں بیٹھنے والوں کی صورت بھی عام لوگ نہ دیکھ سکیں۔ جس وقت یہ گاڑیاں سڑکوں پر نکلتی ہیں، ٹریفک خود بخود رک جاتی ہے، تاکہ کرملین کے اکابرین بلا توقف اپنی منزل پر پہنچ سکیں۔ زریں گاڑیوں کی قیمت لاکھوں روپل ہوتی ہے۔ بعض لیڈروں کے گھروں میں ایسی کئی کئی کاریں ہیں جن میں ان کے بچے اور اہل خاندان سفر کرتے ہیں۔ ایسی کار خریدنے کی استطاعت کسی دوسرے فرد کو نہیں، نہ ایسی گاڑیاں کسی دوسرے کو رکھنے کی اجازت ہے۔

دوسرے درجے کے روسی لیڈر اور اعلیٰ حکام کو "چایکا" نامی کاریں فراہم کی گئی ہیں۔ ان کاروں کی شان و شوکت زریں سے کم ہوتی ہے۔ اعلیٰ فوجی جرنیل اور سرکاری افسران کاروں کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں۔

روسی "بڑوں" کے لیے ماسکو کے مضافات میں پُر فضا مقامات پر محفوظ تفریح گاہیں تعمیر کی گئی ہیں۔ ایسی تفریح گاہوں کو روسی زبان میں "واچا" کہا جاتا ہے۔ ہر "واچا" کئی ایکڑ زمین پر بنائی گئی ہے۔ بلند و بالا فصیلوں سے گھری ہوئی "واچاؤں" میں خوبصورت



باغات، رہائشی اپارٹمنٹ، رقص گاہیں، کھیل کے کورٹس اور میدان ہوتے ہیں۔ آسمان کی چھت کے نیچے جس آسائش اور عشرت کا تصور کیا جاسکتا ہے، وہ ان واپاروں میں میسر ہوتی ہے۔ سینکڑوں ملازم اور ملازمائیں یہاں ہر وقت موجود ہوتی ہیں۔ خور و نوش کے تمام سامان اور رقص و سرود کے سب وسائل مہیا کیے جاتے ہیں۔ ان عشرت کدوں کے باہر زبردست پہرہ رہتا ہے، تاکہ عوام کو کچھ معلوم نہ ہو سکے کہ ان کے قائدین اپنی خلوتوں میں کیا کرتے ہیں۔ ماسکو کے لوگ طنزاً ان واپاروں کو کیونزرم کے 'ماڈل' کہتے ہیں۔

### اعلیٰ طبقے کے لیے مراعات

روس کے مراعات یافتہ طبقے کو ہوٹلوں اور ہوائی جہازوں میں جگہ حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی، اس لیے کہ ہر جگہ ان کی نشستیں مخصوص ہوتی ہیں۔ سینما گھروں، رقص گاہوں اور تھیٹروں میں مخصوص نشستیں آخری وقت تک خالی رکھی جاتی ہیں۔ اگر کسی اہم شخصیت کے لیے طیارے، ہوٹل یا سینما میں جگہ خالی نہ ہے یا اعلیٰ طبقے کے زیادہ لوگ امیدوار ہوں، تو ضرورت کے مطابق نشستیں عام لوگوں سے خالی کرائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں اس بات کی کوئی پرہیز نہیں کی جاتی کہ اٹھایا جانے یا نکالا جانے والا کتنے ماہ سے اس نشست کا منتظر تھا۔ بعض اوقات بڑے بڑے افسر بھی نشانہ ستم بن جاتے ہیں۔ ان کی نشست کسی زیادہ بڑے افسر کے حوالے کر دی جاتی ہے اور وہ خاموشی سے واپس گھر چلے جاتے ہیں۔

عوام کا معاملہ یہ ہے کہ انہیں گھنٹوں قطاروں میں لگ کر اپنی نشستیں مخصوص کرانی پڑتی ہیں۔ طیارے میں ایک نشست کے لیے بعض اوقات کئی کئی روز قطار میں کھڑے رہتے ہیں۔ پھر نشست او۔ کے ہونے کے بعد بھی یقینی ہوتی ہے۔ ایئر فلوٹ کسی وقت بھی بغیر پیشگی اطلاع کے نشست منسوخ کر سکتی ہے۔ مغربی ممالک کی سیاحت کی تمنا ہر روسی شہری کے دل میں کر دہی لیتی ہے،



لیکن نہ تو ہر ایک کے پاس وسائل ہوتے ہیں، نہ سب کے لیے باہر کے ملکوں میں جانا آسان کام ہے۔ غیر ملکوں کی سیاحت کی اجازت حاصل کرنا نہایت ہی پیچیدہ عمل ہے۔ صرف مراعات یافتہ طبقے کے افراد ہی باہر جانے کی اجازت حاصل کر سکتے ہیں۔ انہیں مالی پریشانی بھی نہیں ہوتی۔ وہ آسانی سے غیر ممالک بھیجے جانے والے وفدوں میں شامل ہو جاتے ہیں، اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بہانے دنیا بھر میں گھوم آتے ہیں۔ کارل مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں یہ اعتراض کیا تھا کہ اس میں اقتصادی قوت اعلیٰ طبقے کے ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتی ہے اور عام لوگوں سے خواص کا فاصلہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ روس میں بظاہر سرمایہ داری کا دشمن نظام برسرِ اقتدار ہے، لیکن مارکس کی بات روس کے موجودہ حالات پر بہت صادق آتی ہے۔ سیاسی اقتدار اور اقتصادی قوت ایک طبقے کے ہاتھ میں ہے اور یہ طبقہ عوام سے بالکل الگ تھلگ زندگی گزار رہا ہے۔ روس کے اعلیٰ طبقے کے گھروں میں کیونزیم کی طرف کوئی میلان نہیں پایا جاتا۔ امراء کے بچے حد سے بڑھے ہوئے عیش و آرام کی وجہ سے ذہنی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کے قریب ہو رہے ہیں؛ چنانچہ مجھے اپنے کئی طلبہ ساتھیوں نے بتایا کہ کوسی گن کا داماد گویاشانی اور گرومیکو کا بیٹا اناطولی کیونزیم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود اقتدار ان کے پاس ہے اور مستقبل میں بھی ان کے پاس رہے گا۔ سرکاری حلقوں سے اس پریشانی کا بار بار ذکر ہو چکا ہے کہ انتظامی امور میں ایسے لوگ دخیل ہو رہے ہیں جو پارٹی سے وابستہ نہیں ہیں، مگر انہیں اس مداخلت سے روکا نہیں جاسکتا۔ اس لیے کہ اقتدار کی باگ ڈور ان کے اپنے والدین، بھائیوں اور چچاؤں کے ہاتھ میں ہے۔

### سیاست سے عوام کی عدم دلچسپی

عام روسی شہری سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس کی بنیادی وجہ تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ عوام کو سیاسی معاملات میں دخل دینے کا اذن نہیں، لیکن اس



کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ عوام کی سیاسی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ذرائع ابلاغ پروپیگنڈے سے آگے نہیں بڑھتے۔ میں نے جب کسی روسی طالب علم سے کسی سیاسی مسئلے پر بات کی، اسے سیاست پر معلومات سے کورا پایا۔ ان سے روس اور امریکہ کے درمیان آویزش کا ذکر کیا جاتا، تو وہ امریکی ملبوسات اور خوشبودوں کا ذکر کرنے لگتے۔ جب میں روسی لیڈروں کی سیاسی پالیسی پر ان کی رائے معلوم کرنا چاہتا تو وہ ایک آدھ مرتبہ ہوں ہاں کر کے ماسکو کے ادیرا ہاؤس کے فنکاروں کی بات چھیڑ دیتے تھے۔

روس کا عمر رسیدہ طبقہ موجودہ صورت حال سے خاصا مطمئن ہے۔ اس لیے کہ اس نے جنگ عظیم کی تباہ کاری اور اس کے بعد قحط کا بدترین زمانہ دیکھا ہے۔ ٹالین اور خروشچیف کے دور میں وہ غلے اور اشیائے ضرورت کی کمی سے دوچار رہے۔ خروشچیف کے بارے میں تو بتایا جاتا ہے کہ وہ دنیا کو یہ دکھانے کے لیے کہ روس گندم میں خود کفیل ہو چکا ہے، گندم کی ایک بڑی مقدار غیر ممالک کو برآمد کر دیتا تھا اور عوام ایک ایک دانے کے لیے ترستے تھے۔ برٹنئیف کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد حالات میں خاصی تبدیلی آئی۔ اندرون ملک غلہ اور روزمرہ اشیاء خصوصاً کپڑا لوگوں کو ملنے لگا۔ اس لیے ادھیڑ عمر کے لوگ اور بوڑھے اس بات کا عموماً تذکرے کرتے ہیں کہ نیا دوران کے لیے خوشحالی لے کر آیا ہے۔

### مغربی لباس کے دیوانے

مغربی لباس روسیوں کی عام کمزوری ہے۔ جس شخص کے جسم پر غیر ملکی لباس ہو، وہ معاشرے میں برتر حیثیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ چاہے اس کا لباس کتنا ہی بوسیدہ اور دقتیانوسی کیوں نہ ہو اور پہننے والا اسے نیلامی میں ہی خرید کر کیوں نہ لایا ہو۔ نوجوانوں میں یہ جنون زیادہ ہے۔ حد یہ ہے کہ کچھ روسی طلبہ غیر ملکی طلبہ سے پرانے امریکی کوٹوں اور تیلونوں پر لگے ہوئے لیبل اور شکر خرید لیتے ہیں تاکہ انہیں دیسی کپڑوں پر چپاں



کر کے امریکی بن سکیں۔ زیادہ فیشن زدہ کہلانے کے شوق میں لڑکے لڑکیوں کے کپڑے پہن لیتے ہیں۔ اکثر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایسی شوخ رنگوں والی بنیا نہیں بڑے شوق سے پہنتے ہیں جن پر یو ایس اے کھا ہو۔ اس ضمن میں اپنا ایک دلچسپ مشاہدہ پیش کرتا ہوں :

ایک روز شام کے وقت یونیورسٹی کے تدریسی بلاک کے سامنے میری نظر ایک نوجوان روسی پر پڑی جو سرتاپا امریکی لباس میں غرق تھا۔ آنکھوں پر سیاہ گالز چڑھائے اور جینز پہنے ہوئے وہ یوں اکڑ کر چل رہا تھا، جیسے پوری دنیا کو پاؤں تلے روند رہا ہو۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے جو بنیان زیب تن کر رکھی تھی، اس پر امریکہ کی ڈیموکریٹک پارٹی کا انتخابی نشان بنا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر سوائے زرد رنگ کے روسی بوٹوں کے ہر شے مغربی تھی۔ مجھے اس کے چلیے سے دلچسپی پیدا ہوئی، اس لیے اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے روسی زبان میں اس کی خیریت پوچھی تو اس نے انگریزی میں جواب دیا۔ اس کا جواب بھی سوال کی شکل ہی تھا :

("What do you Want?")

میں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی تو اس نے بھی دوبارہ "واٹ" کہا۔ میں نے کہا بھی روسی میں بات کرو! تو اس نے خالص روسی لہجے میں مزید انگریزی بولی :

(تم کیا چاہتے ہو؟)

اب میں نے بھی انگریزی میں اسے مخاطب کیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ تو اس نے اپنے سینے پر ہنکے ہوئے نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :

(امریکہ سے)

میں نے پوچھا : "اس نشان کو تم امریکی" کیا کہتے ہو؟ تو اس نے قدرے ہڑڑا کر کہا :



(روسی زبان میں اسے "زرک" کہتے ہیں)

مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کی انگریزی ختم ہو گئی ہے، پھر بھی میں نے چند مزید باتیں پوچھیں تو وہ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا اور انگریزی کی پٹری سے اتر کر روسی میں گفتگو کرنے لگا۔ وہ اپنے جھوٹ پر بہت شرمندہ تھا اس لیے میں نے اسے مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے اجازت چاہی۔

ایسے روسی نوجوانوں سے کئی بار میرا سامنا ہوا جو امریکی، فرانسیسی اور ایرانی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ روسی قومیت سے وابستگی پر شرم محسوس کرتے ہیں، بلکہ اصل وجہ غیر ملکی لباس سے والہانہ عشق ہے جس کے لیے وہ اپنی قومیت سے بھی ہاتھ دھونا گوارا کرتے ہیں۔

### نوجوان روسی کہلانے سے شرماتے ہیں

روسی شہری گرمیوں کے دن بحیرہ اسود کے پُر فضا ساحلوں پر گزارنا چاہتے ہیں۔ تفریحی چھٹیوں میں کسی ساحلی شہر میں چلے جاتے ہیں اور وہاں سمندر کے کنارے گھومنے پھرنے کے علاوہ غسل آفتابی سے بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ ہفتوں ننگے بدن دھوپ میں لیٹنے سے گورے جسم بھی سافو لے پڑ جاتے ہیں۔ اڈلیسہ میں میری ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہوئی جو اپنی رنگت سے روسی معلوم نہ ہوتا تھا۔ میں نے اسے غیر ملکی سمجھ کر بات کرنی چاہی، تو وہ روسی بولنے لگا۔ میں نے پوچھا کہ آیا وہ روسی ہے، تو اس نے بتایا کہ وہ مصر کا رہنے والا ہے۔ اس کے لہجے سے مجھے شبہ سا ہوا۔ حقیقت جاننے کے لیے میں نے کہا:

"پھر تو آپ مسلمان بھی ہوں گے؟"

اس کا جواب اثبات میں تھا۔ میں نے کہا، "تو پھر آپ میرے ساتھ عربی میں بات کیوں نہیں کرتے؟" یہ سننا تھا کہ وہ اٹھا اور اچانک سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ پھر جو اس نے تیز نا شروع کیا، تو شام تک ساحل پر نظر نہ آیا۔ عربی نہ جاننے کی کمزوری



نے اس کے جھوٹ سے پردہ اٹھا دیا۔

روسی فوجوانوں میں احساس کمتری بہت پایا جاتا ہے خصوصاً جب وہ غیر ملکی فلی میلوں میں جاتے اور غیر ملکی رسائل پڑھتے ہیں۔ غیر ملکی سیاحوں کے ملبوسات اور سامانِ تعیش دیکھ کر ان میں پس ماندگی اور غربت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اس احساس کو کم کرنے کے لیے وہ غیر ملکی لباس کی جستجو کرتے ہیں، تاکہ اس کو پہن کر ان کا احساس کمتری کچھ کم ہو سکے۔

### جب پھٹی ہوئی پتلون کی قسمت جاگی

ہمارے ایک افغان ساتھی مرزا محمد کے پاس ایک پرانی جینز تھی جو وہ کابل سے خرید کر لایا تھا۔ وہ فیلڈ ورک کے لیے جاتے وقت یہ پتلون پہن لیتا تھا۔ جن دنوں ہم کوٹلے کی کانوں میں کام کرتے، ہمارے کپڑوں کی حالت خراب ہو جاتی تھی۔ مرزا محمد کی پتلون جگہ جگہ سے پھٹ گئی تو اس نے رنگارنگ پیوند لگالے۔ ہم لوگ مذاق اڑایا کرتے تھے، مگر ایک روز اس کی پتلون کی قسمت چمک اٹھی۔

واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ ایک شام دو روسی لڑکیاں مجھے تلاش کرتی ہوئی میرے کمرے میں آئیں اور بڑے عاجزانہ لہجے میں کہنے لگیں کہ انہیں پتہ چلا ہے کہ میرے پاس جینز ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس ایسی کوئی پتلون نہیں تو انہوں نے کہا، اگر میرے کسی دوست کے پاس ہو، تو وہی دلا دوں۔ ان کے پیہم اصرار سے میں اتنا پریشان ہوا کہ انہیں ٹالنے کے لیے مرزا کے پاس چلا گیا کہ اس کی وہی جینز لے کر ان سے سچھا چھڑالوں۔ مرزا نے کہا: ”میرے پاس صرف ایک پتلون ہے جس کا تم لوگ روز مذاق اڑاتے ہو“ میں نے کہا: ”وہی وہ دو لڑکیوں کو ٹالنا تو جاسکے گا“

لڑکیوں نے اس بوسیدہ پتلون کو میرے ہاتھ سے اتنے احترام سے لیا گویا وہ کوئی بیش قیمت تحفہ ہو۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اطمینان سے سر ہلائے۔ گویا



کہہ رہی ہوں، ”کوئلے میں ڈوبی ہوئی تو ہے، مگر ہے تو خالص امریکی“ میں نے کہا،  
 ”میرے دوست کے پاس اس پتلون کے سوا کچھ نہ تھا، اگر آپ کو پسند آئے تو  
 لے جائیے“ انہوں نے نہ صرف پتلون کو پسند کیا، بلکہ اس کے دام بھی پوچھنے لگیں۔  
 میرا خیال تھا کہ اگر وہ اسے مفت لے کر بھی ٹل گئیں، تو خدا کا شکر ادا کروں گا،  
 لیکن جب وہ قیمت پوچھنے لگیں تو میں نے مذاقاً کہا :

”آپ شاید اسے خرید نہ سکیں، یہ نہایت اعلیٰ معیار کی چیز ہے“

وہ میرے مذاق کو سچ سمجھیں۔ ایک بار پھر پتلون کو اٹھایا اور الٹ پلٹ کر دکھایا۔

لیبل پر نظر پڑی تو مزید رعب پڑا۔ بولیں :

”ہے تو واقعی بہت قیمتی۔ پھر بھی اسے ہر قیمت پر خریدنا چاہتی ہیں“

میں نے اپنے مذاق میں مزید زور پیدا کیا :

”یہ جو پیوند آپ دیکھ رہی ہیں یہ بھی جدت اور فیشن کی خاطر لگائے گئے ہیں

امریکی کے جدت پسند نوجوان اب پیوندگی پتلونیں پہننے لگے ہیں“

میری باتوں سے ان کی آتش شوق کو اور ہوا ملی۔ دونوں نے آپس میں کچھ

سرگوشی کی۔ پھر ایک۔ نے اپنے پرس سے ۵۰ روپے کا نوٹ نکالا اور میرے سامنے

میز پر ڈالتی ہوئی بولی :

”اس وقت تو ہم یہی پیش کر سکتی ہیں۔ اگر مزید کہیں تو ہاسٹل سے لا کر دے

دیں گے“

میرے خیال میں مزید دھوکا دینا مناسب نہ تھا۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ یہ پتلون

بہت پرانی ہے۔ اس لیے آپ یہ مفت ہی لے جائیں۔ میرا دوست پیسے لینا پسند نہیں

کرے گا، مگر وہ پیسے پھینک کر چلتی بنیں۔ جب میں نے مرزا محمد کو ۵۰ روپے دکھائے

تو اسے یقین نہ آتا تھا۔



## ٹرانسپورٹ کا مسئلہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روسی حکومت عوام کے مسائل خاصی تندہی سے حل کر رہی ہے۔ بالخصوص رہائش کے مسئلے پر خاصی سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ ہر سال سینکڑوں تعمیراتی منصوبے مکمل کیے جاتے ہیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی معیار آہستہ آہستہ بلند ہو رہا ہے، لیکن بہت سے مسائل حل طلب ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ ٹرانسپورٹ کا بھی ہے۔ خصوصاً مزدوروں کو علی الصبح دروازہ کارخانوں تک بروقت پہنچانا ایک اہم مسئلہ ہے، جو روز بروز پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔

کارخانوں اور اجتماعی فارموں میں یہ قانون ہے کہ ہر کارکن کام شروع ہونے سے پندرہ منٹ پہلے پہنچ جائے۔ ایک مخصوص جگہ پر ان کی حاضری لگتی ہے اور گزشتہ روز کے کام کی رپورٹ پیش کرنی پڑتی ہے۔ اس وقت دن بھر کے لیے کام تفویض کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی مزدور وقت مقررہ پر نہ پہنچے تو اس کی جواب طلبی ہوتی ہے۔ جواب طلبی کا مطلب نوکری سے برطرفی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بہانہ نہیں سنا جاتا کہ وقت پر گاڑی نہ مل سکی۔ اس لیے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی اپنی سواری ہو، مگر ذاتی سواری کا حصول روس میں ایک مشکل کام ہے۔

## نئی کارستی، پرانی مہنگی

دوسرے غیر ترقی یافتہ ممالک کی طرح روس میں بھی گاڑی کا مالک ہونا قابل فخر سمجھا جاتا ہے، اس لیے جو لوگ کار خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں، وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح کوئی سیکنڈ ہینڈ کار ہاتھ آجائے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ استعمال شدہ کاروں کی قیمت کم ہوتی ہے، اس کے برعکس پرانی کاریں نئی کاریں سے زیادہ مہنگی ہوتی ہیں۔ اصل میں کاروں کی خرید و فروخت کا نظام تمام حکومت کے ہاتھ میں ہے اور یہ اتنا پیچیدہ ہے کہ نئی کار خریدنے سے پرانی



کار حاصل کرنا زیادہ آسان ہے۔ اسی لیے پرانی کاریں مہنگی ہیں۔

میں نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے جن کے پاس موٹر خریدنے کے لیے تو کچا ایک سائیکل خریدنے کے لیے پیسے نہ تھے، لیکن انہوں نے کاروں کے حصول کی درخواستیں دے رکھی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کار کی درخواست منظور ہونے تک آٹھ دس برس گزر جائیں گے۔ اتنے عرصے میں رقم بھی جمع ہو جائے گی۔ ان کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے کہ طویل انتظار سے بھی مایوس نہیں ہوتے۔ برباری ان کے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔ جو صبر نہیں کر سکتے وہ زیادہ رقم ادا کر کے پرانی گاڑیاں خرید لیتے ہیں۔

کار کے لیے درخواست دینے والا ہر شخص اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا کہ اسے کار مل جائے۔ قسمت ساتھ دے اور اعلیٰ افسران کی سفارش حاصل ہو جائے، تو عین ممکن ہے کہ اس کی باری آجائے، ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دس برس بعد اس کے نام چٹھی آجائے کہ تمہاری درخواست میں فلاں قسم ہے، اسے دور کرو یا نئی درخواست دو اور باری کا انتظار کرو۔ بعض ایسے خوش قسمت بھی ہیں جو اعلیٰ درجہ میں رسائی رکھتے ہیں اور آٹے دن نئی موٹریں خریدتے اور آگے دگنی تنگنی قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں۔ روس میں اہم چیزوں کی دستیابی کو قسمت کی اچھائی یا خرابی سے منسوب کیا جاتا ہے اور جس کی قسمت اچھی ہوتی ہے وہ اپنے حق پر قناعت نہیں کرتے، دوسروں کا حصہ بھی جھپٹ لے جاتے ہیں۔

### اشیائے ضرورت کی کمیابی

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ دکانوں اور سٹوروں پر اشیائے ضرورت کم اور خریدار زیادہ ہوتے ہیں۔ لوگ شکاریوں کی طرح مختلف سٹوروں پر گھومتے اور تاک لگائے رہتے ہیں۔ جوں ہی کوئی نئی چیز آتی ہے، لوگوں کے غول وہاں اٹھ آتے ہیں۔ ہر شخص ضرورت سے زیادہ خریدنے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ ضرورت کے وقت کے لیے



ذخیرہ بھی کر سکے۔ اس لیے جب دوسروں کو بازار میں ان چیزوں کی آمد کا پتہ چلتا ہے اور وہاں پہنچتے ہیں، تو کچھ باقی نہیں ہوتا۔

میری خواہش تھی کہ لوگوں کو سلاویہ کے بنے ہوئے جوتے خریدوں۔ ہفتے میں کئی بار میں اس سٹور کے چکر لگاتا تھا جہاں یہ جوتے ملتے تھے، مگر جب بھی جاتا، سیلزمین ہمیشہ یہی جواب دیتا :

”آپ دیر سے آئے، جوتے تو ختم بھی ہو گئے“

آپ یقین کیجئے، اپنے پانچ سالہ قیام کے دوران میں کم از کم ۵۰ مرتبہ مذکورہ سٹور پر گیا، مگر صرف ایک مرتبہ یہ متاع گراں مایہ میرے ہاتھ آئی۔ اسی طرح میں کسی موزوں قمیص اور پتلون کی تلاش میں ہفتوں سٹوروں کے چکر لگانے کے باوجود ناکام رہا، تو یہ کوشش ترک کر دی۔ جن دنوں میں اڈلیسہ میں تفریح کے لیے گیا ہوا تھا، کسی نے مجھے بتایا کہ ایک سٹور پر عمدہ قسم کی پتلونیں فروخت ہو رہی ہیں۔ میں سٹور پر پہنچا تو وہاں اچھی کے بجائے رومانیہ کی بنی ہوئی بے کاری پتلونیں دکھائی دیں۔ معلوم ہوا کہ اعلیٰ قسم کا مال سٹور کے کارکنوں نے الگ کر لیا ہے۔ بعد میں وہی عمدہ پتلونیں میں نے بلیک مارکیٹ میں دگنی قیمت پر فروخت ہوتی دیکھیں۔

اڈلیسہ کی بلیک مارکیٹ پورے روس میں مشہور ہے۔ بحیرہ اسود کے کنارے ملکی اور غیر ملکی بحری جہازوں کی آمد و رفت کی وجہ سے یہاں بڑی مقدار میں غیر ملکی سامان آتا ہے۔ اس سامان میں ہر نوع کی اشیائے تعیش، کپڑے، پرفیومز، برتن، جوتے اور ممنوعہ اسلحہ شامل ہوتا ہے۔ خریدار منہ مانگی قیمت ادا کر کے یہ چیزیں خریدتے ہیں۔ یہ کام خاصا پیچیدہ ہے۔ صرف پُرفن لوگ ہی یہ تجارت کر سکتے اور اشیاء خرید سکتے ہیں۔ رات کی تاریکی میں چوروں اور پولیس کی نظروں سے بچ کر نکل جانا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں ہے۔

صرف غیر ملکی اشیاء ہی روس میں نایاب نہیں، روس کی بنی ہوئی چیزیں بھی آسانی سے نہیں ملتیں۔ لینن گراڈ کے بنے ہوئے ریڈیو سیٹ، شیل کی چائے دانیاں



اور کیرے وغیرہ بھی بلیک میں خریدے اور بیچے جاتے ہیں۔ یہی حال فوٹو گرافی کے آلات اور بعض کیمیائی اشیاء کا ہے۔ "ولینا" نام کے ایک روسی ٹیپ کیکارڈ کی سرکاری قیمت ۲۲۰ روپل تھی، لیکن سٹوروں پر ۲۵۰ روپل وصول کیے جاتے تھے، ورنہ عدم موجودگی کا بہانہ بنا دیا جاتا تھا۔

ایک دفعہ مجھے ایک قمیض کی ضرورت تھی، مگر کسی جگہ اچھی قسم کی قمیضیں نہیں مل رہی تھیں۔ ایک دن پتہ چلا کہ شہر کے ایک سٹور میں چیکو سلواکیہ کی بنی ہوئی قمیضیں بک رہی ہیں۔ میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ لوگوں کا ہجوم تھا، لیکن مطلوبہ جنس کا پتہ نہ تھا۔ حیران و پریشان کھڑے لوگ مختلف قسم کے تبصرے کر رہے تھے۔ میں ایک سیلنڈر کے پاس گیا اور اس سے صورتِ حال معلوم کی۔ وہ مجھے غیر ملکی سمجھ کر لے لی گئی۔ سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگی:

"ابھی دوپہر کے کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔ لوگ منتشر ہو جائیں گے، تم اس وقت آنا۔ اپنے ہاتھ میں بیس روپل تیار رکھنا۔ جب میں کھانے کے لیے باہر نکلوں گی تو تمہاری مطلوبہ چیز تمہیں مل جائے گی، مگر خیال کرنا کسی دوسرے کو پتہ نہ چلے۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے قمیض مل گئی، لیکن نہ تو وہ میرے سائز کی تھی اور نہ اس کا رنگ مجھے پسند تھا۔

### روسی مصنوعات کا ناقص معیار

کئی بار میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ روس جیسے بڑے ملک میں اشیائے ضرورت کا اتنا قحط کیوں ہے؟ مفصل تجزیے کے بعد معلوم ہوا کہ اس مسئلے کی بنیاد روسی حکومت کی پیداواری پالیسی ہے۔ ہر کارخانے کو پیداوار زیادہ سے زیادہ بڑھانے کا حکم ہے، لیکن اس میں عوام کے ذوق اور پسند کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ کارخانوں کو جو منصوبے دیئے جاتے ہیں، وہ انہیں مکمل ہی نہیں کرتے، بلکہ اعلیٰ



حکام کو خوش کرنے کے لیے پانچ سالہ منصوبوں کو چار اور تین سالوں ہی میں مکمل کر لیتے ہیں۔ جب پانچ برس کا کام تین برس میں نمٹا لیا جائے تو معیار کا خیال کیسے رکھا جاسکتا ہے، مگر وقت سے پہلے کام ختم کرنے والوں کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ ایسے کارخانوں کے افسر ٹیلی ویشن پر بلائے جاتے ہیں جہاں وہ اپنے کارکردگی کی روداد سناتے ہیں۔

لینن گراڈ کے شیونگ بلیڈ بنانے والے کارخانے کے سربراہ کو ایک بار میں نے ٹیلی ویشن پر اپنے کارخانے کے کارنامے بیان کرتے سنا۔ اس نے بتایا کہ اس کے کارخانے نے پچاس سالہ منصوبے کو تین برس سے بھی کم وقت میں مکمل کر لیا ہے اور اب وہ کوشش کر رہے ہیں کہ بچے ہوئے وقت میں دوسرے پچاس سالہ منصوبے کو بھی مکمل کر لیں۔ میں یہ بات سن کر حیران ہوا، مگر ہمارے روسی ساتھی کہنے لگے کہ یہ محض لوگوں کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے، ورنہ اگر بلیڈوں کی پیداوار پہلے سے دگنی ہو گئی ہوتی، تو لوگ بلیڈوں کی تلاش میں کیوں مارے مارے پھرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ روسی بلیڈوں کا معیار اتنا ناقص ہوتا ہے کہ لوگ غیر ملکی بلیڈ خریدنے کے لیے بلیک مارکیٹوں کا رخ کرتے ہیں۔

غذائی اجناس، دودھ اور مکھن فراہم کرنے والے ادارے بھی بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ مقررہ حد سے اتنی زیادہ پیداوار ہوئی اور کبھی بتایا جاتا ہے کہ اس سال اتنی فاضل پیداوار غیر مالک کو برآمد کر دی گئی، لیکن ماسکو اور لینن گراڈ جیسے مرکزی شہروں کے باشندے بھی اشیائے خود و نوش کی کمیابی کے شاک میں رہتے ہیں۔ گوشت کے نام پر لوگوں میں ہڈیاں تقسیم کی جاتی ہیں اور یہ ہڈیاں بھی سب کو نہیں ملتیں۔ شاید اسی لیے روسی کہتے ہیں کہ جس روز تمام لوگوں کو کھانے پینے کی چیزیں آسانی سے ملنے لگیں گی، روس میں کمیونزم کا مکمل نفاذ ہو جائے گا۔ ناقص معیار پر تنقید بھی ہوتی ہے۔ اخبارات دبے دبے میں حکومت کو اس طرف توجہ دلاتے ہیں۔ روسی مجلہ "کراکاویل" سخت الفاظ بھی استعمال کرتا ہے لیکن



اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ناقص چیزوں پر "عُمدہ" کی مہریں لگنے لگتی ہیں۔



## فیلڈ ورک

پہلے برس کے اختتام پر ہمیں بیس روز کے فیلڈ ورک کورس کے لیے ایکھ کارخانے میں بھیجا گیا۔ سب سے پہلے کارخانے کی کمیونسٹ پارٹی کے عہدیداروں سے تفصیلی گفتگو کا موقع دیا گیا۔ انہوں نے ہمیں کسومول کمیٹی کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ معلوم ہوا کارخانے کے تمام کام کمیونسٹ پارٹی کی نگرانی میں انجام پاتے ہیں۔ اس کارخانے میں کوئلہ صاف کیا جاتا تھا۔

کارخانے کی دیوہیکل مشینیں دکھانے سے پہلے یہ بات اچھی طرح ہمارے فہم نشین کرانی گئی کہ کارخانے کا پورا نظام کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی گرفت میں ہے اور کارخانے کا سربراہ بھی پارٹی کے سامنے جوابدہ ہے۔ کارخانے کے پارٹی سیکرٹری نے ہمیں تاکید کی کہ ہم کارخانے میں ہر چیز کا بغور مشاہدہ کریں اور اپنی تجاویز پیش کریں۔

اگلے پندرہ روز تک ہم اپنے نگران کے ساتھ کارخانے کے مختلف شعبوں کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے رہے۔ کارخانہ اتنا وسیع اور اس کا نظام اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ ہم کارخانے کے کام کو پوری طرح سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ کورس ختم ہو گیا۔ کورس کے اختتام پر ہمیں اپنے مشاہدات کی مفصل رپورٹ لکھنے کو کہا گیا۔ اس رپورٹ میں کارخانے کی تمام مشینوں اور تکنیکی نظام کی جزئیات لکھنی تھیں۔ حالانکہ ہم



میں سے اکثر کارخانے کے چند ہال ہی دیکھ پائے تھے اور کپڑے میلے کرنے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تھا۔ کارخانے کی انتظامیہ کی مدد سے رپورٹیں لکھ لی گئیں اور ہمارے نگران نے زبانی امتحان بھی لے لیا۔ انہیں چونکہ معلوم تھا کہ ان کے شاگرد محض چند چیزوں کے بارے میں ہی جان پائے ہیں، اس لیے انہوں نے زیادہ مشکل سوالات نہ پوچھے اور ہم باسانی "کامیاب" ہو گئے۔

### پڑھے لکھے بغیر پاس

روس میں امتحانات کا طریقہ سادہ اور آسان ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا زیادہ تر انحصار پروفیسر یا استاد کی خوشنودی یا ناراضی پر ہوتا ہے۔ شاگرد اس کے سامنے اپنی اہلیت ثابت کر دے تو اسے متعلقہ مضمون کے بارے میں سوالات کے اچھے جواب نہ دینے کے باوجود پاس قرار دیا جاسکتا ہے۔ اصولاً ہماری رپورٹیں پروفیسر کو پڑھنی چاہیے تھیں، لیکن انہوں نے کسی کی رپورٹ کھول کر بھی نہ دیکھی اور اوپر خالی جگہ میں "تسلی بخش" کے الفاظ لکھتے رہے۔

اساتذہ کی مہربانی کا طلبہ ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ تعلیم سے ان کی دلچسپی واجبی سی تھی۔ بعض تو ایسے تھے جو کلاسوں میں جانے کا تکلف تک نہ کرتے تھے۔ میرا ایک روسی کلاس فیلو جو میرے ساتھ بیٹھتا تھا، لیکچر کے دوران میں بے پروائی اور بے دلی سے بیٹھا رہتا تھا۔ کتابوں کی ورق گردانی کر کے یہ ثابت کرتا کہ وہ پڑھ رہا ہے۔ صرف سخت گیر استادوں کے پیرٹڈ میں حاضر ہو جاتا، باقی اساتذہ کی کلاسوں میں جاتا ہی نہ تھا۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ وہ پڑھے لکھے بغیر امتحان میں کیسے پاس ہو جاتا ہے؟

کہنے لگا: "امتحان کے دنوں میں اپنے ساتھیوں کے نوٹس جمع کر لیتا ہوں۔ کمرہ امتحان میں یہ میری بہت مدد کرتے ہیں۔ پرچہ حل کرتے وقت یہ نوٹس اپنے سامنے رکھتا ہوں اور ہر مشکل خود بخود آسان ہو جاتی ہے۔ دوسرے میں نے چکیو سلو اکیہ



میں فوجی خدمات انجام دی ہیں۔ یہ بجائے خود بڑے اعزاز کا کام ہے۔ کوئی شخص میرے مرتبے کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔“

اس نے مزید کہا: ”روسی طلبہ کو اپنی توجہ کمیونزم اور سیکولرزم کی تعلیم اور تربیت پر مرکوز کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اچھے کمیونسٹ نہیں کہلا سکتے، نہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن بن سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں علمی کمیونزم پر زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے اور عام نصابی علم کے لیے ہمارے پاس بہت کم وقت بچتا ہے۔ اس بات کو ہمارے اساتذہ اچھی طرح جانتے ہیں، اسی لیے وہ ہم سے زیادہ محنت کرنے کو نہیں کہتے۔“

روسی طلبہ کی تعلیمی زندگی کا ایک حصہ فوجی تربیت کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ ابتدا میں ہمیں کچھ تپہ نہ چلنا تھا کہ روسی طلبہ مخصوص اوقات میں کہاں چلے جاتے ہیں۔ بعد میں تپہ چلا کہ یہ وقت ان کی فوجی تربیت کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ رازداری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ فوجی کتابیں اور نوٹس کی کاپیاں لیکچر روم سے باہر لے جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ فوجی تربیت ڈھیلے ڈھالے جسم کے روسی لڑکوں کو توڑ پھوڑ کر چاق چوبند بنا دیتی ہے۔ روسی طلبہ اس سے بے حد تنگ تھے۔ کئی بار وہ غصے میں کہتے کہ ہمیں انجینیئر بنایا جا رہا ہے یا فوجی سپاہی؟

### نقل کی روز افزوں وبا

روسی طلبہ میں نقل کرنے کا رجحان عام ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہاں نقل کے بغیر امتحان کا تصور بھی نہیں، تو مبالغہ نہ ہو گا۔ بیشتر طلبہ اس فن کے ماہر ہیں۔ اساتذہ بھی اپنے ہونہار شاگردوں کی اس عادت سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ اس لیے کسی طالب علم سے نقل پکڑا جانا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اس مسئلے پر طلبہ سے باز پرس تک نہیں ہوتی۔ کئی بار میں نے چشم خود دیکھا کہ اگر کسی نگران نے نقل کرتے ہوئے طالب علم سے کتاب لے لی، تو تھوڑی دیر بعد وہی طالب علم دوسری کتاب لاکر نقل کرنے لگا۔ اگر کتاب سے کسی سوال کا جواب نہ ملے، تو وہ سوال کا غڈ پر لکھ کر



باہر بھیج دیا جاتا ہے جہاں سے "معاون" طلبہ جوابات سمجھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اساتذہ چونکہ طلبہ کی "مجبوری" جانتے ہیں اس لیے پرچے تقسیم کرنے کے بعد ہال سے باہر چلے جاتے ہیں یا ہال کے گوشے میں آرام سے بیٹھ جاتے ہیں اور طلبہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کتابوں اور کاپیوں سے نقل کر کے پرچہ مکمل کر لیتے ہیں۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ اگر کسی طالب علم کو اپنے نقل کردہ کسی جواب پر اطمینان نہ ہو تو وہ اپنی کتاب یا کاپی لے کر اپنے استاد کے پاس جاتے اور ان سے تحریر کردہ جواب کی تصدیق کرتے ہیں۔

### تعلیم سے عدم دلچسپی کیوں؟

تعلیم سے روسی طلبہ کی عدم دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یونیورسٹی سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کے باوجود وہ یکساں ملازمت حاصل نہیں کر سکتے۔ بالفاظ دیگر انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرنے پر ہر لڑکا انجینئر بننے کا حق نہیں رکھتا۔ کس سے کیا کام لیا جائے گا، یہ صرف ارباب اختیار کو معلوم ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کسی شخص نے تعلیم مکمل بھی نہ کی ہو، مگر وہ کسی محکمے کا سربراہ بن جائے اور کوئی دوسرا بھاری بھر کم ڈگریوں کے باوجود معمولی درجے کا کلرک۔ مقابلے کی روایت موجود نہیں۔ کوئی شخص اپنے حق کے لیے آواز بلند نہیں کر سکتا۔ یہ بات ہر روسی شہری نے گہرے میں باندھ لی ہے کہ بڑے لوگوں کی ہمسری کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، چنانچہ جو چیز مل جاتی ہے وہ اس پر قانع ہو جاتے ہیں۔

ہمارے اساتذہ اکثر ہمیں اس حقیقت کا احساس دلاتے تھے کہ تم روسی طلبہ کی طرح نکھٹو نہ بنو۔ انہیں پڑھ کر کیا ملے گا، مگر تم اپنے ملکوں میں جاؤ گے تو تمہاری لیاقت ہماری نیک نامی اور تمہاری نالائقی ہماری رسوائی کی موجب ہوگی، اس لیے ہمیں اپنے اساتذہ کی پوری توجہ حاصل رہتی تھی۔ روسی طلبہ سال بھر دوسرے مشاغل میں الجھے رہتے، مگر کوئی استاد انہیں کبھی نہ ٹوکتا۔ امتحان کا وقت آتا تو روسی طلبہ



مختلف ذرائع کو کام میں لاکر کامیابی حاصل کر لیتے۔ جو اس کے باوجود فیمل ہو جاتے، ان میں سے بھی ایک بڑی تعداد اساتذہ کی مہربانی سے پاس ہو جاتی تھی۔

روس میں زیادہ سے زیادہ نمبر پانچ اور کم سے کم تین ہوتے ہیں۔ تین سے کم نمبر لینے والا طالب علم فیمل تصور ہوتا ہے۔ اساتذہ نے طے کر لیا ہے کہ طلبہ کی تعلیم سے عدم دلچسپی کی بنا پر انہیں فیمل نہیں کریں گے، اس لیے ہر طالب علم کو تین نمبر ضرور دے دیئے جاتے ہیں۔ طلبہ بھی اس رعایت سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں، اس لیے وہ محنت کا ”روگ“ نہیں پالتے۔ امتحان دینے سے پہلے ہی طلبہ کو یقین ہوتا ہے کہ چاہے وہ کچھ بھی نہ کریں تین نمبر ضرور حاصل کر لیں گے۔

جس کلاس میں غیر ملکی طلبہ ہوں، اس میں روسی طلبہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ غیر ملکی طلبہ کی اکثریت ہوم ورک کرنے کی عادی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ خود ہوم ورک کرنے کے بجائے اپنے غیر ملکی دوستوں کی کامیابیوں اور نوٹس سے کام چلاتے ہیں۔ اساتذہ طلبہ کی کامیابیاں چیک نہیں کرتے۔ بس اتنا پوچھ لیتے ہیں کہ آیا سب نے گھر کا کام کر لیا ہے؟ اور ان کی توقع کے عین مطابق طلبہ یک آواز ہو کر ”اقرار“ کرتے ہیں۔

## قفقاز کا سفر

فیلڈ ورک کے بعد مجھے قفقاز کے سینی ٹوریم میں آرام کے لیے ایک ماہ کی رخصت ملی۔ یہ سینی ٹوریم کر سنادار شہر کے قریب ایک پر فضا علاقے میں واقع ہے۔ سفر کے دوران میں مجھے پہلی بار ایک ایسے مرحلے سے گزرنا پڑا جس سے روسی شہریوں پر عائد شدہ پابندیاں ایک نئے رخ سے آشکارا ہوئیں۔

کر سنادار ایئر پورٹ پر میرے سامان کی اتنی باریک بینی سے تلاشی لی گئی کہ میں پریشان ہو گیا۔ میرے سوٹ کیس کی ایک ایک چیز نکال کر باہر ڈال دی گئی۔ ٹیپ کیکارڈ کا مفصل معائنہ کیا گیا۔ کپڑوں کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا گیا۔ اس کے بعد مجھ سے جاپانی



ٹیپ ریکارڈ رکھنے کی وجہ دریافت کی گئی۔ کہاں سے لائے ہو؟ کیوں لائے ہو؟ کہیں فروخت تو نہ کرو گے؟ اس کے بعد مجھ سے اس بات کی ضمانت لی گئی کہ فقکار میں ٹیپ ریکارڈ فروخت نہیں کیا جائے گا اور واپسی پر دکھا کر جاؤں گا۔ خدا خدا کر کے تلاشی کا یہ مرحلہ ختم ہوا۔ میرے لیے یہ عمل خاصا تکلیف دہ تھا، لیکن روسی شہریوں کے لیے یہ معمول کی بات ہے۔ وہ جب ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہیں تو شہر سے نکلتے اور داخل ہوتے وقت انہیں تلاشی دینی پڑتی ہے۔ ہر شخص سے پوچھا جاتا ہے کہ اس کے پاس پستول یا کوئی ممنوعہ اسلحہ تو نہیں ہے؟ حالانکہ روس میں اسلحے کا کاروبار نہیں ہوتا۔ شکار کے لیے بندوق اور کاتوس لینے کے خصوصی اجازت نامے کی ضرورت پڑتی ہے، مگر اس کے لیے اتنا پیچیدہ طریقہ کار ہے کہ ہر شخص شکار کے لیے بندوق حاصل کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

کرنا دار کے ہوائی اڈے پر شہر جانے کے لیے ٹیکسی کا حصول بھی خاصا دشوار تھا۔ امیدواروں کی قطاریں ٹیکسیوں کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ میں بھی ایک قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اس قطار میں کھڑے مجھے گھنٹوں گزر گئے۔ مجھ سے آگے والے بڑے نظم و ضبط سے آگے بڑھتے تھے۔ جس کی باری آتی وہ ٹیکسی میں سامان رکھ کر چلا جاتا اور قطار کچھ آگے کھسک جاتی۔ مجھے بار بار اپنے سوٹ کیس کو آگے کرنا پڑتا۔ حالانکہ روس میں مجھے خاصا عرصہ ہو گیا تھا مگر قطار میں طویل انتظار کا حوصلہ پیدا نہ ہوا تھا۔ میرے آگے ایک نوجوان خاتون کھڑی تھیں۔ وہ بھی مجھے تکلیف میں دیکھ کر خاصی متاثر تھیں؛ چنانچہ جب ان کی باری آگئی، تو انہوں نے مجھے پیش کش کی کہ میں بھی ان کے ٹیکسی میں شہر چلوں، لیکن میں روس کی آزاد منشی خواتین سے خاصا محتاط تھا، اس لیے خاتون کا شکریہ ادا کر کے اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ بعد میری باری بھی آگئی۔



## ٹیکسی ڈرائیور کا تقاضا

ٹیکسی ڈرائیور نے شاید میرے لباس اور شکل و صورت سے اندازہ لگا لیا کہ میں غیر ملکی ہوں۔ ادھر میں نے ٹیکسی میں قدم رکھا، اُدھر تقاضا شروع ہو گیا کہ اگر میرے پاس کوئی قابل فروخت چیز ہو، تو فروخت کر دوں۔ میں نے بتایا کہ علاج اور آرام کے لیے جارہا ہوں، میرے پاس اپنی ضرورت کی چیزیں ہیں، لیکن وہ اتنی جلدی کہاں مانتا۔ کہنے لگا: ”یہ ٹیپ ریکارڈر ہی فروخت کر دو۔ جاپانی معلوم ہوتا ہے؟“ میں نے کہا: ”ہے تو جاپانی، مگر فروخت کے لیے نہیں لایا۔ مجھے خود اس کی ضرورت ہے۔“

جب میں نے اسے قطعی مایوس کر دیا تو حسرت بھرے لہجے میں بولا: ”میرے پڑوسی کے پاس جاپانی ٹیپ ریکارڈر ہے۔ اتنا عمدہ ہے کہ برسوں گزرنے کے بعد بھی نیا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے بنے ہوئے ٹیپ مشین سے تین چار ماہ چلتے ہیں۔ میرا اپنا سیٹ مینک کے پاس پڑا رہتا ہے۔“ مجھے بس اڈے پر جانا تھا، جہاں سے گریچی کلوچ سیننی ٹورم تک بس ملتی۔ منزل پر پہنچا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے تین روپل مانگے، میں نے اسے چار روپل دیئے، اس لیے وہ خوشی سے رخصت ہو گیا۔ دن کے دو بج رہے تھے۔ میں کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔ جہاں اپنا سامان رکھ کر نماز ادا کر سکوں اور کہیں کھانا کھا لوں۔

## ایک مخلص خاتون

انظار گاہ میں لکڑی کی ایک کرسی پر جب میں اپنا سامان رکھنے لگا، تو مجھے ہی خاتون نظر آ گئیں جو ہوائی اڈے پر ٹیکسی میں ساتھ چلنے کی پیش کش کر چکی تھیں۔ انہوں نے بڑے اخلاص سے مجھے پاس بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے کھانا نہیں کھایا، اگر وہ میرے سامان پر نگاہ رکھیں، تو میں کھانا کھا لوں۔ انہوں



نے بتایا کہ اُن کے پاس گھر کا پکا ہوا کھانا کافی مقدار میں موجود ہے اور اگر میں چاہوں تو ان کے ساتھ کھا سکتا ہوں۔ بس کے اڑے پر کھانے کے ملنے کی اُمید نہ رکھوں مگر میں نے شکریے کے ساتھ ان کی پیش کش ٹال دی اور کہا مجھے سگریٹ کی طلب بھی ہو رہی ہے اور پھر مجھے نماز بھی ادا کرنی ہے۔

سامان چھوڑ کر میں نے کئی ریسٹورانوں کا چکر لگایا، لیکن ہر جگہ کھانے والے قطاروں میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ کسی جگہ بھی ایک گھنٹے سے کم میں باری آتی دکھائی نہ دی تو میں بے نیل مرام واپس انتظار گاہ جا پہنچا۔ جہاں لینا (اس خاتون کا نام) کھانے کا ڈبہ کھولے میرے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ مجھے مایوس واپس آتے دیکھ کر وہ بھانپ گئیں۔ مسکرا کر بولیں: ”آئیے! معلوم ہوتا ہے میرا خیال درست نکلا۔ آپ کو کھانے کے لیے کچھ نہیں ملا۔“

بھوک کی شدت نے مجھ سے انکار کی ہمت سلب کر لی۔ پھر انہوں نے اپنے ڈبے سے کھانے کی متعدد چیزیں نکال کر میرے سامنے لا رکھیں۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ سفر پر نکلنے سے پہلے خاتون نے خورد و نوش کا اتنا اہتمام کیا کھانا ہم دونوں کی ضرورت سے بھی زیادہ نکلا۔ میں نے کھا کر ان کا شکریہ ادا کیا۔

کھانے کے بعد لینا نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جاؤں گا؟ اور میرے بتانے پر کہ میں گرہ یاچی کلوج میں واقع سینی ٹوریم جا رہا ہوں، انہوں نے سینی ٹوریم کی بہت تعریف کی اور مجھے سینی ٹوریم تک چھوڑنے گئیں۔ لینا ایک بڑے فوجی افسر کی بیٹی تھیں۔ ایک مادہ پرست معاشرے کی نفسا نفسی میں ان کا وجود مجھے تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس ہوا۔

### گرہ یاچی کلوج سینی ٹوریم

سینی ٹوریم ایک پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ جنگلات سے پٹی ہوئی پہاڑیوں کے دامن میں خوبصورت عمارتیں گھنے درختوں سے گھری ہوئی ہیں۔ قریب ہی شفاف پانی



کی ندی بہتی ہے۔ یہاں اکثر ہلکی پھلکی بیماریوں کے مریض آتے ہیں۔ معدے اور جگر کی خرابی میں مبتلا اور بلڈ پریشر اور شوگر کے شکار یا پھر اُدھیر عمر کے فوجی افسر اور ان کے اہل خانہ یہاں محض چھٹیاں گزارنے چھوٹی موٹی بیماری کا بہانہ بنا کر پڑے رہتے ہیں۔ بیس تیس فیصد نوجوان بھی تھے جن کی اکثریت میری طرح معدے کی بیماری میں مبتلا تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ روس میں ناقص غذا کی وجہ سے معدے کی بیماری عام ہے۔ مجھے تو متعدد مرتبہ اس بیماری کے ہاتھوں ہسپتال جانا پڑا۔

سینی ٹوریم کے قریب ہی صحت بخش پانی کے کئی چشمے ہیں۔ اس پانی میں گندھک کے مرکبات پائے جاتے ہیں جو کئی بیماریوں کے علاج کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ سیر و تفریح کے لیے قدرتی ماحول میں دلکش اور خوش نما جگہیں موجود ہیں۔ پودوں اور پھولوں سے آراستہ پارک اور پہاڑی ڈھلوانوں پر چلنے پھرنے والوں کے لیے ریشیں اور راستے۔ سینی ٹوریم میں آنے والے مریضوں کو بتا دیا جاتا ہے کہ خوب سیر و تفریح کرو، کھاؤ پیو، عیش کرو، یہی ہمارا طریق علاج ہے۔ مریضوں کی رہائش گاہوں کے عین سامنے ایک بڑے بورڈ پر جلی حروف میں یہ فقرہ لکھا ہوا ہے :

”رات کے وقت چہل قدمی ہمارے علاج کا اہم حصہ ہے“

رات کے وقت سینی ٹوریم کے اطراف میں خوب رونق ہوتی ہے خصوصاً گرمی کے موسم میں، جب ندی کے پانی پر کشتیاں لکھوڑے لیتی اور چاندنی راتوں میں مریض کشتی رانی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ سینی ٹوریم کے خوابناک ماحول میں عیش و عشرت کا ہر سامان موجود ہے۔ رقص گاہوں میں مرد و زن کے لیے آزادانہ میل جول اور دلہن کی کا انتظام کیا گیا ہے۔ دن کے وقت ندی کے کنارے غسل آفتابی سے لطف اندوز ہونے کے مقامات موجود ہیں۔ کھیل کے میدان بھی ہیں، جہاں مریض خصوصاً نوجوان کئی قسم کے کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں۔ علاقے کے تاریخی اور قدرتی مناظر کو دیکھنے کے لیے مریضوں کو باہر بھی لے جایا جاتا ہے۔ میرے لیے اس میں بڑی دلچسپی کا سامان تھا۔ بالخصوص قریب ہی بحیرہ اسود کے کنارے



سیر و سیاحت کے لیے جانا بڑا اچھا لطف تھا۔ کئی بار میں نے سمندر کے کنارے چل پڑی کی اور میرے دوسرے ساتھیوں نے سمندر میں غسل اور ساحل کی ریت پر غسل آفتابی کا مزہ لیا۔

فارغ اوقات میں مریض قریبی پہاڑیوں پر جاتے ہیں۔ گھنے جنگلوں میں پہاڑوں پر چڑھنا اور اتارنا بہت دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے۔ ایک پہاڑی کے اوپر کئی بڑے بڑے پتھر تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ لوگ سینکڑوں برسوں سے ان پہاڑوں پر اپنے نام اور یادداشتیں کندہ کرتے آئے ہیں۔ میں نے ان پتھروں پر عربی، اردو، فارسی اور پشتو میں سینکڑوں تحریریں اور نام پڑھے۔ سینی ٹوریم کے قریب ایک پتھر پر تقریباً پانچ سو برس پہلے عربی زبان میں کسی نے یہ فقرہ لکھا تھا :

”حج کو جاتے ہوئے میں اس راستے سے گزرا“

حاجی قمر دین - ۹۱۴ ہجری

### بیمار ہونے کا معقول انتظام

اس پر فضا ماحول میں اتنے عمدہ علاج کے ساتھ ساتھ کئی نئی بیماریوں میں مبتلا ہونے کا بھی ”معقول“ انتظام موجود تھا۔ خصوصاً مرد و زن کے آزادانہ اختلاط نے سینی ٹوریم کو کسی قحبہ خانے کی طرح بدنام کر رکھا تھا۔ عام بیماریوں میں مبتلا مریضوں کے علاوہ یہاں جنسی مریض بھی بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ گمرد و نواح میں ایسی آبرو باختہ عورتوں کی کمی نہیں جو اپنے مزاج کے مردوں کی تلاش میں آوارہ تیلیوں کی طرح مشکلی پھرتی ہیں۔ ہسپتال کی انتظامیہ جنسی بے راہروی پر روک لگانا تو کجا، اکٹا حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ چند ہی روز میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اکثر مریض اس عادت بد میں مبتلا ہیں۔ دیدہ دلیری کی انتہا یہ ہے کہ فاحشہ عورتیں رات کے وقت آزادانہ ہسپتال کے کمروں اور مریضوں کی قیام گاہوں میں ”استراحت“ کرتی تھیں۔ سینی ٹوریم کے عملے میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو اپنے مہالوں کی ضیافت طبع کے لیے دلائی کے



فرائض انجام دیتے تھے۔ خود ڈاکٹروں اور طبی عملے کے افراد بھی اخلاق سوز حرکات میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہسپتال میں آتشک کا مرض بہت عام تھا۔

جن دنوں میں سینی ٹوریم آیا، قریبی علاقے میں ریل کی پٹری بچھائی جا رہی تھی۔ پٹری بچھانے والے مزدوروں میں اکثریت عورتوں کی تھی۔ یہ عورتیں رات کے وقت سینی ٹوریم کے قریب واقع ٹائٹ کلبوں پر یورش کر دیتی تھیں۔ رقص و سرود اور آزادانہ اختلاط کی محفلیں جمتیں۔ بہت سے مریض صبح کے وقت مختلف پارکوں اور تفریح گاہوں سے اٹھا کر لائے جاتے۔ رفتہ رفتہ یہ مسئلہ اتنی پیچیدگی اختیار کر گیا کہ سینی ٹوریم کے انتظامیہ کو باقاعدہ یہ نوٹس لگانا پڑا۔

”پٹری پر کام کرنے والی عورتوں سے دور رہیں۔ ورنہ آپ خطرناک امراض کا شکار ہو سکتے ہیں۔“

### دلوں میں چھپے طوفان

سینی ٹوریم میں ایک اعلیٰ فوجی افسر کی بیوی بھی زیرِ علاج تھی۔ اس کی نوجوان بیٹی دیکھ بھال کے لیے ہمراہ آئی ہوئی تھی۔ اصولی طور پر ہسپتال کے طعام گاہ میں صرف ماں کو کھانا کھانے کی اجازت تھی۔ لڑکی کو باہر کے ہوٹلوں میں جانا پڑتا تھا۔ اس سے لڑکی اور ماں دونوں پریشان تھیں۔ لڑکی کی ماں نے مجھ سے درخواست کی: ”اگر میں اعتراض نہ کروں، وہ اپنی بیٹی کو میری میز پر کھانے کے لیے لے آیا کرے؟“ میں نے سوچا، کھانا وافر مقدار میں ہوتا ہے اس لیے ان کی مدد کرنے میں کیا حرج ہے؛ چنانچہ وہ دونوں ماں بیٹی ایک ماہ تک میری میز پر کھانا کھاتی رہیں۔ اس دوران میں مجھ پر وہی عوام کی زندگی کے کئی نئے گوشے آشکار ہوئے۔

خاتون کا نام تانیا ویکتورونیا تھا۔ اس کے بقول اس کی عمر ۳۲ برس تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے بالوں کو نہرے رنگ میں رنگے رہتی تھی۔ معاشیات کے مضمون کی فائز تحصیل



— تھی اور روس کے مشہور شہر گورکی کی رہنے والی اکثر اپنے علاقے کی بد حالی کا رونا روتی۔ اس کا کہنا تھا کہ ضروریات زندگی کی کمیابی کے لحاظ سے گورکی کے باشندے ابھی تک قرون وسطیٰ کے لوگوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ تانیا نے بتایا کہ گورکی شہر عام لوگوں کے لیے ممنوعہ علاقہ شمار ہوتا ہے۔ غیر ملکیوں کا تو کیا سوال، کوئی روسی شہری بھی وہاں خصوصی اجازت نامے کے بغیر نہیں جاسکتا۔ تانیا کا شوہر فوج میں کرنل کے عہدے پر فائز تھا۔ وہ خود ایک بینک میں افسر تھی۔ ایک روز جب ہم روسی مصنوعات کے خراب معیار کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، میں نے تانیا سے پوچھا کہ آخر روس میں معیاری چیزیں کیوں نہیں بنتیں؟ انہوں نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے سوال کر دیا: ”تمہیں روس آئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟“

اور جب میں نے بتایا کہ دو برس ہو چکے ہیں تو کہنے لگیں: ”حیرت ہے دو برس گزارنے کے باوجود تم اس حقیقت سے بے خبر ہو۔ تمہیں چاہیے تھا عام لوگوں سے رابطہ رکھتے، ان کے گھروں میں جاتے اور ان کی زندگی کے اندرونی مناظر دیکھتے۔ تم روسیوں کے گھروں میں مہمان بن کر جاؤ تو تمہیں خلوص اور مہمان نوازی ملے گی۔ تم ان کے اور قریب جاؤ گے، تو وہ تمہارے لیے اپنے دلوں کے کوارٹر کھول دیں گے اور تمہیں اپنے کئی سوالوں کا جواب خود بخود مل جائے گا۔ یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے دلوں میں کتنے طوفان چھپے ہوئے ہیں۔“

مجھے اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کی بے چینی تھی۔ میں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ انہوں نے کہا: ”تمہیں میری باتوں سے اپنے سوال کا جواب خود بخود مل جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ روس میں اجتماعی ملکیت کا تجربہ بُری طرح ناکام ہوا ہے۔ کسی شخص کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی کہ ملک میں پیداوار کا معیار کیسا ہے، جب تک کہ اس کا پیداوار میں کوئی ذاتی مفاد نہ ہو۔ ہم فطرت کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ہمارے گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری حکومت اپنی شکست کو تسلیم نہیں کرتی۔“



## سچے جذبے مر گئے

تانیانے دل کی گرہیں کھولتے ہوئے کئی اُن کہی باتیں کہہ ڈالیں۔ ان کا کہنا تھا: ”کیونٹ سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ جب تک ہر شخص کو اپنے نفع نقصان کا خود مالک نہ بنایا جائے گا، وہ کام نہیں کرے گا اور اگر کام کرے گا تو اس میں یاقتدار کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ لوگوں کو جانوروں کے گلوں کی طرح یک جا کر کے کہا جاتا ہے کہ اتنی گھاس کھا لو، اتنی کل کے لیے چھوڑ دو۔ یا مشین جان کر کہا جاتا ہے کہ اتنی فصل اگاؤ، اتنی چیزیں بناؤ۔ انسان نہ تو چوپایہ ہے نہ مشین۔ وہ گھاس کھا سکتا ہے نہ مشین کا پرزہ بن سکتا ہے۔ کوئی کام اس وقت تک دل کے سچے جذبے کے ساتھ انجام نہیں دیا جاسکتا جب تک کام کرنے والے کو قلبی سکون اور روحانی آسودگی حاصل نہ ہو“

تانیانے روسی نوجوانوں کے مسائل کے بارے میں بھی کئی باتیں کیں۔ انہوں نے بتایا: ”روس میں عمر رسیدہ لوگ قحط اور قناعت پسند ہوتے ہیں، لیکن نوجوان نسل اضطراب میں مبتلا ہے۔ وہ کارخانوں اور اجتماعی فارموں میں کام تو کرتے ہیں، لیکن ان کے دل آزادی کے لیے تڑپتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے جینا چاہتے ہیں۔ تم ان کے دل کی گہرائی میں جھانک کر دیکھو، تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ روس میں تیار ہونے والی چیزوں کا معیار کیوں ناقص ہے۔ کارکنوں کی اکثریت کارخانوں میں جاتی ہے مگر نگرانوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر واپس آ جاتی ہے“

تانیادیکھتا تھا ایک پڑھی لکھی خاتون تھی۔ مارکس کے جدلی فلسفے پر اس کی گہری نظر تھی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ایک بنک کی ذمہ دار افسر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مارکسزم کی بہترین نقاد بھی تھی۔ اس نظام کی خامیوں پر بھی اس کی گہری نظر تھی۔ اس کے خیال میں کیونززم کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد انقلاب کا عمل رک گیا تھا۔ انسان فطرت



کا ایک کارندہ ہونے کی حیثیت سے تغیر پسند واقع ہوا ہے۔ وہ ہر آن ایک نئی تبدیلی دیکھنا چاہتا ہے، مگر دسی سماج میں مزدوروں اور کاشت کاروں کی زندگی ایک مقام پر رُک گئی ہے۔ تانیا نے کہا: "انیسویں صدی میں مارکس نے جو کچھ ہیگل کے جدلیاتی فلسفے کا حشر کیا تھا، اس کے اپنے نام یو او ہی کچھ اس کے اپنے نظریے کا کر رہے ہیں"

### جدلی مادیت کا مخروط

مارکس نے کہا تھا: "ہیگل نے جدلی مادیت کا مخروط سر کے بل کھڑا کیا ہے۔" اس مخروط کو مارکس نے اپنے بقول پاؤں پر لا کھڑا کیا۔ بیسویں صدی میں مارکس کے فکری بیٹوں نے اس مخروط کو ایک بار پھر الٹا دیا ہے۔ مارکس کی منطق یہ تھی کہ مغربی یورپ میں مزدور و سرمایہ دار کے درمیان اختلاف ابھرے گا جو اتنی شدت اختیار کرے گا کہ بالآخر مزدور سرمایہ داروں کے خلاف جنگ آزما ہو جائیں گے۔ فتح مزدوروں کی ہوگی۔ اس کے نتیجے میں مغرب میں پے در پے سوشلسٹ انقلابات آنے لگیں گے۔ مارکس کی یہ پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔ انقلابات مغربی یورپ کے سرمایہ دار ملکوں کے بجائے مشرقی یورپ اور مشرق بعید کے غیر صنعتی ممالک میں آئے۔ ان ممالک میں سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ مغربی یورپ کے جن ممالک کے بارے میں مارکس نے کہا تھا کہ انقلاب کے بعد وہاں سوشلزم حکمران ہوگا، وہاں ہٹلر کے فاشنزم اور مینشلزم کا غلبہ بلند ہوا اور ان کی آن میں پوری دنیا جنگ کے مہیب شعلوں میں گھیر گئی۔ شان نے چرچل اور روز ویلیٹ کے ساتھ مل کر ہٹلر اور موسولینی اور جاپان کے خلاف جنگ لڑی۔ روس کو اس وقت سوشلزم کا "آموختہ" بھول چکا تھا۔



تانیہ کے خیال میں مغربی یورپ کے صنعتی مراکز میں مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان فاصلے کم ہو رہے ہیں۔ صنعت کار مزدوروں کو اپنی آمدنی میں شریک کر رہے ہیں اور اختلافات کی جگہ مفاہمت جنم لے رہی ہے۔ دنیا میں جن واقعات کا ظہور ہو رہا ہے کمیونزم کے دانشوران کے منتظر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے طبقاتی کش مکش نمودار ہونے کا انتظار کرنے کے بجائے طیاروں اور مینکوں کے ذریعے انقلاب لانے کو ترجیح دی۔

مارکس کے عقیدے کے مطابق مارکسزم ایک اقتصادی نظام ہے۔ اس سے پیداوار، تبادلے اور مصرف میں لانے کے مثبت طریقے تشکیل پاتے ہیں۔ یہی چیز اس نظام کی ناکامی کا سبب ہے۔ کوئی اقتصادی نظام اپنے آپ کو تاریخ کے دھارے سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ تاریخ نئی کروٹ لیتی ہے تو پرانے اقتصادی ڈھانچے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ نئے لوگ نئے حالات میں نئے وسائل تک رسائی حاصل کرتے ہیں، تو پیداوار کے پرانے طریقے خود بخود منسوخ ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پرانے اقتصادی روابط بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اقتصادی نظریات بھی تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ جو بات آج ایک ناقابل تغیر حقیقت نظر آتی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ پچاس سال بعد وہ ایک متروک اور ازکار رفتہ چیز بن جائے گی۔

اشتراکیت کے پاس اس تغیر پذیر تاریخی عمل کے لیے کوئی متبادل نظام اور نظریہ موجود نہیں ہے۔ اس کا حل کمیونزم کے ارباب بست و کشاور نے یہ نکالا ہے کہ جہاں حالات تبدیلی کا تقاضا کرتے ہیں وہ جبر سے تاریخی عمل کو روک دیتے ہیں۔



## روس کے مال کی مانگ کیوں نہیں

تانیہ نے روس کے صنعتی اداروں کی کارگردگی کے اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ روس کا معاشی نظام زوال پذیر ہے اور وہ دن دور نہیں جب خود روسی حکومت اشتراکی نظریات میں تحریف کر کے خالص "بورژوائی" طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہوگی تانیہ نے بتایا :

"بے پناہ مصارف سے کارخانے لگائے گئے، عوام کا لہو کشید کر کے۔ ان کارخانوں کی پیداوار کا چالیس فیصد ناکارہ اور ناقابل استعمال ہوتا ہے۔ باقی ساٹھ فی صد "معیاری مال" کا حال یہ ہے کہ اسے خود روس کے لوگ خریدنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ بیرونی دنیا میں اس مال کی مانگ نہیں ہے اس لیے روس اس کا اکثر حصہ اپنے خوشہ چیں کمیونسٹ ممالک کو "برآمد" کر دیتا ہے۔

یہی حال زرعی شعبے کا ہے۔ جغرافیائی طور پر دنیا کا یہ سب سے بڑا ملک بھی تک غلے، گوشت اور زرعی اجناس میں خود کفیل نہیں ہو سکا۔ حالانکہ انقلاب آئے ہوئے پون صدی گزر چکی ہے۔"

تانیہ اکثر ملک کی حالت پر کڑھتی تھی۔ کھانے کی میز پر آتی تو سب سے پہلے یہ فقرہ ضرور کہتی "کل آپ میری باتوں سے بور تو ہوئے ہوں گے؟"

میں اسے یقین دلاتا کہ ہمیشہ اس کی گفتگو دلچسپی سے سنتا ہوں تو وہ نئی بحث چھیڑ دیتی۔ ہر بات کی تان اس پر ٹوٹتی کہ روس جب تک اشتراکیت سے نجات نہیں پاے گا، ترقی نہیں کر سکتا۔ وہ کسی ماہر اقتصادیات کی طرح ہمیشہ اعداد و شمار کی زبان میں بات کرتی :

"روس میں دنیا کا ایک تہائی سے زیادہ تیل پیدا ہوتا ہے۔ اس قابل کاشت



رقبہ ۸۲۵ ملین ایکڑ سے زیادہ اور جنگلات اڑھائی ارب ایکڑ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ امریکہ کے پاس زرعی اراضی اور جنگلات کا رقبہ ہمارے نصف سے بھی کم ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ لوہا اور کوئلہ روس سے نکالا جاتا ہے۔ دنیا کی کل پیداوار کے نصف کے برابر آلوروس میں پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے سونے کے ذخائر جنوبی افریقہ کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ ہیں۔ مشینوں اور کارخانوں کے لحاظ سے بھی ہم دنیا بھر میں ممتاز ہیں۔ رات دن ہمارے مرد اور عورتیں کام کرتے ہیں لیکن اتنے وسائل اور محنت کا حاصل کیا ہے۔ تجارتِ خارجہ میں ہم فرانس اور جاپان سے پیچھے ہیں اور ہماری برآمدات کی مقدار برطانیہ جیسے چھوٹے سے جزیرے کی برآمدات کے مقابلے میں نصف سے بھی کم، کینیڈا، ہالینڈ اور اٹلی جیسے ملکوں کے برابر اور امریکہ کی محض ایک چوتھائی ہے۔

ہماری زمینیں ہموار اور شاداب ہیں، پانی اور کاشت کاری کے تمام وسائل کی فراوانی ہے۔ اگر یہی وسائل کسی غیر ترقی یافتہ ملک کے پاس ہوتے تو دنیا میں اقتصادی لحاظ سے اس کا پہلا نمبر ہوتا۔ اس کے برعکس روس کے عوام کا معیار زندگی دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی تو بات چھوڑیں، ترقی پذیر ممالک بھی ہم سے آگے ہیں۔“

### شرمناک حقیقت

تانیہ نے روس میں سرکاری ملازمین کے ساتھ امتیازی برتاؤ پر بڑے تأسف کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا: ”ایک ہی معیار کی لیاقت، اہلیت اور تعلیم والے افراد کو ملازمت کے یکساں مواقع میسر نہیں۔ کوئی شخص محنت کر کے اعلیٰ ڈگری تو حاصل کر لیتا ہے لیکن اچھی ملازمت اسے تبھی مل سکتی ہے جب وہ کیونسٹ پارٹی سے



وابستہ ہو، یا اُسے کسی اعلیٰ افسر کی حمایت اور سفارش حاصل۔ اس کے علاوہ اسے خوشامد کافن بھی آنا چاہیئے۔

تانیہ کے مطابق عورتوں کے لیے ملازمت کا حصول اور ترقی حاصل کرنا اور بھی دشوار بات ہے۔ ڈگری اور سفارش کے ساتھ ساتھ اچھی شکل و صورت کا مالک ہونا بھی ایک لازمی چیز ہے۔ "تانیہ نے کہا: "یہ ایک شرمناک حقیقت ہے کہ کوئی رومی عورت حسن صورت کے حربے کے بغیر اچھے منصب پر فائز ہو سکتی ہے نہ آگے ترقی کر سکتی ہے۔"

### اجتماعی کاشتکاری کے فارم پر

سینی ٹوریم سے واپسی پر ہمارے گروپ کو ٹماٹر، آلوچے اور سیب چنے کے لیے کلخوز (اجتماعی کاشت کاری کے فارم) میں بھیجا گیا۔ یہ کلخوز شہر سے قریب اسی کلویٹر دور دیہی علاقے میں واقع تھا۔ ہمارے گروپ میں تئیس لڑکیاں، تین لڑکے اور ایک سال خوردہ استاد تھے۔ کلخوز کولینن کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔ فارم کی عمارات میں سے دو ہال نما کمرے ہمیں رہائش کے لیے دیے گئے۔ ایک کمرے میں لڑکیاں اور دوسرے میں ایک رومی اور ایک دیت نامی طالب علم، راقم الحروف اور ہمارے استاد فروکش ہو گئے۔ حوائج ضروریہ اور غسل کے لیے کوئی انتظام موجود نہ تھا۔ نہ پانی کا انتظام تھا، البتہ اس بات کی تعریف کرنی ہوگی کہ طلبہ اور طالبات کے لیے یک جا ہو کر رقص کرنے اور موسیقی کی تانیں اڑانے کے لیے ایک کمرہ مخصوص تھا جسے اوگا لوک (سرخ کلب) کا نام دیا گیا تھا۔

اوگا لوک کی ننگاں ایک جواں سال خاتون تھی۔ ہمارے گروپ کے اکثر لڑکے رات بارہ بجے تک اس کلب میں رہتے اور ایک پرانے گراموفون پر گھسے پٹے ریکارڈ



بجاتے اور رقص کرتے تھے۔ کلب میں کمیونسٹ پارٹی کے پروپیگنڈے پر بھی چند کتا ہیں اور رسائل موجود رہتے تھے لیکن کسی کو ان سے دلچسپی نہ تھی۔

## جنسی آوارگی

کلخوز پر قیام کا پورا مہینہ گروپ کے اکثر افراد نے عیش و عشرت اور جنسی آوارگی میں گزارا۔ رفتہ رفتہ قریبی دیہات کے نوجوان لڑکے بھی وہاں منڈلانے لگے۔ لڑکوں سے وہ بے تکلف نہ ہو سکے، مگر لڑکیوں سے ان کا ربط اتنی تیزی سے بڑھا کہ رات کو کم ہی لڑکیاں قیام گاہ پر واپس آتی تھیں۔

ایک افغان مسلمان کی حیثیت سے میراد ہاں رہنا سوہانِ روح سے کم نہ تھا۔ کئی بار میں بے جیائی کے مناظر دیکھ کر گاؤں کے لڑکوں اور اپنی ساتھی لڑکیوں سے کچھ پڑتا اور وہ میرے غصے کا خوب لطف اٹھاتے اور مجھے چڑاتے۔ ہمارے گروپ کی چند لڑکیاں میری بہنو تھیں۔ میری طرح ان کا بھی یہ موقف تھا کہ ایک علمی مرکز کے طالبات کو کسبیوں اور طوائفوں سے کچھ تو ممتاز ہونا چاہیے، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ لڑکیاں جو میری تائید کرتی تھیں، ان کی ناراضی کی وجہ یہ نہ تھی کہ عفت و عصمت کی ان کے ہاں کوئی اہمیت تھی، بلکہ چونکہ وہ خود ایسے سنہری مواقع سے ابھی تک محروم تھیں اور دوسری منزے لوٹتی تھیں، اس لیے جلن کے مارے میں دوسروں کو کوستی تھیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان "ناراض" لڑکیوں کے من کی مراد بھی برآئی اور وہ بھی دیہات والوں کی "مہمان" بننے لگیں۔

کلب چلانے والی خاتون طالبات کے پھنوں سے بہت برا فروختہ تھی۔ اس کا اظہار یوں کرتی کہ جب بھی کلب کا دروازہ کھولتی یا بند کرتی تو غصے سے کہتی: "مجھے دن کی ڈیوٹی کے لیے ملازم رکھا گیا تھا۔ میرا یہ کام تو نہیں کہ رات



گئے تک چہلیں کرنے والوں کی آیا گیری کرتی پھروں۔  
 بعد میں پتہ چلا کہ ان صاحبہ کا غصہ بھی پاکدامنی کی وجہ سے نہیں، بلکہ رشک  
 و حسد کی وجہ سے ہے۔ اس سے پہلے وہ بیسیوں لوگوں کی منظورِ نظر تھی، لیکن اب  
 کوئی اس کو پوچھتا بھی نہ تھا۔

ایک رات کلب میں کوئی تقریب تھی، میرے استاد مجھے زبردستی ساتھ لے گئے۔  
 روس میں ہر تقریب کا اختتام رقص کی محفل پر ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ دوسرے  
 پروگرام ختم ہوتے ہی جو ان لڑکے اور لڑکیاں بانہوں میں بانہیں ڈالے کھڑے ہو  
 کہ خروش پر ہنسنے لگے۔ میں اٹھ کر جانا چاہتا تھا، مگر استاد صاحب نے مجبور کیا کہ  
 اس ہڑ لونگ کو دیکھتا رہوں جس میں میرے لیے دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔

پورے کلب میں صرف تین افراد ایسے تھے جو اس محفلِ رقص کے تماشا بی تھے۔  
 ہمارے استاد محترم، کلب کی نگران خاتون اور راقم الحروف۔ تھوڑی دیر گزری تھی  
 کہ کلب کی نگران خاتون اپنی جگہ سے اٹھ کر میری طرف آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک  
 خوبصورت پھول تھا۔ اس نے مجھے سر کے اشارے سے دعوتِ رقص دی۔ اس  
 کے بعد وہ میرے استاد کی طرف متوجہ ہوئی، جیسے ان سے اجازت چاہ رہی ہو۔  
 میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی ہو، تو اس نے پھول میری  
 طرف بڑھاتے ہوئے کہا :

”کیا آپ مجھے اپنے ساتھ رقص کی مسرت بخشیں گے؟“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ ہمارے استاد نے اسے اشاروں میں  
 سمجھایا کہ اگر یہ لڑکا تمہارے ساتھ رقص کرے گا تو اس کے گروپ کی لڑکیاں بہت  
 ناراض ہوں گی۔ اس طرح خدا نے میری لاج رکھ لی۔ گروپ کی لڑکیوں نے بھی گویا  
 اپنے استاد کی بات سن لی تھی؛ چنانچہ جب وہ خاتون واپس جانے لگی تو وہ سب



اے گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ شاید یہ بات ان مختصر کو بہت ناگوار گزری۔ اس لیے وہ اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے تیزی سے میری طرف آئی اور بغیر میری مرضی پوچھے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اٹھانے لگی۔

میری ایک ہم جماعت لڑکی جو یہ منظر دیکھ رہی تھی، تیزی سے میری مدد کو آگئی۔ پہلے تو اُس نے نگران خاتون سے میرا ہاتھ چھڑایا۔ پھر نہایت تلخ لہجے میں اسے بتایا: ”اس کے پاس تمہارے ناز اٹھانے کے لیے فرصت ہے نہ اس کا مزاج ہی ایسا ہے۔ تم کوئی اور دروازہ کھٹکھاؤ۔“

کلب کی نگران خاصی مشتعل ہو کر پلٹنے لگی تو ہمارے استاد نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے مذاقاً کہا: ”تم مجھے نظر انداز کر رہی ہو، حالانکہ میں تمہارا ہم قوم بھی ہوں اور تمہارے التفات کا مستحق بھی۔ یہ لڑکا بہت بے فروق ہے۔ اس سے دُور ہی رہنا۔ در نہ اس کی ”دوست“ لڑکیاں تمہارے سر کے سیاہے بال نوچ لیں گی۔“

### جمعہ گل کو جان کا خطرہ

ہمارے گروپ کا واحد روسی طالب علم جمعہ گل (جو ماگولوف) قازق مسلمان تھا، جس کی شادی کا ذکر پچھلے باب میں کر آیا ہوں۔ وہ ایک کابل اور خاموش طبع نوجوان تھا۔ لڑکیاں اسے بہت چھیڑتی تھیں، مگر وہ اپنی دھن میں مگن رہتا تھا۔ اسے جب بھی فرصت ملتی، میرے پاس آجاتا اور مجھے بتاتا کہ وہ مسلمان ہے، مگر اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ اسلام کیا ہے۔

ایک روز دوپہر کے وقت وہ میرے پاس آیا اور بڑی رازداری سے الگ لے جا کر کہنے لگا: ”آؤ کہیں گھومنے چلتے ہیں، مجھے تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔“ باہر جا کر جمعہ گل نے مجھے بتایا کہ اُسے لڑکیوں سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔



میں نے پوچھا کہ اچانک یہ خطرہ کیوں کر محسوس کر لیا؟ تو اس نے کہا: ”میں مسلمان ہوں اور یہ لوگ مسلمانوں کے سخت دشمن ہیں۔“

میں نے کہا: ”مسلمان تو بہادر ہوتا ہے، موت سے نہیں ڈرتا؟“  
 کہنے لگا: ”میں ڈرتا نہیں، ایسے ہی تمہیں بتا رہا ہوں کہ تم بھی میرے مسلمان بھائی ہو۔ ذرا چوکس رہنا، کہیں وہ مجھے کوئی گزند نہ پہنچائیں۔“

### انوکھا اسلام

جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ جمعہ گل وہی سا ہے۔ راہ چلتے ہوئے کھٹکے کی آواز پر چونک اٹھتا اور ادھر ادھر ایسے دیکھنے لگتا جیسے کوئی اس کی ٹوہ میں ہو۔ رفتہ رفتہ جمعہ گل ہر وقت میرے قریب رہنے لگا۔ مجھے خوش کرنے کے لیے وہ اکثر اپنے اسلام کا اقرار کرتا، لیکن اسلام کے بارے میں صرف خدا اور رسولؐ کے نام کی حد تک اس کی معلومات تھیں۔ کلمہ تک پڑھنا اسے نہ آتا تھا۔ ایک روز اس نے اپنی اور میری مسلمانی کا عجیب و غریب فرق بتایا۔ کہنے لگا:

”میرے اور تمہارے عقیدے میں اس کے سوا اور کچھ فرق نہیں کہ تم خدا کو مانتے ہو اور میں خدا کو نہیں مانتا۔“

میں اس کے انوکھے اسلام پر دنگ رہ گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ خدا کے اقرار پر ہی تو اسلام کی بنیاد ہے۔ تم اگر اس بنیاد ہی کا انکار کر دو گے، تو پھر اسلام کا دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میری بات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کہنے لگا:

”یقین کرو ہمارے سکول میں یہ بات میرے سامنے ثابت کی گئی تھی کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہم نے ایسی فلمیں دیکھی ہیں جن میں خدا کی نفی دلائل سے کی گئی ہے۔“



میں ایسے 'دلائل' سے اچھی طرح آگاہ تھا جو نوخیز طلبہ کے ذہنوں میں الحاد کا زہر اُنڈیلنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ جمعہ گل بھی ایک سادہ لوح نوجوان تھا۔ اسلام کی آفاقی تعلیم سے بے بہرہ اور دہریت کے طوفان میں گھرا ہوا۔ اسے سچائی کی تلاش تھی، مگر چاروں طرف سے صرف ایک ہی آواز سنائی دیتی "خدا نہیں ہے" خدا نہیں ہے!!

میں نے اسے عقلی دلائل سے متاثر کرنے کے بجائے ایک مختلف طریقہ اختیار کیا جو فوراً اس کی سمجھ میں آگیا۔ میں نے جمعہ گل سے پوچھا کہ آیا اسے معلوم ہے خدا کے وجود کی نفی کا فلسفہ کس نے تخلیق کیا ہے؟ تو اس نے فوراً بتایا:

"مارکس، لینن اور سٹالین کوئی بھی خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا تھا"

میں نے پھر سوال کیا: "خدا کے انکار میں کیا لینن اور سٹالین کی حمایت کرنے والوں میں قازق مسلمان بھی شامل تھے؟"

جمعہ گل کہنے لگا: "قازقوں کو تو وہ اپنے قریب پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ انہوں نے تو قازقوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ وہ ہماری نسل کو مٹا دینا چاہتے تھے۔"

اب میں نے اسے سمجھایا کہ "ایسے بدترین دشمن مسلمانوں کے لیے کوئی مفید نظریہ یا فلسفہ کیسے پیش کر سکتے تھے۔ خدا کا انکار دراصل مسلم قوم کے ملی وجود کا انکار ہے۔ اور یہ قازق قوم کا تشخص اور وحدت ختم کرنے کی سازش ہے۔" میری اس بات کا جمعہ گل پر گہرا اثر ہوا۔ کہاں تو وہ خدا کا منکر تھا اور کہاں خدا کا ایسا قائل ہوا کہ دن رات کلمے کا ورد کرنے لگا۔ جس وقت بھی مجھ سے ملت، اس موضوع پر باتیں کرتا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ دوسروں کے سامنے مجھ سے زیادہ ربط و ضبط بڑھانے میں احتیاط کرے۔

وہ جوش جذبے کی شدت میں بعض اوقات ایسی باتیں کرنے لگتا جن سے



میں بھی پریشان ہو جاتا تھا۔ وہ کہتا تھا: ”میں قازقستان جا کر ایک ایک قازق کو بتاؤں گا کہ روسی تمہارے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ تم سے تمہارا وجود چھینا جا رہا ہے؛ ایک طرف جمعہ گل جیسے سادہ لوگ تھے تو دوسری طرف ایسے کٹر کمیونسٹ جو حکومت کی پروپیگنڈہ مشینری کے کل پرزے بنے ہوئے تھے۔ وہ غیر علمی انداز میں پچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو ”سچ“ ثابت کرتے تھے مثلاً میرا ایک روسی ہم جماعت جو ہمیشہ روس کو دنیا کی سب سے بڑی قوت ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا، ایک روز مجھے بتانے لگا کہ پچھلے برس اس کا خالہ زاد بھائی اٹلی گیا ہوا تھا۔ وہ ایک جنرل سٹور پر جوتے خریدنے کے لیے گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہاں روس کے بنے ہوئے خوبصورت جوتے فروخت ہو رہے ہیں۔ اس نے دکاندار سے پوچھا کہ آیا اس سے اچھے جوتے بھی مل سکتے ہیں تو جانتے ہو دکاندار نے کیا کہا؟ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا: ”دکاندار نے بتایا کہ دنیا کی بہترین مصنوعات روس میں تیار ہوتی ہیں۔“

میں نے کہا: ”مگر روسی طلبہ کو تو میں نے باہر کے بنے ہوئے جوتوں اور ملبوسات کا دیوانہ دیکھا ہے۔“

اس پر وہ کچھ جھینپا، لیکن پھر بات بنانے لگا: ”در اصل اچھی چیزیں دوسرے ممالک کو بھیج دی جاتی ہیں۔ ہم لوگ معمولی اشیاء پر قناعت کرتے ہیں۔ آخر دنیا میں کمیونزم نافذ کرنے کے لیے اتنا ایشیا تو کرنا ہو گا۔“

کلخوز میں جب ہم جگہ کی تنگی اور غسل خانے کی عدم موجودگی کا شکوہ کرتے تو ہمارے روسی استاد پُرانے دور کے ڈکھڑے لے بیٹھتے کہ کس طرح جنگ کے بعد ان کے خاندان کے چودہ افراد ایک چھوٹے سے کمرے کے فرش پر سوتے تھے۔ ان میں نوجوان لڑکیاں اور لڑکے بھی تھے۔ وہ کہتے: ”تم خوش نصیب ہو



کہ تم نے جنگ نہیں دیکھی اور قحط اور غربت کو نہیں دیکھا۔

## فارم پر ہمارا کام

اجتماعی کاشت کاری کے اس فارم پر ہمیں سیب چننے کا کام سونپا گیا۔ سیب کے باغات ہماری قیام گاہ سے دو کلومیٹر دور تھے۔ کلخوز کے سربراہ نے ہمیں بتا دیا کہ دن کے چھ گھنٹے کام کرنا ہو گا۔ کام کے اوقات دن کے آٹھ بجے سے بارہ بجے تک اور پھر تین بجے سے پانچ بجے تک تھے۔ ہر طالب علم کو یومیہ دس کریٹ سیب اکٹھے کرنے تھے۔ سیب توڑنے اور کریٹوں میں بھرنے کا طریقہ یہ بتایا گیا کہ ایک ایک کریٹ کے نہایت احتیاط سے سیب توڑے جائیں۔ شاخوں کو ہلا کر سیب زمین پر گرانے کی سختی سے تنبیہ کی گئی۔ یہ بھی کہا گیا کہ معیار کے مطابق پھلوں کی درجہ بندی کی جائے تاکہ اچھے سیب فروخت کرنے اور ذخیرہ کرنے کے لیے الگ کر لیے جائیں اور دوسرے درجے کے شراب کے کارخانوں میں بھجوائے جاسکیں۔

میں نے ساری ہدایات ذہن میں اچھی طرح بٹھالی تھیں، لیکن کام شروع ہوا تو منظر مختلف تھا۔ لڑکیاں دن بھر گیت گاتیں اور ناچتیں، شام ہونے لگتی تو شاخوں کو جھٹکے دے کر سارے پھل زمین پر گر کر تمام کریٹ چند منٹوں میں بھر دیے جاتے۔ پھر ان کریٹوں کو اپنی مرضی سے دو درجوں میں تقسیم کر دیتیں۔ ایک حصے کو قسم اول اور دوسرے کو قسم دوم کا نام دے دیا جاتا تھا۔ شام کو ٹرک آکر دونوں اقسام کے کریٹوں کو بھر کر لے جاتا تھا۔ ہم سے کسی نے ایک مرتبہ بھی یہ نہ پوچھا کہ تم سیب کس طرح چنتے اور درجوں میں تقسیم کرتے ہو؟



## ٹرک ڈرائیور کی جرات

سیب لے جانے کے لیے جو ٹرک ڈرائیور باغ میں آتا تھا، بہت عجیب و غریب شخص تھا۔ اکثر شراب میں دھت اور وہی تباہی بکتا رہتا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے عام طور پر وہ بڑی چابکدستی کا مظاہرہ کرتا تھا، لیکن ایک روز شراب کے کارخانے میں سیب پہنچا کر آنے لگا تو شاید کچھ زیادہ ہی چڑھا آیا۔ گاڑی کو مقررہ جگہ روکنے کے بجائے اس طرف بڑھالے گیا جہاں سیبوں کے کریٹ پڑے تھے۔ ہم نے چیخ و پکار کی، اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ٹرک روکا، کھڑکی سے سر باہر نکالا اور غصے سے دیکھتے ہوئے بولا:

”کیا بات ہے۔ کون کچلا گیا؟“

میں نے بتایا کہ سیبوں کے کم از کم بیس کریٹ کچلے جا چکے ہیں اور اگر اس نے مزید آگے جانے کی کوشش کی تو کچھ باقی نہ بچے گا۔ میری بات سن کر اس نے حقارت سے اپنا ہاتھ فضا میں ہلاتے ہوئے کہا: ”تو کیا ہوا۔ جب میں ڈرائیونگ کروں گا تو کریٹ تو ضرور ٹوٹیں گے۔“

اس کے بعد وہ ٹرک سے اترا اور سیدھا میری طرف آیا۔ مجھے فہمائش کرتے ہوئے کہنے لگا، ”تم غیر ملکی ہو اس لیے تمہیں روس کے ہارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔“ مزید اطمینان دلانے کے لیے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: ”میں نے تو صرف بیس کریٹ خراب کیے ہیں تم ذرا کلخوز کے سربراہ اور دوسرے اعلیٰ افسروں کا حال تو پوچھو۔ جنہوں نے سارا ملک تباہ کر کے رکھ دیا ہے، مگر کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں ہے۔ صبح سے شام تک وہ ذاتی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم تو پھر بھی اچھے ہیں کہ اجتماعی کام



میں ہی تو مصروف ہیں۔“

ڈرائیور نے بتایا کہ اسے صرف ایک سو روپل تنخواہ ملتی ہے اور کلخوز کے ناظم کے یومیہ ذاتی اخراجات ایک سو روپل سے کہیں زیادہ ہیں۔ میں یہاں ایک بوڑھی عورت کے ہمراہ کرائے کے ایک کمرے میں رہتا ہوں، جبکہ اسے عظیم الشان محلے رہائش کے لیے مفت ملا ہوا ہے۔ کاش میں بھی کسی کلخوز کا ناظم ہوتا۔ پھر کوئی مجھ سے کوئی شکایت نہ کرتا۔ ٹرک ڈرائیور کا نشہ کچھ زیادہ تیز ہو گیا تو اس نے زور زور سے چلا کر باتیں کرنی شروع کر دیں۔ شراب نے اس کے اندرونی اضطراب کا بھانڈا پھوٹ دیا۔ ”کلخوز کا ناظم عیش کرتا ہے اور میرے بچے بھوکے مرتے ہیں۔ اس کے پاس اعلیٰ حکام کو پیش کرنے کے لیے قیمتی تحفے ہیں۔ میرے پاس کیا ہے۔ میں کسی کو کیا دے سکتا ہوں۔ میں شراب پیتا ہوں، اس لیے کہ اپنے غم بھلا سکوں۔ شراب نہ پیوں تو غم سے مر جاؤں۔“

اس وقت کلخوز میں پچیس سے زیادہ افراد تھے۔ ڈرائیور ہوش میں ہوتا تو شاید اسے اتنی باتیں کرنے کی جرأت نہ ہوتی، لیکن نشے کی شدت نے اس سے ہوش و حواس چھین رکھے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا: ”اسی روپل کے لیے میں برٹریف زندہ باؤ نہیں کہہ سکتا۔ اس کلخوز میں ہے کیا؟ جہاں میں رہتا ہوں وہاں بجلی ہے نہ پانی، مگر ریڈیو پر برٹریف کی آواز گونجتی ہے، ہمارا ملک خوشحال ہو گیا ہے، وہ یہاں آکر دیکھیں تو انہیں اپنے ملک کی خوش حالی کا پتہ چلے۔“

بڑی مشکل سے ہم نے ڈرائیور کو چپ کرایا۔ ٹوٹے ہوئے کریٹ ٹرک کے نیچے سے نکالے اور چونچ رہے تھے وہ ٹرک پر لا کر اسے رخصت کیا۔ بعد میں ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ ٹرک ڈرائیور کو اس جرم کی کیا سزا ملی۔ غالباً کسی کو اس واقعے کی خبر نہ ہوئی ہوگی۔



## یہ تو ہم جیسا ہے

ہر سہفتے کے اختتام پر ہمیں ایک چھٹی ملتی تھی۔ اس روز ہمارے گروپ کے طلبہ اور طالبات مختلف علاقوں میں سیر و تفریح اور پکنکس مناتے۔ ایک چھٹی ہم نے قریب کی خوش منظر جھیل کے کنارے گزاری۔ یہ خالصتہً دیہاتی علاقہ تھا۔ لوگ ہلکے ملک کی طرح سادہ، غریب اور جفاکش نظر آتے تھے۔ یہ منظر روس کے شہروں سے بالکل مختلف تھا۔ مکانات کچے، گلیاں کچی اور کھیتوں سے گزرنے والی سڑکیں کچی، غرضیکہ ہر منظر ہمارے اپنے ملک کے دیہات سے بے حد مشابہ تھا۔

اسی روز دوپہر کو میری ملاقات ایک اُدھیٹر مہر کاشت کار سے ہوئی۔ میرے گروپ کی چند لڑکیاں اسے میرے ساتھ ملانے لائی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ صاحب یہ سن کر کہ میں غیر ملکی ہوں، بڑی دُور سے مجھے دیکھنے آئے ہیں۔ ہاتھ ملانے کے بعد وہ میرے سامنے زمین پر بیٹھ گئے اور مجھے یوں گھور گھور کر دیکھنے لگے جیسے میں انسان نہیں کوئی عجیب سا جانور ہوں اور وہ یہ دیکھ رہے ہوں کہ میرے سینک اور دم کہاں ہیں۔ کافی دیر تک۔۔ دیکھنے کے بعد وہ میری ساتھی لڑکیوں سے مخاطب ہوئے: ”یہ تو بالکل ہم جیسا ہے۔ ہماری طرح کا جسم، سر، ہاتھ، پاؤں بوڑے مولو، کیا یہ بات چیت کر سکتا ہے؟“

لڑکیوں نے بتایا کہ ”نہ صرف بات چیت کر سکتا ہے، بلکہ روسی بھی بول لیتا ہے۔ اس پر وہ صاحب بولے: ”تو ایسا کہو کہ یہ بھی روسی ہے۔“

ہم سب اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔ ہمارے استاد کو مذاق سوجھا، تو وہ کہنے لگے: ”نہیں بھئی یہ ہم جیسا ہرگز نہیں۔ یہ ایک ایسی مخلوق ہے جو دن میں پانچ مرتبہ دیوانوں کی طرح کبھی سر زمین پر رکھتی اور کبھی اٹھا لیتی ہے۔ یہ کہتا ہے میں



خدا کی عبادت کر رہا ہوں“

پتہ چلا کہ روس کے دیہات میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے ماحول سے باہر کبھی نہیں نکلتے انہیں یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ روس کتنا بڑا ملک ہے۔ بعض طالب علم بتاتے تھے کہ ان کے والدین نے ابھی تک ریل گاڑی نہیں دیکھی۔

## جمعہ گل کی ”اجل“ آگئی

سہ پہر کو کام کرنے کے بعد ہمارے ساتھی شراب کشید کرنے کے کارخانے جاتے وہاں سے پوری بالٹی بھر کر شراب ساتھ لے آتے۔ رات بھر شراب پانی کچے طرح پی جاتی۔ شراب کے نشے میں لڑکے اور لڑکیاں جانوروں سے بدتر دکھائی دیتے۔ جو کچھ ان کے منہ میں آتا بے دھڑک کہہ جاتے۔ کبھی چیختے چلاتے۔ ایک رات میں تنہا کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ میرے کانوں میں شور و غل کی آواز آئی۔ باہر نکلا، کلب کے دروازے پر شرابی لڑکے اور لڑکیاں نشے میں دھت اُلجھے ہوئے تھے۔ استاد محترم زازولینن اپنے ہونہار شاگردوں کی کارکردگی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

زازولینن کی مجھ پر نظر پڑی تو ہنستے ہوئے میری طرف آئے۔ میرا ہاتھ تقاما اور اپنے ساتھ باہر چلنے کے لیے کہا۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑی ہی دور ایک کھیت سے نسوانی قہقہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہم قریب گئے تو معلوم ہوا کہ دولڑکیوں نے جمعہ گل کو کھیت میں لٹا رکھا ہے۔ وہ اسے لباس سے بے نیاز کر چکی تھیں اور اب گدگداری تھیں۔ اس کو ہنستے دیکھ کر ہماری بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ مجھے جمعہ گل کی وہ بات یاد آگئی۔ اس نے کہا تھا یہ لڑکیاں مجھے مار ڈالیں گی۔ وہ اسے واقعی مارے ڈال رہی تھیں۔ آدمی کی شرم دجیا اور غیرت مرجائے تو کیا باقی رہتا ہے۔ زازولینن صاحب نے بھی یہی کہا: ”آخر جمعہ گل کی ”اجل“ آہی گئی!“



پھر وہ لڑکیوں کو کچھ فہمائشی کچھ فرمائشی انداز میں ڈانٹ پلاتے ہوئے کہنے لگے۔  
 ”تم اس بے چارے کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟“

لڑکیوں نے ہماری مداخلت کا برا منائے بغیر کہا: ”جمعہ گل ہم دونوں کا مشترکہ  
 گھر والا ہے۔“

میرا خیال تھا جمعہ گل اس صورت حال پر احتجاج کرے گا، کم از کم وہ مجھے فرد  
 مدد کے لیے پکارے گا، لیکن وہ بھی شراب کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ استاد صاحب  
 اس منظر سے مزید لطف اندوز ہونا چاہتے تھے، مگر میں اس تماشے کا مزید متحمل نہ تھا۔  
 ہم انہیں اسی حال میں چھوڑ کر وہاں سے چلے گئے۔ شراب کی فراوانی نے کلغوز میں  
 کئی گل کھلائے مگر میں یہاں صرف ایک اور واقعے کا ذکر کروں گا۔

### اچھے شوہر کی تلاش

اس روز پردگرام بنایا گیا کہ قیام گاہ کے باہر الاؤ روشن کیا جائے اور مکی کے  
 بھٹے بھون کر کھائے جائیں۔ اس پردگرام میں مجھے بھی شریک ہونا پڑا۔ بھٹے بھونے  
 گئے تو یار لوگوں نے مزہ دو بالا کرنے کے لیے شراب کے جام بھی اٹھالیے۔  
 لڑکیاں گیت گانے لگیں۔ کچھ دیر محفلِ رقص جمی۔ آخر میں گپ شپ کا دور ہوا۔ شادی  
 بیاہ کا مسئلہ چھڑا تو لڑکیاں اپنے پسندیدہ موضوع پر آگئیں۔ سبھی کو شکایت تھی کہ ردا  
 میں موزوں شوہر کا انتخاب مشکل کام ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ ہر ایک کی پسند جدا تھی  
 لیکن امریکی شوہر سب کا آئیڈیل تھا۔ جب ایک لڑکی نے کہا: ”کاش میرا شوہر امریکی  
 ہو۔“ تو اکثر لڑکیاں سسکاریاں بھرنے لگیں۔

امریکہ سے دوسرے درجے میں کینیڈا اور جاپان کا ذکر کیا گیا، لیکن چین اور  
 جرمنی کے نام پر بھی نے ناگواری ظاہر کی۔ اس گفتگو کے دوران میں شراب کا جادو



سرچڑھ کر بولتا رہا۔ ایک لڑکی نے کسی کیونٹ ملک کا نام لیا تو سب نے حقارت سے منہ بنالیے۔ ایک لڑکی نے تجویز پیش کی، ہماری یونیورسٹی میں بہت سے غیر ملکی لڑکے پڑھتے ہیں کیوں نہ ان میں سے اچھے شوہر پسند کر لیے جائیں!

اس تجویز پر سب نے صا د کیا، لیکن اس میں مشکل یہ تھی کہ کوئی امریکی طالب علم یونیورسٹی میں موجود نہ تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ حاضر مال پر ہی گزارا کر لیا جائے۔ اس وقت ایک لڑکی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”ذرا اس کی رائے تو لو یہ کس کا شوہر بننا پسند کرے گا؟“

اس پر سب نے واہ واہ کا شور مچایا۔ مجھ سے رائے لی گئی اور ساتھ ہی یہ پیش کش کر دی گئی کہ میں جس کا نام لوں گا وہ میری شریک حیات بننے پر خوشی سے آمادہ ہو جائے گی۔ میں ہوش میں تھا اس لیے انہیں صفائی سے ٹال گیا۔

### غسل خانے کا مسئلہ حل ہو گیا

کلخوز میں ہماری رہائش گاہ کے قریب ایک غسل خانہ بنایا گیا تھا جس کا ایک حصہ مردوں کے لیے اور دوسرا عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ نہانے کے لیے پانی ایک مخصوص وقت میں آتا تھا اس لیے طلبہ اور طالبات اکٹھے ہی غسل کر لیتے۔ مشترکہ طور پر ننگے ہو کر نہانا روس میں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ میرے لیے یہ بات بھی سخت تکلیف دہ تھی اس لیے پہلے ہفتے میں مجھے ایک بار بھی نہانے کا موقع نہ مل سکا لیکن جلد ہی میں نے اس مشکل کا حل ڈھونڈ نکالا۔

فارم میں کام کرتے ہوئے ہمیں خاصی مقدار میں سیب اور ٹماٹر دیے جاتے تھے۔ میں اپنا حصہ اکثر کلخوز میں رہنے والی ایک بوڑھی خاتون کو دے دیا کرتا تھا۔ یہ خاتون مجھ سے بڑی شفقت کا برتاؤ کرتی تھی۔ ایک روز میں نے اس سے



نہانے کی مشکل کا ذکر کیا تو اس نے بڑی خوشی سے پیش کش کی کہ وہ میرے لیے پانی گرم کر دیا کرے گی اور میں باپردہ جگہ پر غسل کر سکوں گا اور اس طرح میری مشکل حل ہو گئی۔

### اجتماعی کاشتکاری

روس میں کھیتی باڑی کے دو طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ ایک طریقے کے مطابق زمین حکومت کاشت کرتی ہے۔ کاشت کاروں کو کام کی اجرت دی جاتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ زمین کا ایک معین رقبہ چند کاشت کاروں کو ٹھیکے پر دے دیا جاتا ہے۔ پہلے طریقے میں کاشت کاروں کو بہت کم آمدنی ہوتی ہے۔ سردیوں میں ایکے اوسط درجے کے مزدور کی آمدنی چالیس روبل سے زیادہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس موسم میں پیداوار کم ہوتی ہے۔ اس لیے روسی کسان گرمیوں میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ سردیوں کے لیے پس انداز کر سکیں۔ آمدنی میں اضافے کے لیے وہ مختصر سا قطعہ زمین بھی خاصا مفید ثابت ہوتا ہے جس میں کسان اپنے لیے سبزیاں اگا سکتا ہے۔ بعض کسان سنور، بھیڑیں اور مرغیاں بھی پال لیتے ہیں۔

یوکرین کی زمین ہموار اور شاداب ہے۔ یہاں فصلیں بہت اچھی ہوتی ہیں اس لیے یہاں کے کاشت کار نسبتاً خوش حال ہیں۔ گندم، سورج مکھی اور مکی کے علاوہ ٹماٹر، آلو، اور کچا لو بڑی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔ پیاز بھی بہت ہوتی ہے، لیکن بازاروں میں پیاز کی قلت رہتی ہے۔ اس طرح پاک بھارت کی مقبول سبزی ہے بڑی مقدار میں اگائی جاتی ہے، لیکن منڈیوں میں اکثر ہوش ربا حد تک مہنگی ہوتی ہے۔ چاول بھی خاصی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن بازاروں میں اعلیٰ قسم کے چاول کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ عمدہ چاول ماسکو اور لینن گراڈ کے شہریوں کے لیے مخصوص



ہیں۔ ملک کے دوسرے شہروں میں معمولی قسم کا چاول تول جاتا ہے، لیکن ایک وقت میں ایک کلو گرام سے زیادہ چاول خرید انہیں جاسکتا۔

### گوشت خوش نصیبوں کو ملتا ہے

گوشت روس میں ایک نایاب جنس ہے۔ شہروں میں مختلف سٹوروں پر گوشت کے خریداروں کی بھیڑ مگی رہتی ہے۔ بعض مقامات پر ہفتے میں ایک مرتبہ بھی گوشت کی شکل دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ چونکہ دیہات میں گوشت کی زیادہ قلت ہے اس لیے دیہات کے لوگ گوشت خریدنے شہروں میں آتے ہیں۔ جن لوگوں کو فریج کی سہولت حاصل ہے وہ موقع ملنے پر خاصی مقدار میں گوشت خرید کر ہفتوں محفوظ رکھتے ہیں۔

میں کسی سٹور پر خریداری کے لیے جاتا تو گوشت کی خریداری کے سلسلے میں عجیب و غریب مناظر دیکھنے میں آتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو دیکھا وہ خاصی مقدار میں گوشت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پیچھے سے کئی لوگوں نے اس پر آوازے کسے۔ ایک آواز آئی: ”کچھ تو ہمارے لیے بھی رہنے دو“ ایک دوسرے صاحب نے چلا کر کہا: ”اگر تمہارے پاس فریج ہے تو ہمارا حق نہ مارو۔ اگر تم نے سب کچھ خرید لیا، تو دوسرے کیا کھائیں گے؟“ مگر وہ صاحب آنکھیں جھکائے ہوئے ہمارے سامنے سے گزر گئے۔

بعض اوقات زیادہ مقدار میں گوشت خریدنے والوں کو گالیاں تک سننی پڑتی ہیں۔ جو لوگ ہفتے میں ایک سے زائد بار گوشت کھاتے ہیں لوگ ان کی خوش قسمتی کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

کلخوز سے واپسی پر دوسرے سال کی پڑھائی شروع ہوئی۔ تقریباً وہی سابقہ



مضامین تھے سوائے کیونسٹ پارٹی کی تاریخ کے۔ اس کے بجائے مارکسسٹ فلسفہ پڑھایا جانے لگا۔ کیونسٹ پارٹی کی تاریخ کی طرح فلسفہ بھی روسی طلبہ کے لیے اور تھا ہم غیر ملکیوں کے لیے اور۔ ہر سہفتے ایک گھنٹے کے لکچر کے علاوہ ایک گھنٹے کا میمنار ہوتا تھا۔ مادے کا روح پر تفوق، جدلی مادیت کے قوانین، فلسفہ مادیت کی تاریخ — یہ اور دوسرے موضوعات ہم انجینئرنگ کے طلبہ کے لیے بھول بھلیاں سے کم نہ تھے، لیکن ہمارے نصاب میں اصل زور اسی فلسفے پر دیا جاتا تھا۔

### فلسفے کی استاد سے بحث

مارکسی فلسفے کی استاد ایک غیر متعصب روسی خاتون تھیں۔ انہوں نے طلبہ پر اپنے نظریات کبھی جبراً اٹھونے کی کوشش نہیں کی۔ چونکہ یہ مضمون ہمارے لیے غیر دلچسپ تھا اس لیے وہ ہمیں زیادہ الجھاؤ میں ڈالے بغیر بطور خود عمیق مطالعے کی تاکید کرتیں اور اکثر اپنی پُر لطف باتوں سے خشک موضوعات میں چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ ایک روز لیکچر کے دوران میں جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں روح پر مادے کا تفوق کیسے ثابت کروں گا؟ تو میں نے کہا کہ مارکسسٹ مادے کی برتری ثابت کرنے کے لیے فلاں فلاں دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔

میری بات ختم ہوئی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا: "مارکسسٹوں کی بات چھوڑو، اس ضمن میں تمہارا اپنا کیسا نظریہ ہے؟"

میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا: "میں نظریاتی آدمی ہوں، مادے پر روح کو برتر اور فائق سمجھنے والا اس لیے مجھے مارکسی نظریات متاثر نہیں کر سکے۔"

میری یہ جسارت میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی، لیکن معلمہ نے میرے اختلاف کا برا نہ مانا، بلکہ یہ کہتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی: "میں ایسے طلبہ کو



پسند کرتی ہوں جو ہاں میں ہاں ملانے کے بجائے اپنی آزاد رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔“

ان کے اس مشفقانہ رویے نے مجھے ایسا حوصلہ دیا کہ میں اکثر مسائل پر ان سے الجھ پڑتا تھا اور وہ میری باتوں پر بھڑکنے کے بجائے کئی کترا جاتی تھیں۔ موضوع کو بدل کر کبھی موسم کا ذکر کرنے لگتیں اور کبھی مہنسی مذاق میں بات اڑا دیتیں۔

### الحاد کی تدریس

پہلے سمسٹر میں ہمیں مذہب کے خلاف برگشتہ کرنے کے لیے الحاد کے موضوع پر بھی لیکچر دیے گئے۔ ایسی فلمیں بھی دکھائی گئیں جن میں افسانوی روایات اور مفروضوں کے ذریعے یہ ”واضح“ کرنے کی کوشش کی جاتی کہ مذہب کی کوئی علمی اور سائنسی بنیاد نہیں ہے۔ لیکچر دینے والے استاد رٹے رٹائے اشتراکی نعروں کی مدد سے مذہب کو نیچا دکھانے کی سعی کرتے اور فلموں میں تشہیر کے جدید حربوں کے ذریعے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کیا جاتا۔ دنیا کے مختلف جاہلی معاشروں میں جتنے ادھام اور فرسودہ رسوم پائی جاتی ہیں ان کو بنیاد بنا کر کہا جاتا، دیکھو مذہب کے نام لیوا فال نکالتے، شگون لیتے اور دوسری فرضی اور افسانوی باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک فلم میں دکھایا گیا، مذہب پر یقین رکھنے والے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ زمین کو ایک بیل نے سینک پر اٹھا رکھا ہے۔ یہ بیل مچھلی کے ایک پر کے اوپر کھڑا ہے اور مچھلی ریت کے ٹیلے پر رہتی ہے وغیرہ۔ مذہب سے متعلق نظریات کی علمی انداز میں تردید کرنے کے بجائے تضحیک کا انداز اپنایا جاتا۔

اسی طرح جدید مادی نظریات کے حق میں بنی ہوئی فلمیں بھی دکھائی گئیں۔ ایک فلم میں ڈارون کے نظریہ ارتقا کو ثابت کرنے کی بھونڈی کوشش کی گئی۔ بند



کو انسان کا جدِ اعلیٰ قرار دیتے ہوئے بتایا گیا کہ بندہ کی دم اور بال زمین پر مسلسل گھسنے کی وجہ سے ختم ہو گئے اور وہ انسان کی شکل میں آگیا۔ یہ بھی دکھایا گیا کہ مارکس جیسا ترقی پسند مفکر بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان درحقیقت بندہ کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

مذہب سے نفرت دلانے کے لیے ایسی جنگوں کی کہانیوں پر فلمیں پیش کی گئیں جو مذہب کے نام پر لڑی گئیں۔ ان فلموں کا نتیجہ نکالا جاتا کہ مذہب دنیا میں انسان کو انسان سے لڑانے کے لیے وجود میں آیا ہے۔

عجیب بات یہ تھی کہ روسی طلبہ ایسی فلمیں دیکھ کر ہنستے اور ہم سے کہا کرتے تھے کہ یہ سب کچھ تمہیں مذہب سے متنفر کرنے کے لیے پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، ورنہ ان فلموں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لیکن ایسے غیر ملکی طلبہ جو پہلے سے الحاد زدہ تھے، یہ فلمیں بڑے شوق سے دیکھتے اور بعد میں ان میں پیش کیے گئے جھوٹے دلائل کے ذریعے مذہب پر تنقید کرتے تھے۔

### یوکرائن میں عیسائیت کے اثرات

یوکرائن میں عیسائیت کے اثرات موجود ہیں۔ اکثر شہروں میں کلیساؤں کی بڑی بڑی عمارتیں بھی ہیں۔ بعض دیہات میں گر جاگھر ہیں جہاں عیسائی باقاعدگی سے عبادت کے لیے جاتے ہیں۔ کیونسٹ عیسائیوں سے براہِ راست تعرض نہیں کرتے، اس لیے کہ ان کے نزدیک عیسائی مذہب سے اشتراکیت کو زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ کرسمس کے موقع پر گر جاگھروں میں بڑی رونق ہوتی ہے۔

زمانہ قدیم سے روسیوں میں ایک روایت چلی آرہی ہے کہ نوزائیدہ بچے کو کلیسا لے جایا جاتا ہے جہاں پادری اس کا نام رکھتا ہے۔ یہ رسم ابھی تک موجود ہے۔ مذہبی



تہواروں کے موقع پر عیسائی اپنے بزرگوں کی قبروں پر جاتے ہیں اور غذائی اشیاء اور نشہ آور مشروبات کے چڑھاوے چڑھائے جلتے ہیں۔ اب حکومت نے عیسائیوں کو ان کی مذہبی رسوم خصوصاً تہوار منانے سے روکنے کے لیے بعض ایسے اقدامات کیے ہیں جن سے عیسائی آبادی خاصی ناراض ہے۔ مثال کے طور پر کرسمس کے روز سرکاری طور پر "سوبوٹینک" کے نام سے ایک جبری پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ اس کے ماتحت تمام شہریوں کو ملکی مفاد کی خاطر بلا معاوضہ کام کرنا پڑتا ہے۔ زیادہ تر کام سماجی نوعیت کا ہوتا ہے۔ گلی کوچوں کی صفائی کی جاتی ہے۔ اس پروگرام میں تمام لوگوں کو لازماً شریک ہونا پڑتا ہے۔ اس طریقے سے عیسائیوں کو کلیسا جانے سے روکا جاتا ہے۔

روس کی مختلف یورپی ریاستوں مثلاً بیلاروس، یوکرین اور لٹوینا وغیرہ میں مغرب سے عیسائی لٹریچر آرہا ہے۔ مذہبی تعلیمات کی کتابیں اور رسائل خفیہ طریقے سے لوگوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سوئٹزرلینڈ کا ایک ریڈیو اسٹیشن رات بھر روسی زبان میں مذہبی پروگرام نشر کرتا ہے۔ روسی حکومت مذہبی لٹریچر کی سمگلنگ سے روکنے کے لیے خصوصی انتظامات کر رہی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے مذکورہ ریڈیو اسٹیشن کی نشریات جام کرنے کے لیے بھی ایک مستقل محکمہ قائم کیا گیا ہے جو پیراسائٹک امواج کے ذریعے بی بی سی، والٹس آف امریکہ اور دوسرے یورپی ریڈیو اسٹیشنوں کی نشریات میں خلل اندازی کرتا ہے۔ اس کے باوجود عوام میں مغربی ممالک کی ریڈیو نشریات بے حد مقبول ہیں۔ حکومت نے غیر ملکی نشریات سننے پر پابندی بھی عائد کر رکھی ہے، لیکن بہت کم ان پابندیوں کو خاطر میں لایا جاتا ہے۔

روس کے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسرے ذرائع ابلاغ عوام کے اذہان کے تپہ ہیر کے لیے رات دن پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ حکومت کی ہر پالیسی کی تعریف و



توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اور عوام کو ایسی کوئی بات نہیں بتائی جاتی جس سے وہ جدید دنیا کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے خبردار ہو سکیں۔ خصوصاً دیہات کے لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ باہر کی دنیا کے بارے میں قطعاً بے خبر ہیں۔ غیر ملکوں کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ بعض بوڑھے روسی مجھے دیہات میں چلتے پھرتے دیکھ کر حیرانی کا اظہار کرتے تھے کہ میں کیسے ان جیسے ہاتھ پاؤں رکھتا ہوں۔ خصوصاً بوڑھی عورتوں کو میں نے کئی بار اپنے بارے میں سرگوشیاں کرتے سنا۔ وہ مجھے دیکھتیں اور انہیں معلوم ہوتا کہ میں غیر ملکی ہوں، تو وہ عیسائیوں کے مخصوص انداز میں سینے پر کراس بناتیں اور کہتیں: ”ارے یہ تو ہو، ہو ہماری طرح کا ہے۔“

جن دنوں میں کلخوز میں تھا، ہماری طعام گاہ میں بعض بوڑھی عورتیں کھانا پکانے پر متعین تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر زیادہ حیرت کا اظہار تو نہ کیا کہ وہ پہلے بھی غیر ملکی طلبہ کو دیکھ چکی تھیں، لیکن جب میں نے سُور کا گوشت کھانے سے انکار کیا، تو وہ بہت حیران ہوئیں۔ وہ بار بار اصرار کرتی تھیں، مگر جب میں انہیں بتاتا کہ مجھے ڈاکٹر نے شراب پینے اور سُور کا گوشت کھانے سے منع کر رکھا ہے تو سر ہلا کر ایک دوسری کو مخصوص انداز میں دیکھتیں اور پھر سرگوشی میں کہتیں: ”یہ کیسے سُور کا گوشت کھائے، غیر ملکی جو ہوا۔“

### غیر ملکوں سے روالبط پر پابندی

روس کے دیہات میں لوگوں میں وضع داری اور مہمان نوازی کی پرانی قدریں موجود ہیں۔ اگرچہ حکومت نے لوگوں کو سختی سے منع کر رکھا ہے کہ غیر ملکوں سے کوئی ربط و ضبط نہ رکھیں، لیکن ہم جہاں بھی گئے عام لوگوں نے ہمارے ساتھ بڑے



خلوص کا ہر تاؤ کیا شہری لوگ اگرچہ ایسے دیے رہتے ہیں اور مادہ پرستی کے ماحول نے ان میں بُوئے و فاختم کر دی ہے، لیکن قریب جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر بے جتنی کے لبادے میں لپٹے ہوئے لوگ بھی اندر سے اتنے بے حس نہیں ہیں۔ وہ ایسا بہرہ وپ اس لیے بنائے رہتے ہیں کہ حکومت ان کے چال چلن پر شبہ نہ کرے۔ روسی طلبہ جو ہمارے ساتھ ہاسٹلوں میں رہتے تھے، ظاہراً ہم سے کچھے کچھے رہنے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ انہیں سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ غیر ملکیوں سے دور رہیں۔ ہمارے ایک غیر ملکی طالب علم دوست جو روسی لڑکیوں میں خاصے مقبول تھے اور اکثر اپنے معرکوں کی داستانیں سنایا کرتے تھے، انہوں نے ایک مرتبہ بتایا کہ ان کی ایک دوست ایک مقامی کارخانے میں کام کرتی ہے۔ وہ اس کی محبت اور اخلاص کی بہت تعریفیں کرتے تھے، لیکن یہ دوستی اور اخلاص زیادہ دیر نہ چل سکا۔ کارخانے کی انتظامیہ نے لڑکی کو نوٹس دے دیا کہ جو بیس گھنٹے کے اندر اندر مذکورہ طالب علم سے ہر قسم کے روابط ختم کر لے یا پھر نوکری سے نکالے جانے کے لیے تیار رہے۔

### ابھی انقلاب مکمل نہیں ہوا

کیونٹ انقلاب سے پہلے بھی روس میں شخصی آزادیاں معدوم تھیں۔ انسانوں کی غلامی کا باقاعدہ قانون موجود تھا جسے "کریپٹنی پراوا" کہا جاتا تھا۔ امراء غریب لوگوں کا استحصال کرتے اور بڑے بڑے جاگیردار اور خوانین اپنے محکوموں سے بدتر سلوک کرتے تھے۔ اب حالات بظاہر تبدیل ہو چکے ہیں۔ جاگیرداروں اور خوانین کا دور لد چکا ہے، مگر روسی نئی صورت حال سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ غلامی کا دور ابھی باقی ہے "کریپٹنی پراوا" کی رسم آج بھی زندہ ہے۔ پہلے ایک آقا ہوتا تھا جو چند غلاموں کا مالک ہوتا تھا اب کئی ہزار آقا ہیں جو پچیس کروڑ



روسیوں کی قسمتوں کے مالک و مختار ہیں۔ ان آقاؤں میں پارٹی کے ارکان، اعلیٰ افسر اور مختلف اداروں کے سربراہان شامل ہیں۔

جو لوگ کمیونزم پر اعتقاد رکھتے ہیں ان کا خیال ہے ابھی روسی معاشرہ ناپختگی کے دور سے گزر رہا ہے۔ بورژوائیت کے آثار پوری طرح نہیں مٹے۔ ان کی خوش فہمی کا یہ حال ہے کہ روس میں کمیونسٹ انقلاب کی ”تکمیل“ کے ابھی تک منتظر ہیں۔ کہتے ہیں کہ ساٹھ برس گزر جانے کے باوجود معاشرہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے گرفت سے نہیں نکل سکا۔

ہمارے کچھ جوشیلے طالب علم ساتھی اکثر سرد آہ بھر کر کہتے تھے کہ جس روز روس میں صحیح معنوں میں سوشلزم آجائے گا، اس روز انسان کی انسان پر حکومت ختم ہو جائے گی اور آزادیوں پر کوئی قدغن باقی نہ رہے گی۔

### دانشور طبقے کی حقیقت پسندی

معاشرے کا دانشور طبقہ خاصا حقیقت پسند ہے۔ خصوصاً یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ مگنی پٹی نہیں رکھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس روز افراد کی آزادی بحال کر دی گئی روس کے عوام کمیونزم سے منحرف ہو جائیں گے۔ ہمارے اساتذہ اپنے لیکچرز کے دوران میں بے لفظوں میں حکومت کی تعلیمی پالیسی پر بھی تنقید کرتے تھے۔ کم از کم اس بات پر بھی متفق تھے کہ روس میں علوم کو پابند سلاسل کر دیا گیا ہے۔ ایک بوڑھے پروفیسر نے ایک روز ہم غیر ملکی طلبہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا :

”روس میں علم پر سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ اسے مرضی کے مطابق

مخصوص نتائج حاصل کرنے کا آلہ کار بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ علم کو اجتماعی زندگی اور سیاسی مستقبل کی راہیں متعین کرنی چاہئیں، نہ کہ سیاست کار



علم کے راستے اور مستقبل کی نشاندہی کریں۔“

اس حقیقت کو مثال دیتے ہوئے انہوں نے یوں واضح کیا : ”روس میں فلسفے کے علم پر یہ پابندی ہے کہ وہ الحاد کی تصدیق کرے اور اس کے برعکس کسی امکانی صداقت کی کبھی جستجو نہ کرے۔ اب اگر انسان کسی دوسری جہت کا سراغ لگا بھی لے تو روس کا فلسفہ اسے تسلیم نہیں کرتا۔ باقی علوم میں بھی اس صفت کا پایا جانا امر لازم ہے جس علم کی کسی شاخ نے اپنی متعینہ حدود سے تجاوز کیا، اسے بطور سزا جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔“

کئی اساتذہ مذہب کی طرف میلان رکھتے تھے۔ ہمارے حروف حریکات کے استاد نے ایک دن مشاورتی تدریس کے دوران میں مجھ سے کہا :

”کیونٹ چاہتے ہیں کہ انتھروپنی کے قاعدے کی رُو سے یہ بات ثابت کریں کہ یہ کائنات خود بخود وجود میں آئی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اسی قانون کی مدد سے یہ بات پہلے ہی ثابت کی جا چکی ہے کہ یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آئی۔“



## چھٹا باب

### کوئی چارہ ساز ہوتا

روس میں چھ سالہ قیام کے دوران کئی روسی طلبہ سے میری نشست و برخاست رہی۔ ان میں سے اکثر سے میرے تعلقات خاصے بے تکلفانہ رہے، لیکن اتنے عرصے میں کسی سے مضبوط دوستی کا رشتہ قائم نہ کر سکا۔ حالانکہ وطن سے دور ہر شخص کی طرح میری بھی فطری خواہش تھی کہ کوئی ایسا شخص ہو جسے میں اپنا ہمدرد سمجھوں، لیکن میری یہ آرزو نشنہ ہی رہی۔

روسیوں کا برتاؤ عارضی ہوتا ہے۔ جن دنوں چھٹی پر کابل جانے کی تیاری کرتا رہا طالب علم پر دانوں کی طرح میرے گرد منڈلانے لگتے۔ میری طرح طرح خاطر داریاں ہوتیں اور محبتیں جتنائی جاتیں پھر محبت سے ڈوبے لہجے میں غیر ملکی چیزیں لانے کی فرمائشیں کی جاتیں لیکن جب ضرورت پوری ہو جاتی تو ان کا رویہ ایسا سرد ہو جاتا جیسے کبھی ملاقات نہ رہی ہو۔

غیر ملکیوں کو روس میں یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ مخصوص سٹوروں پر امریکی ڈالر ادا کر کے غیر ملکی اشیاء خرید سکتے ہیں۔ ان سٹوروں میں قیمتیں بھی مناسب ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک جاپانی چھتری جو ان سٹوروں میں چھ روپل (آٹھ ڈالر) میں مل جاتی تھی،



ایک مارکیٹ میں اس کی قیمت پچاس روپے سے کم نہیں تھی۔ بعض طلبہ کو جب سامانِ اُرش  
اور پیونز کی ضرورت پیش آتی تو بڑے مسکین لمبے میں ہم سے درخواست کرتے کہ ہم ان  
کے لیے فلاں فلاں چیز خرید لائیں۔

میرے پاس جب بھی کوئی طالب علم ایسی غرض لے کر آتا تو میں اسے ٹانے کے  
پے مختلف طریقوں سے کام لیتا۔ کبھی مصروفیت کا بہانہ کرتا، کبھی طبیعت کی خرابی  
کا، اگر ان کے عاجزانہ اندازِ تکلم سے مجبور ہو جاتا تھا۔ کئی لڑکوں سے میں نے کہا وہ  
اپنے ملک کی مصنوعات کیوں استعمال نہیں کرتے؟ تو وہ کہتے تھے کہ روس کی بنی  
ہوئی چیزوں کا معیار ناقص ہے۔ اس موقع پر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے  
لیے وہ مختلف چیزیں دکھاتے کہ دیکھو یہ جوتے کی پالش ہے۔ پانی میں رنگ ملا ہوا  
یشمپو ہے یا بدبو دار اور بے رنگ تیل۔ بعض لڑکے کہتے تھے کہ روس کے بنے ہوئے  
یشمپو کے باقاعدہ استعمال سے آدمی گنجا ہو جاتا ہے۔ یہی رائے جام، کریم، پوڈر،  
شیونگ، بلیڈ، لپ شک اور اُرش کی دوسری چیزوں کے بارے میں ظاہر کی جاتی۔

### ذوقِ سلیم سے محرومی

اچھی چیزوں کی نایابی نے لوگوں کے ذوقِ سلیم کو بے حد متاثر کیا ہے۔ بعض  
طلبہ ہمارے پاس کوئی انوکھی چیز دیکھتے تو اس کے بارے میں اپنی علمیت کا اظہار ایسے  
انداز میں کرتے کہ حیرت ہوتی۔ جس ملک کے پڑھے لکھے نوجوانوں کی یہ کیفیت ہو  
اس کے اُن پڑھ اور پس ماندہ لوگوں کا کیا حال ہو گا! اس ضمن میں دو دلچسپ واقعات  
پیش کر رہا ہوں :

۱۔ ایک دفعہ ہمارا ایک صومالی طالب علم دوست چیکو سلواکیہ کی بنی ہوئی چہرے  
کی کولر کریم کی چند شیشیاں خرید کر لایا۔ یہ کریم ابھی ابھی بازار میں پہنچی تھی اور روسی طلبہ کے



یہ نئی چیز تھی۔ ایک روسی طالب علم نے کریم دیکھی تو اس کے منہ میں پانی بھرا آیا۔  
 بڑے ملتجیانہ لہجے میں کہنے لگا۔ بھئی ذرا چکھانا تو! ہم نے اسے بتایا کہ یہ کھانے کی  
 چیز نہیں ہے اس نے شیشی پر رکھی ہوئی روسی زبان میں عبارت پڑھ کر بتایا کہ یہ کھانے  
 کی کریم ہے۔ عبارت یہ تھی :

”یہ اطمینان بخش اور حیات آفریں کریم ہے“

اس فقرے سے اُس نے یہ غلط مطلب نکالا کہ شاید یہ کوئی کھانے کی چیز ہے۔  
 ہم نے لاکھ سمجھایا کہ یہ چہرے کو ملائم اور خوشبودار رکھنے کی کریم ہے، مگر وہ اسے  
 چکھنے پر بضد رہا، چنانچہ ہمارا روسی دوست کریم کا ایک لقمہ نوش جان کر کے ہی رہا۔  
 ہم نے پوچھا کریم کا ذائقہ کیسا ہے؟ کہنے لگا :

”بھئی کیا کہنے اس کے۔ نہایت خوش ذائقہ چیز ہے“

۲۔ دوسرا واقعہ بھی کم دلچسپ نہیں۔ ایک روز میں اپنے جوتے پالش کرنا  
 چاہتا تھا۔ میرے پاس کیوی لائٹ برلڈن بوٹ پالش کی ڈبیا تھی۔ ابھی میں نے ڈبیا  
 کھولی ہی تھی کہ ایک روسی طالب علم میرے کمرے میں داخل ہوا۔ پالش کی ڈبیا ہاتھ میں لے  
 کر پوچھنے لگا کہ یہ کیا چیز ہے؟ میں نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ میرا ساتھی افغان طالب علم  
 بول اٹھا: ”بہتر ہوگا کہ تم اس کے بارے میں کچھ نہ پوچھو ورنہ تم اس کے حصول کی  
 کوشش شروع کر دو گے اور یہ ہے اتنی قیمتی چیز کہ ہر کس و ناکس اسے خرید نہیں  
 سکتا“

روسی طالب علم کا تجسس بڑھا تو اس نے مجھ سے پوچھا: ”سچ بتاؤ یہ کیا  
 چیز ہے، اور اس کی قیمت کتنی ہے؟“

افغان طالب علم نے میرے جواب سے — پہلے ہی پالش روسی طالب علم کے  
 ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا: ”اس سے کیا پوچھتے ہو۔ یہ تو میری چیز ہے۔ نیویارک سے



میرے ایک دوست نے بھیجی ہے۔ رنگ سرخ کرنے کی کریم ہے۔ مہنگی اتنی زیادہ ہے کہ صرف کر ڈرتی لوگ ہی اسے خرید سکتے ہیں۔“

اب تو روسی طالب علم کا اشتیاق حد سے بڑھ گیا۔ ہم سے التجائیں کرنے لگا کہ اسے استعمال کے لیے تھوڑی سی ”کریم“ دے دیں۔ اور ہم نے خاصے اصرار کے بعد تھوڑی سی پالش اسے دے دی اور وہ دن بھر منہ لال کیے ہاسٹل میں پھرتا رہا۔ لوگ اس پر ہنستے تھے اور وہ انہیں فخریہ بتاتا تھا کہ یہ رنگ سرخ کرنے کی کریم ہے اور نیو بارک سے اس کے دوست نے اس کے لیے بھیجی ہے۔ بعد میں اس نے کئی بار ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کریم کے ایک بار استعمال سے ہی اس کا چہرہ بہت تروتازہ ہو گیا ہے۔ کئی اور لوگوں سے بھی اس نے اس حُسن بخش کریم کی تعریفیں کیں۔

### ایک روسی گھرانے سے ملاقات

جن دنوں میں ہسپتال میں تھا ایک روسی نوجوان بھی وہاں داخل تھا۔ اس کا نام یوکوف تھا۔ وہ اکثر میرے قریب آنے کی کوشش کرتا اور کہتا کہ جب میرے ہسپتال سے فارغ ہو جاؤں گا تو وہ مجھے اپنے گھر لے جائے گا۔ کسی روسی خاندان کو قریب سے دیکھنا میری پرانی آرزو تھی۔ اس لیے میں نے بھی وعدہ کر لیا کہ کم از کم ایک بار میں اس کے گھر ضرور جاؤں گا۔ میں ابھی ہسپتال میں تھا کہ اسے چھٹی مل گئی۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے اپنا وعدہ یاد دلایا۔ جس روز میں ہسپتال سے جانے کی تیاری کر رہا تھا یوکوف ہسپتال میں آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ آج مجھے چھٹی مل گئی ہے۔ یوکوف نے اصرار کیا کہ میں ہاسٹل جانے سے پہلے اس کے ہال چلوں۔ میں ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھا۔ بخوشی اس کی دعوت قبول کر لی۔



مختصر سے گھر میں خاندان کے تمام افراد موجود تھے۔ سب نے مجھے پُرجوش انداز میں خوش آمدید کہا۔ ڈرائنگ روم میں ان سب نے مجھے گھیر کر سوالات کیے جو چھاڑ کر دی۔ کھڑکیوں کے پردے گرا دیے گئے تھے، تاکہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ یو کوف کا گھر انہ ایک غیر ملکی طالب علم کی میزبانی میں مصروف ہے۔ میں اس ماحول میں کچھ پریشان سا ہو گیا تھا، مگر ان کی نگاہوں سے اخلاص ٹپک رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ روسی معاشرت کے بارے میں کچھ معلوم کروں مگر مجھے اس کی مہلت نہ مل سکی۔ گھر کے تمام افراد میرے گرد جمع تھے اور وہ مجھ سے باری باری انٹرویو لے رہے تھے۔

”تمہارے ماں باپ کیا کام کرتے ہیں؟ گھر شہر میں ہے یا دیہات میں؟ تمہاری ماہوار آمدنی کتنی ہے؟ یہاں کتنے روپل ماہانہ وظیفہ ملتا ہے۔ بھائی بہنوں کی تعداد کتنی ہے۔ تمہاری ذاتی باغ تو ہوگا؟“

آخر میں سوالات کی نوعیت قدرے مختلف ہو گئی۔ ”یہ کپڑے کہاں سے خریدے ہیں؟“

”بہت خوبصورت کپڑا ہے۔ کتنے روپل فی گز آتا ہے؟“

”کیا آپ مہربانی فرما کر ہمارے لیے اس قسم کا کپڑا مہیا کر سکیں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔“

### معلم خاتون کی آپ بیتی

گھر کی سربراہ ایک معلم خاتون تھیں۔ ان کی جوانی کے ایام جنگ کے دور میں گزرے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ آیا افغانستان بھی دوسری عالمی جنگ کا نشانہ بنا تھا؟ میرا جواب نفی میں سن کر انہیں تعجب ہوا۔ کہنے لگیں ”جیرانی ہے، کیا دنیا



میں کوئی خطہ ایسا بھی تھا جہاں جرموں نے تاخت و تاراج نہیں کی؟ اس کے بعد انہوں نے جنگ کے مصائب کی روداد چھیڑ دی کہ کس طرح شدید سردی کے دنوں میں لوگ بھوک سے مر رہے تھے۔ جرمین فوجیں بستیوں میں گھس کر لوگوں کا قتل عام کرتی تھیں۔ خاتون کا جواں سال بھائی بھی جرمینوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ ان کا خاندان شدید مالی مشکلات میں گھر گیا تھا انہوں نے آیام غم کی روداد سناتے ہوئے کہا :

”یہ جنگ میرے لیے زندگی کا سب سے بڑا المیہ لے کر آئی۔ تم جیسا خوبصورت اور کڑیل جوان بھی اس کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے جلتے تھے۔ وہ جتنا حسین تھا اس سے زیادہ خوبصورت باتیں کیا کرتا تھا۔ پھر اسے محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ پانچ ماہ تک اس کے پیارے خط میری ڈھارس بندھاتے رہے۔ وہ اتنی میٹھی باتیں لکھتا کہ میں تمام فکر بھول جاتی تھی۔ ہر خط میں یہ بات وہ ضرور لکھتا کہ جوں ہی جنگ ختم ہوئی ہم دونوں شادی کر لیں گے۔ اسی اثناء میں وہ زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔ ایک ماہ تک علاج کے بعد وہ پوری طرح صحت یاب ہو گیا تو مجھ سے ملنے آیا“

اپنے بچوں کے سامنے اپنے رومان کی داستان بیان کرتے ہوئے معتمد خاتون کو کوئی جھجک محسوس نہ ہو رہی تھی۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا : ”اس وقت ہمارا گھر ادلیا نوپسکی میں تھا۔ چھوٹے سے گھر کے سامنے خوبصورت باغیچہ بھی تھا۔ یہی موسم تھا۔ سیب پکے ہوئے تھے۔ سہ پہر کے وقت میں باغیچے میں بیٹھی تھی۔ میں نے ٹریکا کی تصویر سینے سے لگا رکھی تھی۔ اس نے باغیچے میں کھلنے والا دروازہ اتنی آہستگی سے کھولا کہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ دیر خاموشی سے کھڑا رہنے کے بعد وہ ”تانیہ، تانیہ“ کہتا ہوا میری جانب بڑھا۔ میں اسے اس قدر قریب دیکھ کر



حیران رہ گئی۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ میرے والدین سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ وہ رات اس نے ہمارے ہاں گزاری۔ اگلی صبح وہ دوبارہ جنگ پر چلا گیا، کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ کاش جنگ نہ ہوتی تو میں کتنی خوش نصیب ہوتی :-

یہ باتیں کرتے ہوئے وہ باقاعدہ ہچکیاں لے لے کر روتی رہی۔ میرے لیے اس کہانی میں دلچسپی کا زیادہ سامان نہ تھا۔ پھر بھی میں نے اپنی طرف سے تسلی کے چند فقرے کہے۔ خاصی دیر تک یوکوف کے گھر میں رہنے کے بعد میں نے اس سے اجازت چاہی۔ رخصت کرنے سے پہلے گھر کے تمام لوگوں نے مجھے تاکید کی کہ میں کسی سے یہاں آنے کا تذکرہ نہ کروں۔ اس لیے کہ اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ کوئی غیر ملکی یہاں آیا تھا تو ہماری شامت آجائے گی۔ انہوں نے مجھے اپنا ٹیلی فون نمبر دیا کہ وقت فوقتاً انہیں ٹیلی فون کر دیا کروں۔

میں یوکوف کے گھرانے سے ملاقات کو تقریباً بھول چکا تھا کہ ایک روز اچانک اپنی نوٹ بک پر ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا دیکھ کر مجھے ان سے کیا ہوا وعدہ یاد آگیا۔ ان ہی دنوں ہم افغانستان کی آزادی کا جشن منا رہے تھے۔ میں نے سوچا کیوں نہ جشن میں شرکت کے لیے یوکوف کے گھر والوں کو بھی دعوت دی جائے۔ میں نے ٹیلی فون کیا۔ دوسری طرف سے ریسپور اٹھایا گیا میں نے اپنا تعارف کرایا تو اُدھر سے خاموشی چھا گئی اور رابطہ منقطع ہو گیا۔ جب میں نے دوبارہ فون کیا تو رانگ نمبر کہہ کر رابطہ کاٹ دیا گیا۔ میں حیران ہو کر خاموش ہو گیا۔

چند روز بعد ایک پارک میں اچانک مجھے یوکوف دکھائی دیا۔ وہ میرے پاس آیا اور دلی معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا۔ میرے ساتھ اس کا رابطہ اس کے خاندان کے لیے ضرور رساں ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا روس میں غیر ملکیوں کو اپنے گھر میں لانا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ یوکوف نے کہا



وہ مجھ سے اسی پارک میں ملا کر بے گنا، لیکن میں نے انہیں مزید مشکل میں ڈالنے کے بجائے آئندہ کے لیے ان کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔

### فولاد کے کارخانے میں

دوسرے برس کے اختتام پر ہمیں فیلڈ ورک کے لیے کرپوری روگ کے مقام پر بھیجا گیا۔ اس علاقے میں لوہے اور کوئلے کے وسیع ذخائر اور کانیں پائی جاتی ہیں۔ شہر کے قریب کوئلے کو صاف کرنے کے متعدد کارخانے اور لوہا ڈھالنے کے بجلیاں بھی ہیں۔ ان کارخانوں میں سیوگوک، انگوک، سگوک اور یوگوک کے کارخانے بہت بڑے بڑے اور زیادہ مشہور ہیں۔ میرے گروپ میں دو الجزائر، ایک شامی اور ایک صومالی طالب علم کے علاوہ کچھ روسی طالبات بھی شامل تھیں۔

ہمیں سیوگوک کے کارخانے میں "فیلڈ ورک" کرنا تھا۔ یہ ایک دلچسپ اور معلوماتی مشغلہ تھا۔ کارخانے کی انتظامیہ کا سلوک بہت اچھا تھا۔ یوں تو ہمارے فرائض میں کارخانے میں تربیت حاصل کرنا تھا لیکن ہم نے زیادہ تر وقت گھومنے پھرنے اور دیو ہیکل مشینوں کی کارکردگی دیکھنے میں گزار دیا۔ ہمیں رہائش کے لیے سوزوں جگہ ملی ہوئی تھی۔ اخراجات کے لیے ہمیں ماہانہ ایک سو روپل بھی ملتے تھے۔ سیوگوک فیکٹری میں سالانہ پچاس لاکھ ٹن خام لوہا فولاد میں ڈھالا جاتا ہے۔

بارہ ہزار سے زیادہ مزدور یہاں کام کرتے ہیں۔ انہیں کارخانے کی گاڑیاں دور دراز کے دیہات اور قصبوں سے لاتی ہیں۔ کارخانے کے مخصوص لباس، جوتے اور ہیلٹ پہنے ہوئے مزدور بھی مشینوں کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔

سیوگوک کے مزدوروں کو خاصی سہولتیں حاصل تھیں۔ دوسرے کارخانوں کے مقابلے میں یہاں کام کرنے والوں کی معاشی حالت بھی اچھی تھی، لیکن ان کی زندگی



مسائل سے پاک نہ تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ خود کارخانے کا وجود تھا۔ کارخانے کی دیوثامت مشینوں کا قیامت خیز شور کانوں کے پردے پھاڑتا اور اس کی مہیب چمکیاں پورے علاقے کو دھوئیں اور گرد کے طوفان میں ڈبوئے رکھتی تھیں۔ جو مزدور کے علاوہ گرد و نواح کے لوگوں کی صحت کے لیے بھی سخت مضر تھا۔ اکثر مزدور کہتے تھے ان کے بچے اور خاندان کے دوسرے افراد سینے کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ اگرچہ آلودگی ختم کرنے کے لیے انتظام کیا گیا تھا، لیکن وہ چنداں مؤثر نہ تھا۔ کارخانے کے اندر بھی فضا انسانی صحت کے لیے سازگار نہ تھی۔ گندی ہوا خارج کرنے کے لیے مناسب انتظام نہ تھا۔ مشینوں کی گرگڑاہٹ میں ہزاروں مزدوروں کی کھانسی کی آوازیں دب جاتی تھیں لیکن ان کے چہروں کی زردی دُور سے نظر آتی تھی۔

کارخانے کی مشینیں چوبیس گھنٹے میں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رکتیں۔ رات دن گرد و نواح کی زمین تھر تھراتی رہتی ہے۔ تین شفٹوں میں کام ہوتا ہے۔ ہر شفٹ کے لیے مزدور اور انجینئر الگ ہوتے ہیں۔ کام کے آغاز سے پندرہ منٹ پہلے ہر سیکشن کے مزدور مخصوص مقامات پر جمع ہوتے ہیں۔ جہاں ہر ایک سے اس کی گزشتہ روز کی کارگزاری پوچھی جاتی ہے۔ جن سے افسران بالا خوش ہوں ان کی پیٹھ تھپتھپائی جاتی ہے اور جن کے کام سے اطمینان نہ ہو انہیں مختلف قسم کی سزائیں دی جاتی ہیں تاکہ دوسرے عبرت پکڑ سکیں۔

### مزدور عورتیں

میرے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ اس کارخانے میں مردوں کے ساتھ ہزاروں عورتیں بھی کام کرتی تھیں۔ ایسی خوفناک مشینوں اور چہروں کو جھلسا دینے والی بھٹیوں



کے سامنے جہاں مردوں کا پتہ پانی ہوتا تھا وہاں نازک اندام عورتوں کو کام کرتے دیکھ کر سخت تعجب ہوتا تھا۔ کام کرنے والیوں میں نئی نوپلی دہنیں بھی ہوتیں اور سالخورہ بوڑھیاں بھی۔ مشینوں کی کارکردگی دیکھتے ہوئے جب میں کسی عورت کو کام کرتے دیکھتا تو اس سے یہ سوال ضرور پوچھتا کہ وہ اپنے شوق سے یہ کام کر رہی ہے یا اسے کوئی مجبوری یہاں لائی ہے؟ تو ہمیشہ ایک ہی جواب ملتا کہ کام نہ کریں تو کھائیں کہاں سے۔ ایک خاتون کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ دور در پہلے اس کی شادی ہوئی ہے۔ میں اس کے پاس گیا اس کی خیر خیریت پوچھی اور شادی کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے یہ بھی پوچھ لیا کہ اس نے اس مبارک موقع پر طویل چھٹی لینے کے بجائے کام کرنے کو کیوں ترجیح دی؟ تو اس نے بڑی افسردگی سے کہا :

”اب تو میں نے ازدواجی زندگی کا آغاز کیا ہے۔ گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑے گی تاکہ زیادہ رقم مل سکے۔“

کارخانے کے زیادہ شور و شغب اور گرد و غبار والے حصوں میں کام کرنے والوں کو اجرت زیادہ ملتی ہے اس لیے نوجوان لڑکیاں اور لڑکے اس علاقے میں کام کرنے کو ترجیح دیتے تھے تاکہ زیادہ کام کر کے اور زیادہ پیسے کم کر وہ شادی کے لیے پیسے بچا سکیں یا اگر شادی ہو چکی ہو تو گھریلو اخراجات چلا سکیں۔

مزدور عورتیں کام کرنے کے دوران میں کئی طرح کے مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔ ان مسائل میں اخلاقی نوعیت کی قباحتیں بھی ہوتی ہیں۔ اکثر عورتیں اپنے نگرانوں

اور اعلیٰ افسروں کے کردار کی شاکی دکھائی دیتی ہیں، مگر وہ اپنی مشکل کسی کو بتا بھی نہیں سکتیں اس لیے کہ پیسہ ان کی مجبوری ہے جو صرف کام کر کے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ کام کرتی ہیں چاہے اس کے لیے انہیں کیسی ہی ذلت کیوں نہ اٹھانی پڑے۔

کارخانے کے کیفے ٹیریا میں بیک وقت تین ہزار مزدوروں کے لیے



کھانا تیار ہوتا تھا، مگر اس کی طعام گاہ میں ایک سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اس لیے کھانے کے وقفے کے دوران ہوٹل کے باہر کھانا کھانے والوں کی طویل قطاریں اپنی باری کے انتظار میں کھڑی رہتی تھیں۔ اکثر قطار میں کھڑے کھڑے کھانے کا وقفہ ختم ہو جاتا تھا۔ اس لیے بیشتر مزدور گھروں سے کھانا ساتھ لے کر آتے تھے۔ کھانے کے وقت جگہ جگہ پوٹلیاں کھول کر تین تین چار چار کی ٹولیوں میں بیٹھ جاتے اور کھانا کھا کر واپس کام پر چلے جاتے تھے۔ کھانے کی چیزوں میں باقی ڈبل روٹی، بھنا ہوا آلو، ٹھنڈا دودھ یا دہی ہوتا۔ بعض منچلے کسی ڈبے میں شراب بھی ڈال کر لے آتے تھے اور کھانے کے دوران چسکی لگا لیتے تھے۔ بعض مزدور تو اتنی شراب پی لیتے تھے کہ کام کے دوران جھومنے لگتے۔ انتظامیہ کام کے دوران شراب پی کر آنے والوں کو سخت سزائیں دیتی تھی، لیکن اس کا کچھ زیادہ اثر نہ ہوتا تھا۔ کئی مزدور شراب کے دھت نشے میں مشینیں چلاتے تھے اور بعض کو اس کا خطرناک نتیجہ بھگتنا پڑتا تھا۔ نشے کی شدت میں وہ مشین میں ہاتھ پاؤں کٹوا لیتے اور بعض تو زندگی سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔

رات کی شفٹ میں کام کرنے والوں کو نیند کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس مشکل کا حل باہمی تعاون سے نکالا جاتا ہے۔ چند افراد کو نگران بنا کر باقی تمام مزدور سو جاتے ہیں۔ اچانک کوئی افسر جاگے تو ایک خاص سگنل (جو عموماً مشینوں کی آواز سے نکالا جاتا ہے) تمام سونے والوں کو آن کی آن میں اپنے اپنے کام پر پہنچا دیتا ہے، لیکن اس سگنل کی ضرورت بہت کم پیش آتی ہے، کیونکہ افسران اعلیٰ رات کو نیند کے مزے لوٹتے ہیں اور مزدور کارخانے میں خفیہ استراحت گاہوں میں سو جاتے ہیں۔ مزدوروں کی اکثریت کارخانے میں بنی ہوئی خشک نالیوں میں آرام کرتی ہے، کچھ کارخانے کے اوپر بالکونیوں میں لیٹ جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کا راز افشا



نہ کرنے کے حلف اٹھائے جاتے ہیں۔

بعض اوقات اچانک چھاپوں کے دوران کچھ مزدور پکڑے بھی جاتے ہیں۔ سزائیں دی جاتی ہیں، لیکن رات کی شفٹ میں سونے والوں کی تعداد میں کمی نہیں آتی۔ انتظامیہ مزدوروں کے حالات سے آگاہ رہنے کے لیے ان میں اپنے جاسوسوں کا تقرر کر دیتی ہے، لیکن ایسے جاسوس جلد ہی مزدوروں کی نگاہ میں آ جاتے ہیں اور مزدور ایسے لوگوں سے چوکنے ہو جاتے ہیں۔

فرصت کے اوقات میں مزدور کارخانے کے مختلف گوشوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے گپ شپ بھی لڑاتے ہیں۔ اس موقع پر ذاتی مسائل اور دکھوں کے بکھڑے الجھائے اور سلجھائے جاتے ہیں۔ کئی مزدور جو میرے ساتھ بے تکلف ہو گئے تھے، اکثر کھانے کے وقفے میں مجھے اپنے دردِ دل میں شریک کر لیتے تھے۔ وہ بڑی حسرت سے کہتے کہ روس کے مزدور پوری دنیا میں پس ماندہ ہیں۔ ہم پر سخت ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ ان کے اندر کا کرب انہیں مسلسل بے کل رکھتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیوگوک کے کارخانے کے معاشی حالات دوسرے کارخانوں کے مقابلے میں اچھے تھے۔ روس میں عام مزدور کو ۸۰ سے ۱۰۰ روبل تک ماہانہ مشاہرہ ملتا ہے جب کہ اس کارخانے کے مزدور ۱۸۰ سے ۲۰۰ روبل ماہانہ کمالیتے ہیں۔

### میرے پاس موٹر نہیں ہے

کہ یوی روگ کی ایک تقریب خاصی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ اس تقریب کا اہتمام کارخانے کی کیونسٹ پارٹی نے کیا تھا۔ اس میں فیلڈ ورک کے لیے آئے ہوئے طلبہ و طالبات کو عموماً اور غیر ملکیوں کو خصوصاً مدعو کیا گیا۔ خور و نوش کے بعد تقاریف



اور آخر میں محفلِ رقص برپا کی گئی۔ مقامی کمیونسٹ راہنما کے افتتاحی کلمات کے بعد مجھے اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا۔ میں نے افغانستان کے مخصوص حالات کے حوالے سے نوجوانوں کے کردار پر چند باتیں کیں۔ سامعین نے میری خاصی حوصلہ افزائی کی۔ دیر تک تالیاں بجائی گئیں۔ بعد میں مجھ سے سوالات پوچھے گئے۔ سوالات پوچھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی مگر سوالات ایک جیسے اور ذاتی نوعیت کے تھے۔ مثلاً کہاں رہتے ہو؟ والدین کا پیشہ کیا ہے؟ ذاتی گھر ہے یا کرائے کے مکان میں رہتے ہو؟ ذاتی موٹر تو ہوگی؟ اس سے پہلے کن کن غیر ممالک کی سیاحت کر چکے ہو؟

میں نے ہر بات بلا کم و کاست بتادی۔ جب میں نے بتایا کہ میرے پاس موٹر نہیں، تو حاضرین کو میری سچائی پسند نہ آئی۔ خصوصاً لڑکیوں کو بہت مایوسی ہوئی۔ میرے بعد دوسرے غیر ملکی دوستوں کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ ان کی تقاریر شخصی اور خاندانی تعارف اور اپنے اختیار و ثروت کے تذکروں تک محدود رہیں۔ مثلاً صومالیہ کے طالب علم محمد نے کہا کہ اس کے والد خارجہ امور کے سیکرٹری اور والدہ علومِ طبی کی ماہر اور وزارتِ صحت کی مشیر ہیں۔ بڑے بھائی ایک صوبے کے گورنر ہیں اور دوسرے بھائی بہن یونیورسٹی کے طالب علم۔ محمد کو قوی امید تھی کہ انجینئرنگ کی ڈگری لے کر واپس جانے پر اسے وزارتِ تعمیر میں کسی اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا جائے گا۔ اس نے بتایا کہ اس کے گھر کے ہر فرد کے پاس ذاتی موٹر کار ہے۔ ایک بڑی دیگن گھر کا سودا سلف لانے کے لیے مخصوص ہے۔

محمد کے بعد شام کا عدنان اٹھا۔ اس کا لہجہ فخر و غرور سے لبریز تھا۔ اس نے کہا "میں شام کے ایک معروف خاندان کا فرد ہوں۔ اسی سال جب میں روس آ رہا تھا، شامی وزیرِ دفاع سے میری تفصیلی بات چیت ہوئی۔ صدر حافظ الاسد کے خاندان سے میرے خاندان کے تعلقات ہیں۔ وزیرِ خارجہ میرے ذاتی دوست ہیں۔ میرے والد وزارت



دفاع کے سیکرٹری ہیں۔ میری والدہ بیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے چکی ہیں۔ ہمارے کئی ذاتی باغات ہیں۔ زمین اور دکانوں کا تو کوئی شمار نہیں۔ موٹروں کی تعداد گننا میرے خیال میں ایک حقیر سا مشغلہ ہے۔ مکالمہ از کم مجھے تو معلوم بھی نہیں کہ ہماری موٹروں کی تعداد کتنی ہے۔

الجزائر میں طلبہ شریف زاوی اور رمضان نے بھی باری باری سامعین پر اپنی امارت اور سطوت کا رعب جمایا۔ شریف کا کہنا تھا کہ اس کے تمام رشتے دار اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں۔ والد اعلیٰ میں رہتے ہیں۔ بھائی اور بہن نے فرانس میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کے پاس ان گنت موٹریں ہیں یہاں تک کہ انہوں نے ایک گاڑی مسجد کے امام کو دے رکھی ہے۔

جتنی دیر میرے دوستوں کی باتیں جاری رہیں، لوگوں کی رحم سے بھری ہوئی نگاہیں مجھ پر پڑتی رہیں۔ ان کے خیال میں قسمت کا مارا شخص میں ہی تھا جس کے پاس ایک موٹر بھی نہ تھی نہ زمینیں اور باغات تھے۔

تقریب کے اختتام پر رقص کا پروگرام شروع ہوا تو میرے "خوش نصیب" دوستوں کے گرد خواتین اور نوجوان لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ ہر ایک ان کی ہم رقص بننے کی خواہاں تھی۔ کسی نے میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ یہ میرے حق میں بہتری ہوا۔ خدا نے میری بے کسی کی لاج رکھ لی۔ میں رقص کی دعوت سے ہی نہیں، اس ہڑ لونگ اور اس کے اختتام پر پیش آنے والے حادثے سے بھی محفوظ رہا جو میرے دوسرے ساتھیوں کو پیش آیا۔ وہ رات گئے تک حسینوں کے جھرمٹ میں راجہ اند بنے رہنے کے بعد واپس لوٹے تو راستے میں غنڈوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ انہوں نے ان "شہزادوں" کی پٹائی بھی کی اور ان کو قیمتی چیزوں سے بھی محروم کر دیا۔ دوسری صبح مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہسپتال میں ہیں۔ ہم نے مقامی تھانے میں رپٹ درج کرائی



مگر غنڈوں کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

رقص کے اختتام پر میں اپنی ہم جماعت لڑکیوں کے ساتھ واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچا۔ وہ راستے میں میرا مذاق اڑاتی رہیں کہ ”تم تو بہت قابلِ رحم ہو۔ تمہارے ماں باپ دہقان ہیں، موٹر تمہارے پاس نہیں، نہ تمہارا کوئی بھائی یا چچا وزیر ہے۔“

..... چچ ..... چچ ..... !

میں نے ان کے مذاق کا برا منائے بغیر انہیں سمجھاتے ہوئے کہا کہ میرے دوست صرف لڑکیوں کو بے وقوف بنانے کے لیے بڑباز رہے تھے اور تم بھی کتنی سادہ ہو کہ ان کی باتوں میں آگئیں۔ دوسری صبح جب غنڈوں سے پٹنے والے دوستوں کی ہیئتِ کدائی دیکھنے ہسپتال میں گئے تو میرے ہمراہ وہ لڑکیاں بھی تھیں۔ اپنے زخمی ہم جماعتوں کی عیادت کے ساتھ ساتھ مذاق کر کے ان کو شرمندہ بھی کرتی جاتی تھیں کہ دیکھا جھوٹ بولنے کا انجام !!

### غنڈے سے دوستی

روس میں غنڈہ گردی عام ہے۔ پر امن شہریوں خصوصاً غیر ملکیوں کے لیے راتوں کو بازاروں اور پبلک مقامات پر گھومنا پھرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ عام لوگ شام کے بعد گھروں سے باہر بہت کم نکلتے ہیں۔ یہیں بھی تاکید کی گئی تھی کہ شام کے بعد باہر نہ جائیں۔ میں بہت احتیاط کرتا تھا، لیکن ایک روز شام سے پہلے ہی ایک غنڈے سے آمناسا منا ہو گیا۔

اس کا نام ولودیا تھا۔ میں اپنی قیام گاہ کے قریب ایک سڑک پر ٹہل رہا تھا کہ وہ میرے قریب سے گزرا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ واپس مڑا۔ میرے پاس آیا اور نرم لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟



میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے اپنا تعارف یوں کرایا : ”میں اس شہر کے غنڈوں کا قائد ہوں۔ میرا نام ولودیا ہے۔“

کچھ دیر وہ میرے چہرے کا تاثر پڑھتا رہا۔ پھر بڑی رسان سے بولا :  
 ”مجھے اپنا دوست سمجھو اور اس شہر میں کبھی کوئی مشکل پیش آئے تو مجھے ضرور بتانا۔“  
 اس کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر قریبی پارک میں چلا گیا۔ وہاں اس نے مجھے بتایا کہ اس کے گروپ میں ہزاروں ناراض مزدور شامل ہیں جو روسی حکام کے جبر سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ جن کے حقوق کا تحفظ قانون نہیں کرتا۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ دوسروں سے حقوق کی بھیک مانگنے کے بجائے بزور بازو چھین لیں گے۔ ولودیا کی سرکردگی میں نوجوان مزدوروں کے کئی خفیہ گروپ منظم ہو چکے تھے۔ اس نے کہا :  
 ”حکومت ہمیں غنڈہ کہتی ہے۔ ہمیں اس کی چنداں پروا نہیں، ہم کمزوروں کے حقوق کی حفاظت کے لیے منظم ہوئے ہیں۔ ہم کمزوروں اور غریبوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے، ہم سچے نیشنلسٹ ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے بہت سے اعلیٰ اراکین ہماری حمایت کرتے ہیں۔“

ولودیا نے بتایا کہ ابتدا میں ان کی تحریک نے پُر امن انداز میں کام شروع کیا تھا۔ غریبوں کی خدمت کرنا جرم نہیں، لیکن حکومت کو ہماری تنظیم پر اعتراض تھا۔ سرکاری اداروں نے ہمارے اراکین کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ کے جی بی نے ہمارے نوجوانوں کو نشانہ بنایا۔ اس لیے ہم نے زیر زمین رہ کر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری تنظیم آج پورے یوکرین میں ایک زبردست قوت بن چکی ہے۔ ہم یوکرین کے کلیمدگی اور خود مختاری کے لیے کوشاں ہیں۔ اب اس تحریک کو ختم کرنا حکومت کے بس میں نہیں رہا۔ ہمارا ہر کارکن ولودیا بن چکا ہے۔

ولودیا نے مجھے رخصت کرتے وقت بڑے خلوص سے کہا : ”آج کے بعد



تم اس شہر میں ولودیا کے مہمان ہو۔ آزادی سے گھومو پھر دو۔ اگر کبھی پولیس بھی تمہیں پریشان کرے تو میرا نام لینا کوئی تمہارا بال بھی نہ بیکا کر سکے گا۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ میرا خیال تھا مجھے ولودیا کی ضرورت پیش نہ آئے گی، لیکن دنسک میں قیام کے دوران میں ولودیا کی دوستی میرے بہت کام آئی۔ ایک روز مجھے ایک شرابی نے بہت تنگ کیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ شراب پینے کی دعوت دینا چاہتا تھا۔ میرے انکار پر بگڑ گیا۔ کہنے لگا: ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ روس ہے اور یہاں شراب کی دعوت ٹھکانا گستاخی کے مترادف ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ میں شراب پینا حرام سمجھتا ہوں، لیکن وہ بضد ہو گیا کہ میں اس کے ساتھ گھر چل کر شراب پیوں۔ میں نے سختی سے انکار کیا تو اس نے چاقو نکال لیا۔ اب میرے پاس صرف یہی راستہ رہ گیا تھا کہ ولودیا کا حوالہ دوں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ولودیا میرا واقف ہے تو وہ حواس باختہ ہو کر بھاگ گیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ مجھے چند غنڈوں نے گھیر لیا۔ وہ مجھ سے رقم مانگنے لگے۔ اس موقع پر بھی ولودیا کا نام کام آیا۔ غنڈے مجھے ہاسٹل تک پہنچانے آئے اور چلتے ہوئے مجھ سے معافی بھی مانگی۔

چند روز بعد میں شام کے وقت ایک سینما ہال کے قریبی پارک میں بیٹھا تھا کہ شراب کے نشے میں دھت ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا: ”وہ سامنے کوئی تمہیں بلارہا ہے۔“ میں وہاں نہ جانا چاہتا تھا، اس لیے اس سے معذرت چاہی مگر اس نے چاقو نکال کر زبردستی جانے پر مجبور کیا۔ میں اس کے ساتھ چند قدم ہی چلا تھا کہ دو عورتیں ایک کونے سے نکل کر ہمارے ساتھ چلنے لگیں۔ میں نے اپنے ہمراہی سے پوچھا کہ یہ عورتیں کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتی ہیں تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا: ”یہ تمہاری میزبانی کا شرف حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ چلو گے ان کے گھر؟“



میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک غیر ملکی طالب علم ہوں۔ اپنے ہاسٹل جانا چاہتا ہوں وہ مجھے جانے دیں ورنہ میں پولیس میں اطلاع دینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اس پر وہ تینوں بڑے زور سے ہنسنے اور کہنے لگے: ”پولیس اسٹیشن سے ہمیں نہ ڈراؤ۔ ہاں اگر تم ہمیں اپنے گھر لے جانا چاہتے ہو، تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔“

مجبوراً میں انہیں ساتھ لے کر ولودیا کے گھر چلا گیا۔ اس وقت ولودیا اپنے گھر سے نکل رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر روکا اور پوری صورت حال بتائی۔ ولودیا نے مجھے ان لوگوں کے زرنے سے چھڑایا۔ جب اس نے ان کو بتایا کہ اس کا نام ولودیا ہے تو وہ تھرتھر کا پٹنے لگے۔ دونوں عورتیں اس کے پاؤں میں گر پڑیں۔ ان واقعات نے ولودیا سے میری دوستی خاصی مستحکم کر دی۔ ولودیا جب مجھ ملتا، قوت بازو پر بھروسہ کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ وہ کہتا روس میں شرافت نیکی اور دیانت کی کوئی اہمیت نہیں، یہاں عزت کی زندگی گزارنے کے لیے جرأت زندانہ درکار ہے۔ اگر جرأت نہ ہو تو انسان خاموشی سے کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بن جائے۔ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بننے کے لیے آدمی کو زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔

میں نے ایک بار ولودیا سے کہا وہ کمیونسٹ پارٹی میں کیوں شامل نہ ہوا؟ تو اس نے کہا: ”میں پارٹی میں شامل ہوا تھا، لیکن وہاں میں اپنے آپ کو محکوم سمجھتا تھا۔ جو میری سرشت کے خلاف تھا۔ اس لیے میں نے دوسری راہ اختیار کی۔ اب میں بہت مطمئن ہوں۔ جب تک زندہ ہوں اسی طرح رہوں گا۔ اگر موت آگئی تو بہادر رہوں گا۔“

”خزانہ عالم“ کی سیر

کریوی روگ سے واپسی پر ہمیں ایک ماہ کی تفریحی چھٹی دی گئی۔ یہ چھٹی گزارنے



کے لیے طلبہ کو مختلف مقامات پر بھیجا گیا۔ میرے حصے میں کریمیا کی ایک خوبصورت تفریح گاہ الوشتہ آئی۔ مجھے خود بھی اس سرزمین کو دیکھنے کی بہت خواہش تھی جس کے ذرے ذرے پر مسلمانوں کے عہدِ رفتہ کے نقوش ثبت ہیں۔ بحیرہ اسود کے کنارے پر یہ ایک خوبصورت علاقہ ہے۔ اس کے کونے کونے میں تفریح گاہوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہر سال ملک اور بیرون ملک سے ہزاروں سیاح یہاں آتے ہیں۔ گرمیوں میں اس علاقے کا درجہ حرارت ۲۰ اور ۲۴ درجے سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے۔ پورا علاقہ جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے اور اس کے پہاڑوں میں ایسے چشمے ہیں جن کے پانی میں گندھک اور دوسرے معدنی عناصر کی آمیزش ہے۔ اس پانی کو جلدی امراض، معدے، جگر اور گردے کی بیماریوں کے علاج کے لیے کامیابی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے قدیم یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے اسے خزانہ عالم کے لقب سے یاد کیا تھا۔

کریمیا کے علاقے میں اسلام تیرہویں صدی عیسوی میں آیا۔ چند مقامی لوگوں نے سلطنتِ عباسیہ سے درخواست کی تھی کہ وہ مسلمان ہو چکے ہیں، مگر انہیں اسلام کے بارے میں کچھ معلومات حاصل نہیں، لہذا کچھ مبلغین بھیجے جائیں۔ ان مبلغین کو کوششوں سے کریمیا کا علاقہ نورِ اسلام سے منور ہو گیا۔ پندرہویں صدی کے آغاز میں یہاں حاجی منگل کی قیادت میں پہلی اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ منگل خاندان نے کئی پشتوں تک حکومت کی۔ ان کے عہد کو کریمیا کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے۔ اڑھائی صدیوں پر محیط یہ سنہرا دور ۱۸۳۱ء میں ختم ہوا جب روسی جنرل بوٹمکین نے لشکرِ جرار کے ساتھ کریمیا کے خطہ امن کو روند ڈالا۔ روسیوں نے کریمیا پر چڑھائی کے دوران میں بے پناہ خونریزی کی۔ اس کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ روس کی چڑھائی سے پہلے کریمیا کی آبادی پچاس لاکھ سے زیادہ تھی،



لیکن روسیوں کے برسرِ اقتدار آنے کے بیس بائیس برس بعد یہ آبادی چالیس لاکھ سے بھی کم رہ گئی۔ لاکھوں قتل کر دیے گئے اور لاکھوں کو جلاوطن ہونا پڑا۔ صرف ایک شہر کاراسوبازار میں تیس ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ فرانسیسی مؤرخ لاروس لکھتا ہے:

”انسانیت ٹوٹکین سے ان ہولناک جرائم کا حساب لے گی جن کا ارتکاب اس نے کریمیا کی سرزمین پر کیا ہے“

مسلمانوں نے ملی تشخص اور آزادی کی بحالی کے لیے دیر تک شدید جدوجہد کی اور روسیوں کے پاؤں اپنی سرزمین پر ٹپکنے نہیں دیے، لیکن ایک بڑی اور جارح قوت کے سامنے ایک مختصر سے جزیرہ نما کی منتشر قوت کیا حیثیت رکھتی تھی۔

۱۹۱۷ء کے بالشویک انقلاب کے موقع پر کریمیا کے مسلمانوں میں آزادی کی لہر تیزی سے اٹھی اور کریمیا کے مفتی اعظم چلس جہان کی صدارت میں آزاد ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ دنیا کے متعدد ممالک نے اس مملکت کو تسلیم کر لیا، لیکن آزادی کا شعلہ دو برس بعد ہی بجھ گیا۔ کمیونسٹوں نے کریمیا پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور کریمیا کے ایک کمیونسٹ راہنما ولی ابراہیم کو گورنر بنا دیا۔ بعد میں سٹالین نے کریمیا کے مسلمانوں کو گنہگار کرنے کے لیے تجویز پیش کی کہ انہیں جزیرہ نما کریمیا سے نکال کر روس کے دوسرے علاقوں میں آباد کر دیا جائے، ولی ابراہیم نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی مگر اسے اپنی سرکشی کے نتائج بہت جلد بھگتنے پڑے اور ۱۹۲۷ء میں اسے ہزاروں دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ولی ابراہیم نے تختہ دار پر چڑھنے سے پہلے جلاوطنوں کو مخاطب کر کے کہا:

”مجھے اپنے بچے کو پھاڑ کھانا چاہیے تو پہلے اس کے چہرے پر مٹی مل دیتا ہے، تاکہ سمجھے یہ اس کا بچہ نہیں ہے“

اپنے پروردہ لوگوں کے قتل عام کے بعد روسی حکومت نے مقامی آبادی کے



عام انخلاء کا حکم دے دیا۔ ۲۰ جون ۱۹۴۶ء کو روس کی صدارتی کونسل نے باقاعدہ فیصلہ کیا کہ مقامی آبادی کو روس کے شمالی علاقوں میں بسایا جائے۔ اس آخری انخلاء کے وقت گھٹتے گھٹتے صرف دس لاکھ مسلمان رہ گئے تھے۔ آج کریمیا کی آبادی میں بہت کم مسلمان نظر آتے ہیں جس سرزمین کے چپے چپے پر خونِ مسلم کے نقوش ہیں وہ آج اشتراکیت کا گہوارہ نظر آتی ہے ہزاروں مساجد مسمار کر کے ان کی جگہ کلب، تھیٹر اور سینما گھر تعمیر کر دیے گئے ہیں۔ بیسویں صدی کا کوئی سیاح کریمیا جا کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ کبھی یہاں سے اسلام کا کارواں گزرا تھا۔

### روحانی بیماریوں کا ہجوم

جزیرہ نما کریمیا کا رقبہ تقریباً ستائیس ہزار کلومیٹر ہے۔ پورے علاقے میں جگہ جگہ تفریحی کالونیاں، آرام گاہیں اور سیینی ٹوریم تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان آرام گاہوں میں تقریباً تیس ہزار افراد کے قیام کی گنجائش ہے۔ روسیوں کے علاوہ لاکھوں سیاح ہر سال یہاں آتے ہیں۔ ہر تفریحی بستی اور سیینی ٹوریم بیس رہائشی بلاکوں پر مشتمل ہے جس میں رہائشی جگہوں کے علاوہ سینما، کلب، رقص گاہیں اور شراب خانے بھی موجود ہیں۔ ہر کالونی کے ساتھ ایک ایک ہوٹل بنایا گیا ہے۔ ان ہوٹلوں میں صرف وہی لوگ کھانا کھا سکتے ہیں جن کے پاس مخصوص کارڈ ہوتے ہیں۔

کریمیا کی تفریح گاہوں میں آنے والوں کی زیادہ تعداد ان بیماریوں کی ہوتی ہے جو علاج اور آرام کے لیے آتے ہیں۔ بیماریوں میں روحانی بیمار زیادہ اور جسمانی کم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ شراب و کباب کے متوالے اور رقص و سرود کے دیوانے ہوتے ہیں۔ حکومت نے ان کی ضیافتِ طبع اور دلہستگی کا پورا سامان کیا ہے۔ ہر جگہ رقص گاہیں، شبانہ کلب اور عشرت کدے موجود ہیں۔ مرد و زن کے درمیان کسی قسم کا رابطہ



ناجانہ خیال نہیں کیا جاتا۔ ہر شخص ادنیٰ کوشش سے اپنے لیے ایسا عارضی ساتھی تلاش کر سکتا ہے جو اس کی خلو توں کو مہکا سکے۔ زیادہ تر لوگ رقص گاہوں میں اس لیے جاتے ہیں کہ صنفِ مخالف کو ہنوا بنا کر اپنے تفریح کے دنوں کو خوش گوار بنا لیں۔ کم از کم مجھے تو ان کلبوں اور رقص گاہوں کا اس کے سوا کوئی دوسرا مصروفِ نظر نہیں آیا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ رقص کے دوران میں متعارف ہونے والے مرد اور عورتیں اتنے پختہ رفیق بن جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کے لیے بلا تامل متاعِ عصمت قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

کلبوں کی انتظامیہ بھی اتنی فراخ دل ہے کہ جب تک لوگ خود ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے باہر نہ چلے جائیں وہ کسی کو نہیں کہتے کہ بھائی ہمارے آرام کا وقت ہے آپ تشریف لے جائیں! نہ کسی کو اس بات پر ٹوکا جاتا ہے کہ اس خاتون سے آپ کا کوئی رشتہ نہیں آپ کیوں اسے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ساتھ لے جا رہے ہیں؟

روسی معاشرے میں دوسری روزمرہ ضروریات دستیاب نہ ہوں لیکن جنسی ضرورت پوری کرنے میں کسی کو مشکل پیش نہیں آتی۔ سکول، کالج، کارخانے اور کلچورل جنسی آزادی کی عمدہ تربیت گاہیں ہیں۔ رقص گاہیں اور تھیٹر آزادانہ اختلاط کے مراکز ہیں۔ نوشتہ میں رقص کے لیے تین بڑے کلب موجود ہیں۔ رات کو ان کلبوں میں بل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی شراب کے دور چلتے ہیں اور کچھ لوگ شراب پی کر نشے میں اس طرح بہکتے ہیں کہ جگہ جگہ دھینکا مستی کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

رقص گاہوں سے نکل کر نوجوان بے قابو بھینسوں کی طرح پارکوں میں گھس جاتے ہیں اور وہاں ہٹ بازی کرتے ہیں۔ صبح سڑکوں سے شراب کی ٹوٹی بوتلیں سیٹی جاتی ہیں۔ ان تمام چوکڑی میں جرائم پیشہ اور چور اچکے اپنا کام کر گزرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے



گھروں میں گھس کر پُرا من خواتین اور بچوں پر دست درازی کرتے اور قیمتی چیزیں چور کر بھاگ جاتے ہیں۔

جتنے روز میں الوشتہ میں رہا، ہر روز صبح یہ خبر آتی رہی کہ آج شراب پیتے ہوئے لوگوں نے اتنے افراد کو زخمی کر دیا، فلاں جگہ چوری ہو گئی اور اتنے افراد بلوے کے جرم میں پکڑ لیے گئے۔

### عیش و عشرت کی ارزانی

جس معاشرے میں شراب اور بدکاری عام ہو جائے دوسرے فاسد اخلاق خود بخود وہاں پیدا ہو جاتے ہیں۔ روس کا یہی حال ہو چکا ہے۔ یہ باہر سے خوش نما نظر آنے والے چہرے کے پس منظر میں ایسا وجود بن چکا ہے جس کے داغوں کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ جھوٹ، فریب، دھوکا دہی، خیانت اور دوسرے اخلاقی جرائم معاشرے کا جزو بن چکے ہیں۔ حکومت اس اخلاقی زوال سے اچھی طرح آگاہ ہے، لیکن وہ اس کو ختم کرنا نہیں چاہتی۔ شراب کے نئے کارخانے بن رہے ہیں۔ نئے اور عمدہ شراب کی قسموں پر آئے دن تحقیقات ہو رہی ہیں۔ روزمرہ اشیاء کی قیمتوں میں آئے دن اضافہ ہوتا ہے، لیکن شراب کی قیمت معقول حد تک کم ہے۔ سرخ شراب کی دو لٹر کی بوتل صرف دو روپل میں، دوڑ کا کی بوتل چار روپل میں اور بیر کی تین بوتلیں صرف ایک روپل میں ملتی ہیں۔ روس میں شراب کے کارخانوں کی کمی نہیں لیکن کھیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ حکومت مانگ پوری کرنے کے لیے پولینڈ، مصر، چیکوسلوواکیا، الجزائر اور دوسرے ممالک سے اعلیٰ قسم کی شراب بھی درآمد کرتی ہے۔ الوشتہ کی حسین وادیوں کا جمال جنسی بے راہروی میں مبتلا لوگوں کی وجہ سے ماند پڑ گیا ہے۔ گل رنگ پارکوں اور چمکیلی سڑکوں پر شرابی جھومتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں،



پہاڑیوں پر جہاں قدرت کی صناعتی کارنگ دکھائی دیتا ہے، وہیں بے لگام مرد اور عورتوں  
سرعام بوس و کنار میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ گزرگاہوں کے سامنے عریانی اور  
فحاشی کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

ہماری رہائشی کالونی میں شراب پینے والوں کی کثرت تھی۔ کئی بار رات کو اچانک میرا  
دروازہ بچتا اور پھر دھڑام سے کھلتا۔ کوئی شرابی گیت گاتا ہوا اندر آ جاتا۔ مجھے نیند  
سے بیدار کر کے گپ شپ کرنے کی فرمائش کی جاتی اور میری بات سنی ان سنی کرتے  
ہوئے زبردستی اپنے دُکھڑے سنائے جاتے تھے۔

شراب میں نہ جانے کونسی ایسی قوت ہے کہ کمزور دل لوگوں کو جبری بنا دیتی ہے۔  
اکثر شرابی رات کو نشے کے عالم میں وہ باتیں بھی کہہ جاتے تھے جن کا وہ دن میں تصور  
بھی نہ کر سکتے تھے۔ میرے پڑوسی جو ڈاکٹر تھے ایک روز رات گئے تک حکومت کو  
گالیاں دیتے اور سرکاری پالیسیوں کو احمقانہ قرار دیتے رہے۔ دوسری صبح جب  
میں نے ان کی رات کی باتوں کا حوالہ دیا تو وہ میری منتیں کرنے لگے کہ میں کسی سے  
نہ کہوں۔ کیونکہ وہ اس وقت نشے میں تھے اور نشے میں انسان بے اختیار ہو جاتا ہے۔

روس کے مختلف شہروں سے ایسی عورتیں ہر سال کریمیا آ جاتی ہیں جن کے  
دم قدم سے قحجہ خانے آباد ہوتے ہیں۔ ایسی عورتیں بڑے مہذب روپ میں اپنا  
کاروبار کرتی ہیں (شاید اس لیے کہ روس میں عصمت غروشی پر بظاہر پابندی ہے)  
وہ شوخ تتلیوں جیسے کپڑے پہنے ہوئے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گزرتی ہیں۔ ہر شناسا  
اور اجنبی کو دیکھ کر مسکراتی ہیں (اس لیے کہ روس میں عورتوں کے مسکرانے پر کوئی  
پابندی نہیں) محفلوں اور تقریبات میں معزز خواتین بن کر شریک ہوتی ہیں۔ رقص  
گاہوں اور کلبوں میں جاتی ہیں۔ ان کے وار سے بچنا محال ہوتا ہے۔ جس پر ان  
کا وار چل جائے وہ بے موت مارا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر عورتیں خطرناک امراض



میں گرفتار ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کی زلف گرہ گیر کا شکار بھی موذی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک افغان طالب علم نے جو اس علاقے کا واقف تھا مجھے بتایا کہ الوشتہ میں نوے فیصد بازاری عورتیں آشک کے مرض میں مبتلا ہیں۔

پیشہ در عورتوں کی اجرت یکساں نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کا کاروبار منظم نہیں ہے۔ جتنے دام کوئی گاہک دے جائے وہ اسی پر خوش ہو جاتی ہیں۔ بعض نادان تو ایک روٹی، چند گرام بخ بسترہ گوشت کے ٹکڑے اور سستی شراب کی ایک بوتل پر ہی قناعت کر جاتی ہیں۔ ان کی اکثریت شراب کی رسیا ہے، فیکٹریوں کا محنت طلب کام ان کے بس میں نہیں، اس لیے شراب کی لت پوری کرنے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے وہ گلیوں میں ماری ماری پھرتی ہیں۔ ان کو معاشرے کا سب سے مظلوم طبقہ کہا جاسکتا ہے۔ وہ اتنی بدنام ہو چکی ہیں کہ کوئی ان سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسی لڑکیاں انگریزی اور دوسری غیر ملکی زبانوں میں شد بدسی حاصل کر لیتی ہیں اور غیر ملکی سیاحوں اور طلبہ کی تلاش میں رہتی ہیں۔ کریمیا کی تفریح گاہوں میں آنے والے اکثر غیر ملکی ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

الوشتہ سے بحیرہ اسود کچھ زیادہ دور نہیں۔ تفریح کے لیے آنے والے ساحل سمندر پر غسل آفتابی سے لطف اندوز ہونے ضرور جاتے ہیں۔ صبح سے شام تک بڑی رونق رہتی ہے۔ مردوزن کے جسموں پر برائے نام لباس ہوتا ہے۔ ریت میں ننگے دھوپ میں پڑے رہنا، یا اپنے دوستوں کے ہمراہ شطرنج، تاش اور دوسرے کھیلوں سے لطف اندوز ہونا اور مختصر وقفوں کے بعد سمندر کی لہروں سے اٹکھیلیاں کرتے رہنا۔ ہزاروں لوگ ساحل پر یہی کچھ کرنے آتے ہیں، مگر اب کچھ منچلے لڑکے اور لڑکیاں ایسے بھی رونق افروز ہونے لگے ہیں، جو ساحل سمندر پر پہنچ کر لباس



کے تکلف کو بالکل ہی ترک کر دیتے ہیں۔ ایسے نوجوان ساحل پر گھوم پھر کر عریانی کے فوائد پر لیکچر بھی دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں شرم و حیا بوڑھائی اصطلاح ہے اور نوجوانوں کا استحصال کرنے کے لیے گھڑی گئی ہے جبکہ کیونز م ایسے نام نہاد اخلاقیات کو ختم کرنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ ان کا کہنا ہے، کیونز م اس وقت تک مکمل طور پر نافذ نہیں ہو سکتا جب تک مرد اور عورت کے درمیان ہر نوع کے تکلفات ختم نہیں ہو جاتے۔

زیادہ عمر والے مرد اور عورتیں اس صورت حال سے نالاں تھے۔ وہ غسل کرتے وقت مناسب لباس پہنے رہتے اور جب نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو عریاں حالت میں شوخیاں کرتے دیکھتے تو طنز پر انداز میں فقرے کہتے۔ ایک بوڑھے روسی کو میں نے بڑبڑاتے سنا :

”ان بے حیاؤں نے جنگ اور قحط کی تباہ کاریوں کو نہیں دیکھا ورنہ یہ اس طرح عیش و عشرت کے متوالے نہ ہوتے“

### استاد محترم کی رنگین مزاجی

ہمارے نگران اور رہنما کے طور پر جو صاحب کرمیا آئے تھے وہ بڑے رنگین مزاج تھے۔ یہ شعبہ معدنیات کے نائب صدر اور استاد تھے، لیکن ایک روز میں نے دیکھا کہ وہ شوخ و شنگ کپڑوں والی عورت کے ساتھ بے تکلفانہ قہقہے لگا رہے ہیں۔ مجھے کچھ حیرت تو ہوئی، لیکن میں اسے روسی معاشرے میں مرد و زن کی بے تکلفی سمجھ کر چپ ہو گیا، لیکن ساحل سمندر پر تفریح کے دوران جب میں نے ان دونوں کو برائے نام لباس میں ایک دوسرے سے لپٹے اور چٹاخ پٹاخ کرتے پایا تو مجھے خاصی حیرت ہوئی اتنے میں میرے نگران کی اچانک مجھ پر نظر پڑ گئی تو وہ تیزی سے میرے پاس آئے۔ ان



کے پیچھے وہ عورت بھی تھی۔ انہوں نے اپنی دوست "کاتعارف کرایا اور پھر مجھ سے پوچھا  
"خیریت تو ہے۔ اکیلے پھر رہے ہو؟"

میں نے کہا مجھے تنہا رہ کر سیر و سیاحت میں زیادہ لطف آتا ہے، لیکن شاید  
انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا۔ کہنے لگے :  
"یہ کیسے ممکن ہے تمہاری صحت تو ٹھیک ہے؟"

میں نے انہیں یقین دلایا کہ میری صحت اور حواس درست ہیں تب کہیں جا کر  
انہیں یقین آیا۔ پھر بھی خاتون میرے قریب آئیں اور راز دارانہ لہجے میں کہنے لگیں : اگر  
تمہیں کسی ساتھی سے متعارف ہونے میں دقت پیش آرہی ہو تو مجھے بتاؤ۔ الوشتہ میں  
میری چند بہت پیاری سہیلیاں تمہاری تنہائی کو ختم کر دیں گی۔  
میں نے ان دونوں کی "ہمدردی" کا شکریہ ادا کیا اور اپنی تنہائی کو اپنا رفیق بنائے  
رکھنے پر اکتفا کیا۔

اس روز ہمارے نگران اپنی قیام گاہ پر بہت دیر سے پہنچے۔ شراب نے ان کے  
حالت خراب کر رکھی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ ہر ایک سے چیخ چیخ کر باتیں کر رہے  
تھے۔ مجھ سے بڑے جلال میں پوچھا کہ ان کا بستر کہاں ہے؟ میں نے ان کو بستر تک  
پہنچایا مگر دوسری صبح میں نے دیکھا وہ اپنی چارپائی کے نیچے استراحت فرما رہے ہیں۔ ان  
کا پورا لباس کیچڑ اور غلاظت سے بھرا ہوا تھا اور ان کے منہ سے تعفن کے بھکے اٹھ  
رہے تھے۔

ایسے واقعات روس میں روز کا معمول ہیں، لیکن مجھ پر اس واقعے کا بے حد اثر ہوا  
اس نے میرے دل سے استاد کے احترام کو کھرچ دیا۔ سفید بالوں والے اس پروفیسر  
نے میرے دل و دماغ کو بُری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ دوسری صبح جب وہ ہوش میں آئے تو  
میں سیدھا ان کے پاس گیا اور ان سے شکایت کے لہجے میں پوچھا :



”استاد محترم! اگر آپ ایسی باتوں میں ملوث ہوں گے تو انصاف سے  
بتائیں، شاگردوں کا کیا حال ہوگا؟“

لیکن ان پر میری بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ہنس کر بولے ”بھئی! اس بات کا  
اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ہر انسان کا پیداؤشی حق ہے۔ روس میں جنسی تعلقات  
کا مستقل قانون موجود ہے۔ میں آپ کو پڑھاتا ہوں، آپ کی نگرانی کرتا ہوں، لیکن  
تدریس سے بچے ہوئے وقت میں مجھے اختیار ہے کہ میں جس عورت سے چاہوں  
تعلقات قائم کر لوں۔“

اس فلسفیانہ موشگافی نے مجھے مزید الجھا دیا۔ پھر بھی میں نے ہار نہ مانی اور ایک  
زیادہ نوکیلا سوال کر دیا ”ٹھیک ہے اگر آپ اپنا حق وصول کرتے ہیں تو کریں لیکن  
اس طرح اپنی بیوی کا حق تو آپ پامال کرتے ہیں؟“

استاد صاحب نے اس سوال کا جواب بھی بڑی بے باکی سے دیا۔ ان کے جواب  
سے میرے کہنے سے جو اس بھی گم کر دیے۔ فرمایا ”تمہارا کیا خیال ہے۔ میری بیوی صرف میرا  
انتظار کرتی رہے گی۔ وہ اس ہفتے میں کئی بار اپنے ہسائے کے ہاں جا چکی ہوگی یا اسے  
اپنے گھر مدعو کر چکی ہوگی۔“

اس کے بعد انہوں نے مجھے طویل لیکچر پلا دیا۔ ان کا کہنا تھا ”چونکہ تم ایک بوڑھے  
معاشرے کے فرسودہ خیال آدمی ہو اس لیے تمہیں ان باتوں پر حیرت ہو رہی ہے۔  
انقلاب سے پہلے روس کی بھی یہی حالت تھی۔ جب ازدواجی معاملات پر کلیسا کی  
حکومت تھی۔ انسانی آزادی پر پابندی تھی اور اگر کوئی شخص اس پابندی کو توڑتا تو اسے  
سزا دی جاتی تھی، لیکن انقلاب کے بعد صورت حال تبدیل ہو چکی ہے۔ اب چند  
پس ماندہ علاقوں کے سوا کسی جگہ رجعت پسندانہ رسوم اور قوانین باقی نہیں رہے۔ ہم  
لوگ آزاد ہیں۔ شوہر بھی آزاد ہے اور بیوی بھی۔ جب لوگ خوش ہیں، تو حکومت کو



کیا پڑی ہے کہ فکر کرتی پھرے“

اپنے نگران کی یہ باتیں سن کر بے اختیار مجھے اکیڈمیشن سخاروف یاد آئے جنہوں

نے کہا ہے :

”کیونٹوں نے روسی قوم کو بد راہ کر کے ایمان کی قوت سے محروم کر دیا

ہے۔ وہ انسانی آزادی سے محروم کر دیے گئے ہیں لیکن حیوانی آزادی

سے ہمکنار ہو چکے ہیں“

### تین افغان ترقی پسند

میں نے اوپر الوشتہ میں افغان ڈاکٹروں سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ دیارِ غیر میں کسی بھی ہم وطن کا وجود بڑا غنیمت ہوتا ہے، پھر یہ تو پڑھے لکھے لوگ تھے۔ میرا خاص وقت ان کے ساتھ گزرا۔ وہ تین تھے۔ تینوں بڑے صاف ستھرے، روشن خیال اور ترقی پسند۔ سپیروفل میں زیر تعلیم تھے اور تفریحی سفر پر الوشتہ آئے تھے۔ ہم اکثر اکٹھے بحیرہ اسود کے ساحل پر چلے جاتے تھے۔ ایک روز ہم نے فیصلہ کیا کہ چاندنی میں سمندر کا منظر دیکھا جائے۔

ساحل کی ٹھنڈی ریت پر خنک چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ دن کے ہنگامے ختم ہو چکے تھے۔ اس روز چاند کی چودھویں تھی۔ چاند سمندر کی ہر لہر سے لپٹ لپٹ کر مسکراتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس پر کیف فضا میں تمام ساتھی اپنے بچنے کی یادیں دہراتے رہے، کچھ دیر ہنسی مذاق کرتے رہے۔ اسی اثناء میں مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ چاند میں حسن پیدا کرنے والے معبود کے حضور سجدہ کیا جائے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ نماز پڑھ لی جائے۔ میرے تینوں ساتھی یوں بد کے جیسے کسی بھڑنے کاٹ لیا ہو۔ ان کا مزاج بگڑتے دیکھ کر میں نے تنہا ہی نماز ادا کی۔ ساحل کی ٹھنڈی ریت پر نماز کا وہ کیف



آج بھی یاد آتا ہے۔

نماز ختم کر کے دیکھا، وہ تینوں اکٹھے پانی کے چھینٹے اڑا رہے تھے اور میری سرشت پر اظہارِ حیرت کر رہے ہیں کہ میں آخر کس مٹی کا بنا ہوا ہوں کہ روس میں آ کر بھی خدا کو نہیں بھولا۔ میں ان کے پاس گیا، تو مجھ سے پوچھنے لگے :

”نماز تو افغانستان کا دستور ہے، تم ابھی تک اسے سینے سے لگائے ہوئے ہو؟ حد ہو گئی دقیانوسیت کی!“

میں نے انہیں سمجھایا کہ میں اسے افغانوں کی رسم سمجھ کر نہیں، مذہبی فریضہ جاننے کر ادا کرتا ہوں۔

انہوں نے بحث کا طویل سلسلہ چھیڑ دیا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ دنیا بھر میں صرف وہی اقوام ترقی یافتہ ہیں جہاں لوگوں نے مذہب سے منہ موڑ لیا ہے اور جہاں ابھی تک مذہب پر عمل درآمد ہو رہا ہے وہاں غربت اور جہالت ہے۔ اس لیے اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی مذہب سے منہ موڑنا ہو گا۔ میں نے کوشش کی کہ ان کی غلط فہمیاں دور کر سکوں، روس اور امریکہ کی مثالیں دے کر بتایا کہ دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کس طرح دنیا کے امن و سکون کو غارت کر رہے ہیں۔ خود ان کے عوام کا حال کیا ہے۔ حیوانوں جیسی زندگی گزارنا تو انسانیت کی تکمیل نہیں، مگر وہ بات کو مزید الجھاتے رہے۔ افہام و تفہیم سے انہیں غرض نہ تھی۔

یہ تینوں ڈاکٹر صاحبان افغانستان کے دیہی علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور تینوں کو اعتراف تھا کہ ان کے علاقے میں سو فیصد لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ خود ان کا کہنا تھا کہ انہیں نماز روزے سے کبھی علاقہ نہیں رہا۔ انہوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ نور محمد ترہ کی سے ہمارے قریبی تعلقات ہیں اور اسی ”عظیم“ افغان رہنما نے ہمیں روس بھجوا دیا ہے۔ وہ ”انقلاب“ کے بارے میں بڑے پر جوش تھے۔ مجھ سے



پوچھنے لگے کہ میرا تعلق کس سیاسی تنظیم سے ہے، میں نے بتایا کہ میرا کسی پارٹی سے کوئی واسطہ نہیں، تو انہوں نے مزید کریدنے کے لیے پوچھا کہ میں جدوجہد کے کس طریقے پر یقین رکھتا ہوں؟ وہ مجھ سے معلوم یہ کرنا چاہتے تھے کہ آیا میں جوانانِ مسلمان سے تو تعلق نہیں رکھتا؟ میں نے بتایا کہ ابھی تک میں جدوجہد کے فن سے آگاہ نہیں ہوا۔ سیدھا سا ایک طالب علم ہوں، البتہ میں نے ان پر یہ واضح کیا کہ میرا اُس پارٹی سے قطعی اور ناقابل شکست تعلق ہے جو خدا کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی و قائد اور رہبر مانتی ہے۔ افغانستان کے ڈیڑھ کروڑ لوگ اسی پارٹی میں شامل ہیں۔

میری باتوں کا ان پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا۔ اگرچہ وہ دل سے اس حقیقت کو مانتے تھے کہ افغانستان اسلام کا گہوارہ ہے اور اس کا نظر باقی وجود تبدیل کرنا آسان کام نہیں ہے، لیکن چونکہ وہ "خلق" کے نمبر تھے اور ترہ کی نے انہیں روس بھجوا یا تھا اس لیے خود کو نمک حلال ثابت کر رہے تھے۔

### یہاں کوئی مسلمان نہیں

سیاحت کے لیے کریما آنے والوں پر یہ پابندی عائد ہے کہ وہ حکومت کے مقرر کردہ راستوں اور بسوں کے ذریعے ہی سفر کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنے کے علاوہ ایک روسی گاؤڈ کو ہمراہ رکھیں۔

۱۔ یہی تنظیم تھی جس نے ظاہر شاہ اور داؤد کے دور میں کفر اور الحاد کے اندھیروں کے خلاف اسلامی قوتوں کو منظم کیا اور کمیونسٹ انقلاب کے بعد جہاد کا آغاز کیا۔



ہم نے بس میں سیر کرنے کے علاوہ لالچوں کے ذریعے سمندر کے گہرے پانیوں پر بھی سفر کیا۔ ہمارا گاڑیڈ، ہمیں کریمیا کی وادیوں میں "سرخ سویرا" طلوع ہونے اور اس کے بعد کے حالات سناتا رہا، لیکن یہ کریمیا کی اصل تصویر نہ تھی۔ یہ تو اسلام اور مسلمانوں کی سرزمین تھی جو صدیوں اسلامی تہذیب کا گہوارہ رہ چکی تھی، لیکن ہمیں اس دور کے بارے میں بتانے والا کوئی نہ تھا۔

دیہات سے گزرتے وقت میری نگاہیں بے قراری سے کسی مسجد کے مینار کی تلاش کرتیں۔ شاید کسی جگہ ابھی تک کچھ آثار بچے ہوئے ہوں اور مجھے نظر آجائیں بڑک کے کنارے خستہ حال مکانات سے اندازہ لگاتا رہا کہ یقیناً ایک صدی پرانے ہونگے، مسلمانوں کے دور کے۔ ایک دو جگہوں میں پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا، اب یہاں کوئی مسلمان موجود نہیں۔ میں حیران تھا کہ اسلام کے آثار جا بجا دکھائی دے رہے ہیں، لیکن جن انسانوں نے اس کی تاریخ بنائی تھی وہ کہاں گئے۔ ایک ماہ کے دوران میری سینکڑوں لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ صرف ایک شخص نے مجھے بتایا کہ وہ مسلمان ہے۔

### یہ کھیت میرے اپنے تھے

اس کا نام یعقوب تھا۔ ۱۹۴۶ء میں جب اس کی عمر تیس برس تھی، تو اسے جلاوطنی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ وطن سے جدائی بڑا غدا ہے، بالخصوص جب کسی کو وطن عزیز سے جبری طور پر جدا کر دیا جائے تو اس کے دل پر قیامت گزر جاتی ہے یعقوب کے دل کی افسردگی اس کے لہجے میں گھلی ہوئی تھی۔ اس نے بتایا: "کریمیا دنیا کی واحد بد قسمت سرزمین ہے جہاں سے تمام اصلی باشندوں کو جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ ایک شخص بھی یہاں ایسا نہیں جس کو کریمیا کا اصلی باشندہ کہا جاسکے" خود یعقوب اور اس کے خاندان کو سینکڑوں کلومیٹر دور



نورسبک میں بھیجا گیا۔ ان کی جگہ روسیوں نے لی۔ یعقوب بظاہر سیاح بن کر وطن  
مالوف آیا تھا۔ اس نے کہا :

”اس علاقے میں ہماری یادوں کے مدفن ہیں۔ میرا بچپن اور شباب یہاں  
گزرا۔ میرے آباؤ اجداد کی ہڈیاں یہاں دفن ہیں۔ یہ کھیت، گلیاں اور  
جنگل میرے اپنے تھے۔ میں کبھی کبھار دل کے داغوں کو تازہ کرنے یہاں  
آ جاتا ہوں“

یعقوب الوشتہ کے علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس علاقے میں قدم قدم پر اس  
کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کا مرثیہ خواں تھا۔ بات کرتے  
ہوئے رو پڑتا اور روتے ہوئے کریمیا پر ٹوٹنے والی قیامت کا تذکرہ کرتا۔ اس نے  
بتایا کہ جنگِ عظیم کے خاتمے پر اشتراکی حکومت نے الزام لگایا کہ کریمیا کے عوام  
نے ہٹلر کی فوجوں کا ساتھ دیا تھا۔ سزایہ تجویز کی گئی کہ پوری آبادی کو دور دراز کے  
علاقوں میں دھکیل کر اس کی جگہ روسی قوم کے لوگوں کو لایا جائے، تاکہ آئندہ کے  
لیے حکومت کے خلاف کسی سازش کا امکان باقی نہ رہے۔ یعقوب نے اپنے  
خاندان پر گزرنے والی قیامت یوں سنائی :

”ہمیں رات کی تاریکی میں گھروں سے پکڑا گیا۔ لوگ گہری نیند میں ڈوبے ہوئے  
تھے۔ جب فوجی ٹرکوں نے ہماری بستیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جس نے  
مراحت کی، اسے گولیوں سے بھون دیا گیا۔ باقی سب کو پکڑ لیا گیا۔ بوڑھوں، جوانوں  
اور بچوں کو مشکیں کس کر ٹرکوں میں ڈال دیا گیا۔ ٹرک رات بھر چلتے رہے۔ اگلی صبح ہمیں  
کسی ریلوے اسٹیشن پر اتارا گیا۔ اس کے بعد مال گاڑی کے ڈبوں میں ڈال کر نامعلوم  
مقامات کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ کئی روز بھوکے پیاسے ریل کے ڈبے میں بند رہے۔  
کھانے پینے کا تو کیا سوال کسی کو رفع حاجت تک کی اجازت نہ تھی۔ کئی روز کے سفر



کے بعد ہم نوڈیسبریک کے مقام پر اترے۔ ہماری حالت یہ تھی کہ سینکڑوں بوڑھے اور بچے بھوک پیاس سے مرچکے تھے جو باقی بچے تھے ان کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ میرے اپنے خاندان کے نصف سے کم افراد زندہ بچے۔ ہماری بستی کے بہت سے لوگ ہم سے جدا ہو گئے۔ کچھ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور کچھ دوسری ریل گاڑیوں کے ذریعے ساہیوال اور شمال کے دور افتادہ مقامات پر ہنچا دیے گئے۔

کریمیا کے جلاوطن مسلمان یعقوب نے بتایا: ”مسلمان صرف اپنے وطن سے ہی محروم نہیں ہوئے، بلکہ تہذیب، ثقافت اور دین سے بھی جدا ہو گئے۔ دیارِ غیر میں پنچ کر ہمارے لیے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ کہیں سرچھپانے کا ٹھکانہ ملے پیٹ کی آگ بجھانے کا کچھ انتظام ہو۔ انتظامیہ کی طرف سے ہمیں غیر مبہم الفاظ میں بتادیا گیا کہ ہم دین اور وطن کے رشتوں کو جس قدر جلد بھلا دیں گے اتنا ہی ہمارے حق میں اچھا ہوگا۔ جنہوں نے سرکشی دکھائی ان کا قصہ تمام کر دیا گیا اور جنہوں نے بخوشی اشتراکیت کو گلے لگالیا، انہیں سرفراز کیا گیا۔ یہاں تک کہ بہت سے خوشامد پسندوں نے سرکار کے ہاں اتنی رسائی حاصل کر لی کہ انہیں کریمیا واپس بھیج دیا گیا۔ وہ لوگ کریمیا میں اپنے پرانے گھروں اور بستیوں میں رہتے ہیں، لیکن اپنے ماضی سے ان کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ وہ مکمل طور پر روسی معاشرے میں جذب ہو چکے ہیں۔“

یعقوب کو ساری شکایت قسمت سے تھی۔ وہ اپنے بزرگوں پر غفلت کا الزام سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا: ”ہمارے بزرگوں نے ظلم و جبر کے خلاف ہر ممکن جہت کی زاری روس کے جبر کے خلاف ان کی مزاحمت کی طویل تاریخ ہے۔ جب اشتراکی برسرِ اقتدار آ گئے تو انہوں نے ہتھیار نہیں پھینکے۔ اپنے عقیدے اور نظریے کی حفاظت کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہے، لیکن حالات نے انہیں بے بس کر دیا۔ جبر کے قوی ہاتھوں نے انہیں اپنے وطن سے اکھاڑ کر ہزاروں میل دور برفستانیوں میں تنکوں



کی طرح بکھر کر رکھ دیا۔ وہاں ہم اجنبی تہذیب کی مضبوط گرفت میں ہیں۔ اجنبی زبان، اجنبی رسم و رواج اور اجنبی ماحول میں ہماری پوری نسل کی تپہیر ہو چکی ہے۔ ہمیں اور ہمارے بچوں کو چند قرآنی آیات کے سوا کچھ یاد نہیں رہا۔ یہ بات ضرور ہے کہ انسان کے دل سے اپنی مٹی کی محبت اور عقیدے سے لگاؤ ختم نہیں ہوتا۔ میں گزشتہ تیس برس میں کئی مرتبہ یہاں آچکا ہوں۔ میری طرح دوسرے بھی آتے ہوں گے۔ میں جب بھی آتا ہوں ان دادلوں اور دیرانوں میں دیوانوں کی طرح پھرتا ہوں۔ اپنے آباؤ اجداد کی یادگاروں کو دیکھتا ہوں۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے ایک ایک نقش کو آنکھوں سے چومتا ہوں۔ کوئی قبرستان دکھائی دیتا ہے تو سارے مرنے والوں کے سراپے یاد آنے لگتے ہیں کسی تنہا جگہ بیٹھ کر آنسو بہاتا ہوں تو دل کی آگ کچھ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔“

پرائی یادیں تازہ کرتے ہوئے یعقوب خود بھی بار بار روتا تھا اور مجھے بھی اپنے ساتھ رلا دیتا تھا، اس نے کہا: ”ہمارے اجرٹنے سے پہلے اس علاقے میں ہزاروں مسجدیں تھیں۔ ان کے پر شکوہ مینار علاقے کی رونق کا مستقل حصہ تھے۔ سینکڑوں دینی مدارس اور خانقاہیں تھیں۔ اب کچھ باقی نہیں رہا۔ صرف یالتا اور الوشتہ کے درمیان والی پہاڑی پر ایک پرانا برج کھڑا نظر آتا ہے۔ اسلامی تہذیب کا یہ اکیلا نشان بھی اب گرنے والا ہے۔ کچھ دور دراز بستیوں میں مساجد اور خانقاہوں کے کھنڈر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں اس لیے باقی رکھا گیا ہے کہ کیونرسٹ یہ پروپیگنڈا کر سکیں کہ سوشلزم سے پہلے یہاں کچھ نہ تھا۔ ایسے کھنڈروں کی جگہ عظیم الشان عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔“

یعقوب نے کہا: ”بلاشبہ کیونرسٹوں نے ہمارے سروں اور ہڈیوں پر بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کر لی ہیں۔ ان شاندار کلبوں اور ہوٹلوں کے مقابلے میں کہنہ کھنڈر کیا چیز ہیں۔ لیکن کوئی ان سے یہ تو پوچھے کہ تم نے جتنے معصوموں کے سر کاٹے، بے گناہوں



کے دل چاک کیے انہیں جوڑ سکتے ہو، انہیں رفو کر سکتے ہو؟

یعقوب نے بتایا کہ روس میں مسلمانوں کو اپنے مذہب سے دور رکھنے کے لیے خصوصی قوانین بنائے گئے ہیں؛ چنانچہ اساسی دستور کی دفعہ ۱۲۱ میں ان لوگوں کو سخت سزا کا مستوجب ٹھیرا گیا ہے جو اپنے بچوں کو مذہب کی تعلیم یا ترغیب دیتے ہیں۔ اگر کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ اس میں مذہبی رجحانات موجود ہیں اور وہ دوسروں کو مذہب کی تعلیمات سے آشنا کرتا ہے تو سخت سزا کے علاوہ اسے انتخابات میں حصہ لینے، ووٹ دینے اور دوسری شہری ہولتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

یعقوب نے کئی مسلمان علماء کے نام بتائے جنہیں اسلام سے تعلق رکھنے کے "جرم" میں موت کی سزا دی گئی۔ ان میں شمالی قفقاز کے مسلمانوں کے عظیم رہنما امام نجم الدین، شیخ رضا، الدین بن فخر الدین (جو مسلمانان روس کے مفتی اعظم تھے) اور حاجی مصلح الدین قرعی زیادہ مشہور تھے۔ حال ہی میں روسی حکومت نے ایک قانون بنایا ہے جس کی رو سے مسلمانوں کو اپنے مُردوں کی علانیہ تجہیز و تکفین سے روک دیا گیا ہے۔

### کاش یہ معصوم ہی رہتے

الوشتہ میں قیام کے دوران مجھے بحری لائچوں کے ذریعے سیر و سیاحت کے متعدد بار موقع ملے۔ ہم ان سبک رفتار کشتیوں پر ساحل کے قریبی شہروں اور بستیوں کو دیکھتے ہوئے دور تک نکل جاتے تھے۔ اکثر بحری سفر کے دوران یعقوب صاحب میرے ساتھ ہوتے تھے۔ ہم دونوں قریبی نشستوں پر بیٹھتے اور گہرے نیلے پانیوں کو گھورتے ہوئے ہماری باتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ سمندر کے کنارے جنگلی مرغابیوں اور قانوں کے جھنڈ بڑے منظم طریقے سے بیٹھے رہتے اور تیز رفتار لائچوں اور



کشتیوں کی آمد پر ذرا نہ گھبراتے۔

ساحل کے قریب بچوں کے لیے متعدد آرام گاہیں بنائی گئی ہیں۔ ایسے مقامات پر معصوم بچوں کی شوخیاں اور شرارتیں بہت مزادتی تھیں۔ معصوم بچوں کے قیام کے لیے ایسے خوبصورت مقامات کا انتخاب واقعی قابلِ داد بات ہے۔ پانی پر ہلکے لیتے ہوئے رنگ برنگے بجرے شوخ مسکراتے چہروں والے بچوں کو ادھر سے ادھر لے جاتے دکھائی دیتے۔ کہیں خاموش سیرگاہوں میں سفید قمیصوں اور سیاہ پاجاموں میں ملبوس سینکڑوں بچے اکٹھے کھیل کود میں مصروف دکھائی دیتے۔ ان بچوں کے چہروں پر زندگی کا بھرپور احساس دکھائی دیتا۔ ان میں روسی بھی تھے، قازق بھی اور ازبک بھی۔ گلے میں سرخ رومال ڈالے پھولوں کی کیار یوں میں تتلیوں کی طرح تیرتے پھرتے تھے۔ میرے لیے یہ منظر ناقابلِ فراموش تھا کیونکہ میں نے روس آکر پہلی مرتبہ حقیقی خوشی کو دیکھا تھا۔

بچوں کی ان سیرگاہوں کو خوب سجاایا گیا ہے۔ ضرورت کی ہر چیز مہیا کی جاتی ہے۔ کھیل کود کے وسیع اور خوبصورت میدان، نہانے کے لیے تالاب، گھومنے پھرنے کے لیے پھولوں سے پٹے ہوئے پارک اور باغ، آرام کرنے اور سونے کے کمروں میں ہر سہولت موجود اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صحت و صفائی کا بھرپور اور مکمل انتظام اس منظر کو دیکھ کر روس کی ترقی کا کچھ اندازہ ہوتا تھا۔ جب ہم بچوں کی سیرگاہوں کی یہ کر رہے تھے تو یعقوب صاحب نے مجھ سے کہا :

”کاش یہ بچے ہمیشہ معصوم ہی رہتے۔ انہیں کبھی دوسروں کی آزادیاں چھیننے کا کام نہ سونپا جاتا۔“

ہماری قیام گاہ (الوشہ) سے چند کلومیٹر دور یالتا کا خوبصورت ساحلی شہر آباد ہے۔ یہ شہر اپنے محل وقوع اور پُر فضا مقامات کی بنا پر حسن و جمال کا سرچ نظر آتا ہے۔



جنگلات اور باغوں سے گھرے ہوئے اور سرسبز پہاڑوں کے دامن میں واقع اس شہر میں کئی تفریح گاہیں بنائی گئی ہیں۔ شہر کے مقامات میں اعلیٰ حکام اور افسروں کے لیے شاندار محلات تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان محلات کو روسی زبان میں داشا یا واپا کہتے ہیں۔ ان داشاؤں میں زندگی کی ہر سہولت میسر ہے۔ داشاؤں میں کام کرنے والے ملازمین کہتے ہیں کہ اگر دنیا میں جنت دیکھنی ہو تو کسی اعلیٰ افسر کے "داشا" کو اندر سے جا کر دیکھ لو۔ ایک ایسے ہی شخص نے مجھے کشتی کے سیر کے دوران میں بتایا کہ اگر میں چاہوں تو وہ مجھے داشا کی سیر کرا سکتا ہے (لیکن میرے لیے یہ بوجہ ناممکن تھا) میں نے اس سے پوچھا کہ آخر وہاں کیا خاص بات ہوتی ہے؟ تو اس نے بڑے فخر سے کہا:

"صاحب! وہاں دنیا کی سب سے قیمتی شراب ملتی ہے اور حسین ترین عورتیں

پائی جاتی ہیں۔"

عام لوگوں کو یالتا جانے کی اجازت نہیں دی جاتی، خصوصاً اس زمانے میں جب اہم شخصیات وہاں قیام پذیر ہوں یا غیر ملکی مہمان وہاں آئے ہوئے ہوں کسی کو شہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ لوگ خصوصی اجازت نامے لے کر وہاں جاسکتے ہیں، لیکن انہیں بھی پہلے یہ معلومات حاصل کرنی پڑتی ہیں کہ وہاں کوئی اہم شخصیت تو آئی نہیں۔ میرے ایک دوست نے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ جب وہ ایک افسر کی گاڑی میں یالتا جا رہے تھے تو انہیں رستے میں روک کر واپس بھیج دیا گیا۔ بتایا گیا کہ وہاں صدر نکسن آئے ہوئے ہیں۔

جن دنوں یالتا جانے کے اجازت نامے ملتے ہیں، شہر میں اور ساحل پر لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ جن دنوں ہم وہاں گئے، ساحلوں پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہر طرف بوڑھے، جوان، عورتیں اور مرد چنچل انچ کے ملبوسات زیب تن کیے دھوپ کھاتے نظر آتے تھے۔ یہاں اس موسم میں درجہ حرارت ۲۰ یا ۲۲ سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا



ہے، اس لیے شام تک ہجوم میں کمی نہیں آتی۔ شام کے بعد صرف وہی لوگ ساحل پر رہ جاتے ہیں جو اپنے لیے صنف مخالف کا کوئی ساتھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ایسے آوارہ جوڑے رات گئے تک ریت پر لیٹے رہتے ہیں۔

یالتا کی ایک تاریخی حیثیت بھی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل، امریکہ کے صدر روز ویلیٹ اور روس کے سربراہ شالین یہاں اکٹھے ہوئے تھے، تاکہ جرمنی کے خلاف مشترکہ لائحہ عمل طے کر سکیں۔ اس کانفرنس کو یالتا کانفرنس کا نام دیا گیا تھا۔ اس کانفرنس نے مشرق و مغرب کے فاصلوں کو سمیٹ دیا تھا۔ "سرمایہ دار" اور "پرولتاری" مل بیٹھے تھے۔ اس وقت کسی نے کوئی نظریاتی اختلاف نہ اٹھایا اور امریکہ نے روس کو اقتصادی اور فوجی امداد دینے کا اعلان کیا تھا۔



## اشتراکیت کی تدریس

یونیورسٹی میں تیسرا برس بڑی خاموشی سے آیا اور گزر گیا۔ انجینئرنگ کی تدریس کے پہلو بہ پہلو مارکسزم کی تعلیم جاری رہی۔ کبھی تو ایسا محسوس ہوتا کہ ہم صرف کمیونزم میں پاس ہونے روس آئے ہیں۔ دوسرے مضامین سے بے پروائی برتنے کی گنجائش تھی، لیکن مارکسزم کا فلسفہ پڑھانے کا اس قدر اہتمام تھا کہ کسی کے لیے اس سے غفلت برتنے کی گنجائش نہ تھی۔ پروفیسر کے لیکچرز کے علاوہ ہفتے میں ایک بار سیمینار ہوتا۔ اس کی تیاری کے لیے پیشگی مطالعہ کرنا پڑتا۔ ”ہوم ورک“ طالب علم کو مجبور کرتا کہ وہ لائبریری سے استفادہ کرے اور کمیونزم پر بھاری بھرکم کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرے۔ سیمینار کے موقع پر استاد پوری کوشش کرتے کہ طلبہ کو اس مضمون کی اہمیت کا احساس دلائیں اور اپنے انداز اور طور اطوار سے یہ بتادیں کہ ان کے نزدیک وہی طلبہ ”ہونہار“ کے زمرے میں آتے ہیں جو کمیونزم کے بارے میں معلومات میں طاق ہوں۔

بیرونی طلبہ روس میں کچھ عرصہ گزار کر اتنے ”سمجھ دار“ ہو جاتے ہیں کہ چاہے انہیں مارکسزم سے دلچسپی نہ ہو، پروفیسر کی نگاہوں میں آنے کے لیے اشتراکیت کے جال تیار بن جاتے ہیں۔ اکثر ترقی پذیر ممالک سے آنے والے طلبہ پہلے ہی سے



مارکس اور لینن کے دیوانے ہوتے ہیں، وہ مارکسزم کے کمالات اور کارناموں پر سر دھنتے نظر آتے ہیں۔ اساتذہ ایسے طلبہ کے ذوق و شوق کی مثالیں دیا کرتے تھے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی تاکید کرتے تھے۔

یونیورسٹی اور شہر میں ایسے اجتماعات ہوتے ہیں جہاں اساتذہ کی نگرانی میں غیر ملکی طلبہ کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ سوشلزم کے مختلف موضوعات پر تقاریر کر سکیں۔ چرب زبان طلبہ ان اجتماعات سے بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ان کے نام کا ڈنکا بجنے لگتا ہے۔ انہیں انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے۔ بعض گھاگ طلبہ اپنے اساتذہ کو خوش کرنے کے لیے کمیونزم اور دیگر بین الاقوامی نظریات اور نظام ہائے زندگی کے تقابلی موضوعات چھیڑ دیتے ہیں اور اپنی پوری قوت سے دوسرے نظاموں پر اشتراکیت کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جو طلبہ ایسے اجتماعات میں شریک نہ ہوں انہیں باقاعدہ تنبیہ کی جاتی ہے اساتذہ کلاس میں انہیں سرزنش کرتے اور تاکید کرتے ہیں کہ آئندہ کے لیے فعال رہیں ورنہ یونیورسٹی ان کے خلاف تادیبی کارروائی بھی کر سکتی ہے!

سیر و تفریح کے لیے مخصوص ایام میں بھی سوشلزم کی تدریس سے سچھا نہیں چھوٹتا۔ طلبہ کو جس شہر کی سیر کرائی جاتی ہے، سب سے پہلے وہاں کا انقلابی میوزیم دکھایا جاتا ہے۔ سفر کے دوران میں اساتذہ ہلکے پھلکے انداز میں لینن کی تعلیمات اور طرز زندگی کے بارے میں طلبہ کو 'بریف' کرتے رہتے ہیں۔ جن کلاسوں میں روسی زبان سکھائی جاتی ہے، وہاں بھی مارکسزم کی تعلیم مرکزی موضوع ہوتی ہے۔ کتابوں کے قصے، کہانیاں، محاورے اور ضرب الامثال تک میں کمیونسٹ پارٹی کے اہم کارناموں اور اہم شوٹ فائڈین کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ہمیں مارکسزم کا فلسفہ ایک خاتون پڑھاتی تھیں۔ ان کا نام کا پتیا یعنی تھا میری



ان سے کئی مرتبہ اختلافی گفتگو ہوئی۔ وہ وسیع النظر خاتون تھیں اور میری مخالفانہ باتوں پر ناراض نہ ہوتی تھیں۔ حالانکہ ہماری کلاس میں کئی غیر ملکی طلبہ موجود تھے، لیکن وہ جب بھی اسلام کا نام لیتیں، ان کی نگاہ میری جانب اٹھتی تھی۔ ایک روز طبقاتی معاشرے پر گفتگو ہو رہی تھی تو مجھے مخاطب کر کے کہنے لگیں :

”اسلام کا فلسفہ کتنے طبقوں کا قائل ہے؟“

میں نے انہیں بتایا کہ اسلام کے نزدیک انسانوں کے صرف دو طبقے ہیں۔ ایک مسلم دوسرا غیر مسلم۔ کوئی تیسرا طبقہ اسلام میں موجود نہیں۔ مزدور، سرمایہ دار اور جاگیردار جیسے طبقوں میں انسانوں کی تقسیم کو اسلام ناروا قرار دیتا ہے۔ اس پرس کا پتیا لینی نے بڑی وسعت قلبی کا ثبوت دیا اور کہا :

”پھر یہ تو نظریہ قابل مطالعہ اور لائق ستائش ہے۔“

اس کے بعد ان سے اسلام اور کمیونزم کے بارے میں کئی بار گفتگو ہوتی رہی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

### اڈیسہ میں ایک ماہ

تیسرے برس کے نصاب کی تکمیل کے انعام کے طور پر ایک ماہ کی تفریحی چھٹی ملی۔ اس مرتبہ بہت تاریخی شہر اڈیسہ بھیجا گیا۔ یہاں ہماری رہائش کا انتظام ”گور کی سینی ٹوریم“ میں کیا گیا تھا۔ بحیرہ اسود کے ساحل پر واقع یہ شہر اپنی کئی خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ روس بھر میں اس شہر کو اپنے معتدل موسم کی وجہ سے سیاحوں کی جنت سمجھا جاتا ہے۔ تقریباً ۱۵۵ مربع میل رقبے پر پھیلے ہوا یہ ایک ملین آبادی کا شہر ہے۔ یوں تو یہاں ہر موسم میں سیاحوں کی بھیڑ رہتی ہے لیکن گرمی کے موسم میں جب ساحل کی ریت گرم ہو جاتی ہے غسل آفتابی کے شیدائی یہاں غولوں کی شکل میں اٹھ آتے ہیں۔



صحت افزا مقام کے طور پر اڈلیسہ کی شہرت کافی پرانی ہے۔ نصف صدی پہلے یہاں یوکرینی ادارہ برائے تفریح و صحت کا قیام عمل میں آیا۔ اب تو ہر سال لاکھوں افراد اس شہر کے مضافات میں واقع صحت بخش مراکز پر اپنی جسمانی ٹوٹ بھوٹ کا علاج تلاش کرنے آتے ہیں۔ بڑوں کے علاوہ یہاں چھوٹے بچوں کے لیے علاج اور تفریح کے بڑے بڑے مراکز بنائے گئے ہیں اور ان میں تفریح کے علاوہ تعلیم و تدریس کا بھی انتظام ہے۔

یہاں بحیرہ اسود پر بحری جہازوں کی تعمیر و مرمت کا سب سے بڑا بارڈ ہے۔ اس کے علاوہ فولاد کی مصنوعات، زرعی آلات، کمپیوٹر اور دوسری جدید مصنوعات تیار کرنے کے کئی کارخانے ہیں، تاہم جس بات نے اڈلیسہ کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں وہ ہیں یہاں کی بحری جہلیں۔ یہ جہلیں نہ صرف دیکھنے والوں کو ناقابل فراموش تازگی اور فرحت بخشتی ہیں، بلکہ ان کا معدنی پانی اور کچھ کڑی بیماریوں کے علاج کے لیے نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔

اڈلیسہ کی تاریخ زیادہ پرانی نہ سہی، شاندار ضرور ہے۔ سوہویں صدی میں تاتاریوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، ترکوں نے اسے دوبارہ آباد کیا۔ ۱۸۷۷ء میں روسیوں نے اسے مسلمانوں سے چھین لیا۔ اس کے بعد شہر کو نئی بنیادوں پر تعمیر کیا گیا۔ اس کا نام اڈلیسہ قدیم یونانی شہر اڈلیسیس کے نام پر رکھا گیا۔ اس وقت تک یہ خیال تھا کہ اڈلیسیس نامی شہر اسی مقام پر آباد تھا، لیکن بعد میں اس خیال کو تردید ہو گئی جب اڈلیسیس کے آثار بلغاریہ کے شہر ورننا کے قریب ملے۔

اڈلیسہ کی تعمیر نو کی نگرانی بڑے نامور ماہرین تعمیرات نے کی، ملکہ کیتھرین دوم کی ہدایات پر عالی شان محلات اور گر جاگھر تعمیر ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں ملکہ چل بسی تو اس کے بیٹے پاول اول نے شہر کی تعمیر کو ادی۔ اس کے خیال میں ساحل سمندر پر ایسی



پُر تعیش عمارات کا کوئی جواز نہ تھا۔ بادشاہ کے اس اقدام سے روسی تاجر بہت پریشان ہوئے۔ ان کے خیال میں اتنی خوبصورت اور مفید بندرگاہ کی تعمیر کارک جانا بہت نقصان دہ بات تھی۔ انہوں نے بادشاہ کی خدمت میں تین ہزار در آمد کردہ مالٹوں کا تحفہ پیش کیا اور اس سے ڈھائی لاکھ روپے کے قرضے کی درخواست کی، تاکہ بندرگاہ کی تعمیر مکمل کرائی جاسکے۔ بادشاہ مالٹوں کے تحفے سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے قرضے کی مطلوبہ درخواست پوری کر دی اور شہر کی رکی ہوئی تعمیر تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کرنے لگی اور جب یہ مرحلہ مکمل ہو گیا تو جلد ہی اڈلیسہ یورپ اور ایشیا کے تاجروں کا مرکز بن گیا۔

انیسویں صدی کے اختتام تک اڈلیسہ میں کئی چھوٹے بڑے کارخانے بن گئے اور رفتہ رفتہ یہ ساحلی شہر تجارتی اور صنعتی مرکز بنتا چلا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اڈلیسہ شہر دوبرس کے لیے جرمنوں کے قبضے میں رہا۔ شہر کے عوام خوراک، پانی اور دوسرے سامان کی رسد سے محروم ہو گئے۔ پینے کے پانی کی بھی راشن بندی تھی۔ ہزاروں روسی فوجی شہر میں محصور ہو گئے۔ اس موقع پر مدافعت کرنے والوں نے شہر کی قدیم زبر زمین سرنگوں سے بہت فائدہ اٹھایا اور اس جدوجہد کے نتیجے میں دس اپریل ۱۹۴۴ء کو تیسری یوکرینی کمان کے دستوں نے شہر کو جرمن قبضے سے آزاد کرالیا۔ اور اڈلیسہ کو سیر و شہر کا خطاب دیا گیا۔

### قابل دید مقامات

اس شہر کے قابل دید مقامات میں سے ایک یہاں کی قدیم سرنگیں "کانا کو مب" ہیں۔ ان سرنگوں میں داخل ہونے کے لیے سطح زمین پر کئی مقامات پر سوراخ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی سیر کرتے ہوئے انسان تصوراتی طور پر جنوں اور پریوں کے دیس میں پہنچ جاتا ہے۔



بہت سے لوگوں نے ہمیں ڈرایا کہ ان سرنگوں میں بعض ایسی بھی ہیں جہاں صرف داخل ہونے کے راستے ہیں۔ واپسی پر آدمی کھوجانا ہے۔ کئی ایسے قصے سنائے گئے کہ کس طرح پورے قافلے ان سرنگوں میں ایسے غائب ہوئے کہ واپس نہ آ سکے لیکن ہمیں تو ان زمین دوز راستوں پر چل کر بڑا لطف آیا۔ تازہ ہوا آنے کا انتظام بھی بہت عمدہ تھا۔

کہتے ہیں، دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں گوریلوں نے ان سرنگوں سے بہت استفادہ کیا۔ وہ جرمن فوجوں پر حملہ کر کے یہاں چھپ جاتے تھے۔ جرمنوں نے بعض جگہ سرنگوں میں پانی چھوڑ دیا، لیکن وہ گوریلوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ وہ نشیبی جگہیں چھوڑ کر اونچی جگہوں پر جا چھپے جہاں پانی نہ پہنچ سکتا تھا۔ ان سرنگوں میں سے بعض کئی کئی میل لمبی ہیں۔

ان کوتاہیوں کی ساخت عجیب و غریب ہے۔ چکنی مٹی اور پتھر لیے مسالے سے سرنگ کی دیواریں بالکل سینٹ کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ بعض جگہیں کشادہ ہیں اور بعض اتنی تنگ کہ ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا ہے۔

انہیں کب اور کس نے تعمیر کیا؟ اس کے بارے میں کوئی بات یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں فوجی مقصد کے تحت ہزاروں سال پہلے تعمیر کیا گیا تھا، لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عمارتوں کی تعمیر کے لیے مٹی کھودتے کھودتے یہ سرنگیں وجود میں آ گئیں، لیکن یہ بات اس لیے قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ ایک تو یہاں کی زمین اتنی سخت ہے کہ اسے کھودنا بہت مشکل ہے۔ دوسرے اگر یہاں سے مٹی لے جاتی تو گرٹھے بنتے نہ کہ خوبصورت زمین دوز راستے اور سرنگیں وجود میں آ جاتیں!

اڈلیہ کے گرجا گھر بھی قابلِ دید مقامات میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمارے گائیڈ نے دو کلیساؤں کی سیر کرائی۔ ایک گرجا گھر میں ہماری ملاقات بشپ سے ہوئی۔ کالے کپڑوں



اور کافی ٹوپی میں ادا سر سکر اسٹ سے ہمارا استقبال کیا اور رٹے رٹائے فقروں سے گرجا گھر کے بارے میں تاریخی معلومات دیں۔ اس کے بعد حضرت مریمؑ کی قد آدم تصویر کے عین نیچے جا کھڑے ہوئے اور آنکھیں بند کر کے دعائیں پڑھنے لگے۔ سامعین نے زور زور سے آمین کہی۔ میرے ایک روسی ساتھی نے میرے پہلو میں ٹھوکا دیتے ہوئے کہا: ”بشپ کی اداکاری سے متاثر نہ ہونا۔ یہ پکا کمیونسٹ ہے۔ لوگوں کو

بے وقوف بنانے کے لیے اسے یہ دعائیں سکھائی گئی ہیں۔“

میرے لیے بشپ سے زیادہ گر جا گھر کی دلکش عمارت متاثر کن تھی۔ بلند و بالا مخروطی مینار اور محرابیں اور چوب کاری کا کام نہایت دیدہ زیب ہے۔ اڈلیسہ میں کئی گر جا گھر ہیں جو زاروں کے عہد میں تعمیر کیے گئے تھے۔ اب ان کی حیثیت نمائش گاہوں سے زیادہ نہیں۔ ان گر جا گھروں میں مختلف مذہبی خدمات انجام دینے والے پادری اور دوسرے لوگ باقاعدہ سرکاری ملازم ہیں۔

اڈلیسہ کی عمارتوں میں سب سے زیادہ مشہور ”اوپیرا تھیٹر“ ہے۔ یہ عمارت سو سال پہلے تعمیر کی گئی تھی۔ بتایا گیا یہ عمارت پوری دنیا میں بے مثال ہے۔ اس کے اندرونی اور بیرونی دیواروں پر مصوری اور فنون لطیفہ کے نہایت خوبصورت نمونے دیکھنے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔ ہال میں تقریباً دو ہزار افراد بیٹھ کر رقص و سرود اور دوسرے کھیل تماشے دیکھ سکتے ہیں۔ تھیٹر کی بالکونیوں سے سمندر کا نظارہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

اڈلیسہ کے سرکاری ہمان خانوں اور آرام گاہوں میں صرف وہ لوگ ٹھیر سکتے ہیں جن کے پاس خصوصی اجازت نامے ہوتے ہیں۔ ایسے اجازت نامے عموماً ایک ماہ کے لیے دیے جاتے۔ یہاں آنے والوں کی اکثریت دور دراز کے روسی شہروں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ سرکاری افسروں اور فوجی عہدیداروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کچھ



لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں سرکاری رہائش گاہوں میں ٹھہرنے کے اجازت نامے نہیں ملتے، وہ یہاں ٹھہرے ہوئے لوگوں کے "مہمان" بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیادہ تر ایسی عورتیں اس کی کوشش کرتی ہیں، جو چلتے پھرتے جنسی کاروبار کرتی ہیں۔ ایسی عورتیں ہزاروں کی تعداد میں قریبی شہروں سے اڈلیسہ آتی ہیں اور شہر میں تیلیوں کی طرح مشکتی پھرتی ہیں۔ یہ کئی رستورانوں میں اچانک کسی اجنبی کی میز پر پہنچ کر اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیتی ہیں۔ راستے میں چلتے ہوئے راہگیروں سے بے حجاب گفتگو کرتی ہیں یہاں تک کہ سیاحوں کے رہائشی کمروں کے دروازوں دستک دے کر بھی پوچھ لیتی ہیں کہ انہیں تنہائی کے کسی ساتھی کی حاجت تو نہیں؟ اس طرح چند روز کے لیے رہائش کا ٹھکانا اور سامان عیش و طرب بھی مل جاتا ہے اور بعض امیر لوگ انہیں ایک تحفہ یا نقد رقم بھی دے جاتے ہیں۔

اڈلیسہ پہنچنے پر ہماری نگران پروفیسر کا پتیا لینی نے ہمیں سب سے پہلے جو ہدایت دی وہ یہ تھی کہ ہم ایسے لوگوں سے ملنے جلنے سے گریز کریں جن کے پاس سرکاری رہائش گاہوں میں ٹھہرنے کے اجازت نامے نہ ہوں انہوں نے خاص طور پر ایسی عورتوں سے بچنے کی تلقین کی جو محض چند روزہ قیام و طعام کے لیے راستوں میں دست سوال کرتی پھرتی ہیں۔

پروفیسر کا پتیا لینی ہمارے فلسفے کی استاد تھیں، بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں علمی گفتگو میں بہت دلچسپی لیتی تھیں اور مجھے مسلمان جان کر اسلام اور کمیونزم پر بحث و مناظرے میں الجھائے رہتی تھیں۔ ہمارے گروپ میں میرے علاوہ بارہ دوسرے غیر ملکی طلبہ شامل تھے، لیکن ان کا روئے سخن اکثر میری جانب ہوتا تھا۔



## استاد سے اختلافی بحث

جس روز ہم اڈلیہ پہنچے، مس کا پتیا لینی نے اسی روز مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا کہ میں ان کے ساتھ مذہب پر گفتگو کروں، تاکہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو سکے۔ میں نے معذرت کی اور ان سے کہا، میری ان سے اختلافی گفتگو کیسے ممکن ہے جب کہ وہ ایک عالم اور فاضل استاد ہیں اور میں ایک ادنیٰ طالب علم۔ دوسرے ایک خالصہ تفریحی ماحول میں ایسی سنجیدہ بحث کا کوئی جواز بھی نہ تھا، مگر پروفیسر کا پتیا اپنی بات پر مصر رہیں۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اگر میں ان سے کسی بات پر اختلاف کرتا ہوں تو انہیں خوشی ہوتی ہے اور یہ کہ میرے دلائل کا خیر مقدم کریں گی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک شرط عائد کی کہ اگر وہ مجھے دلائل میں مات دے دیں تو میں مارکسزم پر ایمان لے آؤں گا۔

میں نے عرض کیا: ”آپ مارکسزم کے فلسفے پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتی ہیں جبکہ میں اسلامی فلسفے کے مبانیات سے بھی آگاہ نہیں۔ پھر ہماری گفتگو برابری کی سطح پر کیے ہو سکتی ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ آپ مجھ سے اسلام کے بارے میں کچھ سوال کریں، تو اپنے ناقص علم کی حد تک میں اس کا جواب دوں۔ بہت ممکن ہے کہ میں اس امتحان میں پاس ہو جاؤں“

اس پر فیصلہ ہو گیا اور گفتگو کے لیے ہم نے روزانہ شام کے کھانے کے بعد کا وقت رکھا۔ قیام گاہ کے باہر کرسیوں پر بیٹھ کر ہم گفتگو شروع کرتے تو دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اس پروگرام کے مطابق ہمارے درمیان خالصہ علمی انداز کی بحث جاری رہی۔ وہ میری استاد ہونے کے باوجود طالب علمانہ انداز اپنائے رہیں اور میں شاگرد ہونے کے باوجود ان کے دلائل کی نفی کرتا رہا۔ یہ سلسلہ خاصا دلچسپ رہا، لیکن انجام کار وہ نہ میرے موقف کو قبول کر سکیں نہ مجھے اپنے فلسفیانہ دلائل سے متاثر کر سکیں۔



مس کا پتیا لینی کی طرح خدا کا انکار کرنے والے ہر فلسفی اور دستور کی ایک مجبوری یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز کی طرح جسے اپنے حواسِ خمسہ سے جانچ نہ سکیں، خدا کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ انسان کو انسان کی کوتاہ دامنی کا اندازہ تھا، اسی لیے کتابِ ہدایت کے آغاز ہی میں اس بات کی تصریح کر دی گئی کہ خدا کو اور اس کی تمام نادیدہ قوتوں کو بن بکھ اور بلا جانچے مان لو :

”یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پر ہیزگا لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں“ (بقرہ - ۲-۲)۔

وہ اس بات پر بہت اصرار کرتی تھیں کہ کسی ایسی چیز کو تسلیم کر لینا جسے انسان دیکھ اور سن نہ سکے بڑی غیر علمی بات ہے۔ میں نے انہیں کئی ایسی چیزوں کی طرف توجہ دلائی کہ جنہیں آج کا جدید ترین فلسفی اور سائنسدان بھی دیکھے بغیر ماننے پر مجبور ہے، مگر وہ ہر بات کے جواب میں کوئی توجیہ پیش کر دیتی تھیں۔ مثلاً کیا سرجری کے ماہرین کے اس بیان پر کہ وہ آئے دن انسانی جسم کے ریشے ریشے اور رگ رگ کی جراحی کرتے ہیں، لیکن انہیں روح کہیں دکھائی نہیں دی، ہم روح کی موجودگی کا انکار کر دیں۔ اگر انکار کر بھی دیں، تو کیا موت جیسی حقیقت سے منکر ہو سکتے ہیں؟

میری اس بات کا جواب انہوں نے فلسفیانہ موشگافی سے دیا۔ ان کے جواب میں الجھادے کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن تیسرے روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہماری استاد کو لا جواب کر دیا۔

### خدا یا خیر!

اس روز بحیرہٴ اسود کی سیر کا پروگرام تھا۔ مس کا پتیا لینی کی قیادت میں لڑکوں لڑکیوں کی ٹولیاں بسوں میں خوش گپیاں کرتی ہوئی سمندر کے کنارے اس مقام پر پہنچیں



جہاں سے ہیں لاپنج پر سوار ہو کر سمندر کی سیر پر روانہ ہونا تھا۔ چونکہ دوپہر کے کھانے پر یہیں مہمان خانے میں واپس پہنچنا تھا، اس لیے ہم صبح سویرے ہی روانہ ہو گئے، تاکہ سمندر کی سیر کے لیے خاصا وقت مل سکے۔ سورج کی شعائیں بجڑا سود کے سینے پر سنہرے تمنے سجا رہی تھیں اور خنک ہوا ہمیں خوش گوار سفر کی نوید دے رہی تھی۔ ہم لاپنج پر سوار ہوئے اور لاپنج نے ایک پھریری لے کر سفر کا آغاز کیا۔ ابتدا میں لاپنج نے کئی شدید جھٹکے کھائے جس سے ہمارے گروپ کے اکثر کمزور دل لڑکے اور لڑکیاں خوفزدہ ہو گئے۔ پروفیسر کانپتیا یعنی میرے قریب ہی بیٹھیں تھیں انہوں نے عیسائی کیتھولک فرقے کی رسم کے مطابق اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور خوفزدہ لہجے میں کہا :

”اوگو سپاری، پوماگی“ (خدا یا خیر!)

میں نے حیرت سے پوچھا: ”آپ تو خدا پر یقین نہیں رکھتیں، پھر اس کا مطلب؟“ وہ کہنے لگیں: ”وہ اضطراری فعل تھا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ میں خدا پر یقین رکھتی ہوں۔“

مجھے اس موقع پر سورہ یونس کی وہ آیات یاد آگئیں جن میں کہا گیا ہے :

”وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے، چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحان و شادان سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بن جائیں گے۔“

مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر روئے زمین پر بغاوت کرنے لگتے ہیں۔“ (سورہ یونس - ۲۲-۲۳)



مجھے سمندر کے سینے پر تیرتی ہوئی کشتی میں بیٹھ کر یہ آیات تلاوت کرنے میں بہت لطف آیا۔ اگرچہ میں آیات کی تلاوت زیر لب کر رہا تھا، مگر مس کا پتیا یعنی میری کیفیت دیکھ کر بجانب گئیں۔ کہنے لگیں:

”معلوم ہوتا ہے تم بھی ڈرے ہوئے ہو اور اپنے خدا کو پکار رہے ہو!“

میں نے انہیں قرآن کی آیات سنا کر ترجمہ بتایا، تو وہ مزید خوفزدہ ہو گئیں کہنے لگیں:

”تمہاری کتاب تو بہت عجیب ہے۔ انسان کی اندرونی کیفیت کو کیسے جان لیتی ہے؟“

میں نے انہیں قرآن پاک کی متعدد ایسی آیات کا ترجمہ سنایا جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ مصیبت کے وقت سخت دل اور منکر خدا لوگ بھی خدا کو پکارتے ہیں۔ اس سے چپکے چپکے اور گڑ گڑا گڑا کر مدد مانگتے ہیں، مگر جب ان کی مصیبت ٹل جاتی ہے تو پھر سے دوسرے معبودوں کی پوجا کرنے لگتے ہیں۔ میری باتیں ان کے دل کو لگیں۔ کہنے لگیں:

”یہاں روس میں تو بالکل یہی صورت حال ہے۔ جب ہم پر مصیبت آتی ہے تو ہم خدا اور مسیح سے مدد مانگتے ہیں۔“

میں نے لوہے کو گرم دیکھتے ہوئے چوٹ لگائی: ”آپ اپنے دل کی بات بتائیے۔ آپ کے ضمیر کا فیصلہ کیا ہے؟“

وہ میرے سوال کو تو گول گر گئیں، لیکن یہ بات انہوں نے کھلے دل سے تسلیم کی کہ بڑے بڑے کیونسلٹ اور دہریت کے مبلغ ابھی تک پوری طرح مذہب کی گرفت سے آزاد نہیں ہوئے۔ خدا ان کے دل یا دماغ کے کسی نہ کسی گوشے میں ضرور موجود رہتا ہے اپنے والدین کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ وہ مذہبی لوگ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی اولاد ان کے نقش قدم پر چلے، مگر روس میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں کیونکہ نظام تعلیم میں مذہب کی کوئی گنجائش نہیں۔

مس کا پتیا یعنی کو بہت افسوس تھا کہ وہ مذہب کی تعلیم حاصل نہ کر سکیں، ورنہ شاید



وہ بھی مذہبی ہوتیں۔ ان کا خیال تھا کہ روس سے مذہب کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے کئی سو برس درکار ہوں گے۔ کیونکہ ساٹھ برس کی جدوجہد کے باوجود لوگ پوری طرح مذہب کی گرفت میں ہیں۔

کاپتیا لینی مذہب کی مخالف تو تھیں، لیکن ان کے دل میں مذہب کے لیے ایک نرم گوشہ ضرور موجود تھا، لیکن ان کا منصب اور حالات انہیں اس بات کی اجازت نہ دیتے تھے کہ وہ سچائی کی تلاش کر سکیں۔ کشتی کی سیر کے دوران میں انہوں نے مجھے بتایا کہ روسی نوجوانوں نے کمیونزم سے ناٹھ توڑ لیا ہے۔ وہ تیزی سے مذہب کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ کمیونزم اور دہریت کے خلاف شدید نفرت ایک تحریک کی شکل میں ابھر رہی ہے۔ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں سچی ازم کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال کمیونسٹوں کے لیے سخت پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے۔

### پروفیسر صاحبہ کو دوست مل گیا

سفر کے دوران میں ہماری پروفیسر صاحبہ نے اپنی تنہائی کا ساتھی تلاش کر لیا۔ یہ صاحبہ جو اڈیسہ سیر کے لیے آئے ہوئے تھے اور ہمارے ساتھ لاپنچ پر سیر کے لیے گئے تھے، کشتی پر ہی ہم سے متعارف ہوئے تھے۔ عمر میں مس کاپتیا لینی سے چھوٹے ہی ہوں گے۔ روس کے نظریاتی قائد لینن کے ہم نام تھے۔ ہم سفر سے واپس قیام گاہ پر پہنچے، تو وہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ دونوں باہر چلے گئے۔ جانے سے پہلے پروفیسر کاپتیا لینی نے بتایا تھا کہ وہ جلد ہی واپس آجائیں گی اور شام کے بعد ہماری نظریاتی بحث کی نشست ہوگی، لیکن وہ رات گیارہ بجے سے پہلے واپس نہ آ سکیں۔

واپسی پر پروفیسر صاحبہ کا حلیہ مختلف ہو چکا تھا۔ دلاویا کے شانے پر ہاتھ رکھے



ہوئے ان کے قدم بہک رہے تھے۔ میری طرح جن طلبہ کو اپنی استاد کے در سے آنے پر تشویش تھی وہ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس شخص نے کاپتیا لینی کے ساتھ کوئی بد تمیزی کی ہے، اس لیے میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟ لیکن ہماری حیرت کاپتیا لینی صاحبہ نے یہ کہہ کر دور کر دی کہ ولادیمیر ایوانوویچ ان کا دوست ہے اور وہ اس کے ساتھ ہوا خوری کے لیے گئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے معذرت کی کہ چونکہ آج وہ تفریح طبع کے موڑ میں ہیں اس لیے بحث نہ کر سکیں گی۔ کل اس کی تلافی ہو جائے گی۔

ولادیمیر جو پروفیسر صاحبہ کا ہاتھ تھامے ہوئے شراب کے نشے میں مست جھوم رہا تھا، درمیان میں بول پڑا: ”ہم نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا ہے۔ یہ اب بہت جلد میرے ساتھ چلی جائے گی تم کسی دوسری استانی کا بندوبست کر لو۔“ کاپتیا لینی صاحبہ نے شرما تے ہوئے کہا: ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تمہیں دوست سمجھتی ہوں، تم سے شادی تو نہیں کر سکتی۔“

”کیوں نہیں کر سکتیں شادی؟ یہ ان کے دوست کا سوال تھا۔“

”میں تو پہلے سے شادی شدہ ہوں۔“

ولادیمیر ایوانوویچ نشے میں دھت تھا۔ وہ رات اپنی دوست کے ساتھ ٹھیرنا چاہتا تھا، مگر وہ اسے ساتھ ٹھیرانے پر راضی نہ تھیں۔ (شاید ان کا نشہ حد اعتدال کے اندر تھا) بڑی مشکل سے طلبہ نے ولادیمیر کو دھکے دے کر وہاں سے نکالا۔

دوسرے روز پروفیسر کاپتیا لینی پھر لاپتہ ہو گئیں۔ رات گئے اسی جیلے اور اندا میں ان کی واپسی ہوئی۔ ولادیمیر آج بھی ان کے ساتھ تھا۔ شراب کی بوتل اس کی جیب میں ٹھنسی ہوئی تھی اور وہ بار بار اسے نکال کر چسکی لگا لیتا تھا۔ اس روز وہ بڑے جارحانہ موڈ میں تھا۔ رات ہماری قیام گاہ میں گزارنے پر بضد تھا، لیکن ہم نے اسے وہاں نہ



ٹھکنے دیا۔ اپنی پروفیسر پر ہمارا بس نہ چلتا تھا، لیکن ہم کسی ایرے غیرے کو اس سے دُور تو رکھ سکتے تھے۔

چلتے وقت ولادیسیر مجھے کمیونزم پر مناظرے کا چیلنج دینے لگا۔ میرے معذرت کرنے پر اسے غصہ آگیا۔ بات بگڑ جاتی، لیکن پروفیسر کا پتیا لینی نے بڑی حکمت سے اس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد پروفیسر صاحبہ نے مجھے گزشتہ دنوں کی طرح بحث جاری رکھنے کی دعوت دی، لیکن میں نے کہا کہ وہ اب اس سلسلے کو ختم کر دیں، اس لیے کہ اس ماحول میں میرا اختلافی موضوعات پر گفتگو کرنا ہم دونوں کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

دوسرے روز پروفیسر کا پتیا لینی نے گزشتہ رات کے واقعے پر اظہارِ ندامت کیا اور مارکس کے جدلی فلسفے پر تشنہ گفتگو کے سلسلے کا پھر سے آغاز کر دیا۔ بعد میں ہم جتنے روز اڈیسیہ میں رہے یہ گفتگو جاری رہی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میری فلسفی استاد نے نہ صرف بڑی فراخ دلی سے میرے اختلاف رائے کو برداشت کیا، بلکہ کئی بار میرے استدلال کی داد دی۔ انہوں نے مجھ پر اپنی رائے ٹھونسنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ یہ گفتگو بہت طویل اور پیچیدہ تھی جو ایک الگ کتاب کا موضوع ہے۔ اس لیے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

### افغان فوجی افسروں سے ملاقات

اڈیسیہ میں کئی علمی اور فوجی تربیت کے ادارے بھی ہیں۔ افغانستان سے روس جاکر تربیت حاصل کرنے والے بہت سے فوجی افسر اڈیسیہ بھیجے جاتے ہیں۔ جن دنوں ہم اڈیسیہ گئے، وہاں زیر تربیت افغان افسروں کی خاصی تعداد موجود تھی، لیکن میری ملاقات جن فوجی افسروں سے ہوئی، وہ سیر و تفریح کی غرض سے اڈیسیہ آئے ہوئے



تھے۔ دربارِ غیر میں اپنوں کا وجود بہت غنیمت معلوم ہوا، لیکن ہم وطنوں سے ملاقات میرے لیے خوشی سے زیادہ صدمے اور شرمندگی کا باعث بنی۔ انہیں دیکھا، ان کو باتیں سنیں اور ان کے معمولات دیکھے، تو پتہ چلا کہ اب وہ نام کے افغان رہ گئے ہیں ورنہ ان کا کردار اتنا پست ہو چکا ہے کہ اب ان کے اور روسیوں کے درمیان کچھ زیادہ فرق باقی نہیں رہا۔

ان سے ملاقات بھی خاصے عجیب انداز میں ہوئی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ اچانک دو شخص میرے کمرے کا دروازہ کھول کر، بغیر اجازت لیے اندر داخل ہو گئے۔ فارسی زبان میں مجھے مخاطب کیا اور کہنے لگے: ”ہم نے تمہارے بارے میں سنا تھا کہ یہاں آئے ہوئے ہو اور افغان ہو تو سوچا کہ تم سے مل لیں۔ ہم بھی افغان ہیں“ میں نے انہیں خوش آمدید کہا۔ عزت سے اٹھایا اور پیل پیش کیے۔ میں بہت خوش ہوا کہ چلو اس اجنبی دیس میں کوئی ہم زبان تو ملا، مگر میری خوشی بہت جلد کا فور ہو گئی۔ ان کا اندازِ گفتگو نہ صرف سطحی اور بازاری تھا، بلکہ حد درجہ دل آزار بھی تھا۔

میں اپنے وطن کے حوالے سے بات کرنا چاہتا تھا، مگر وہ روس کے حسینوں اور نازنینوں کے بارے میں گفتگو کرنے آئے تھے۔ جب مجھے اس سلسلے میں زاہد خشک پایا تو اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اگر روس آکر بھی کسی شخص کی دقتِ نوشت ختم نہ ہو، تو اس سے زیادہ بد نصیب کون ہو سکتا ہے۔

میرے پوچھنے پر کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، انہوں نے کہا: ”خوب عیش کرو، مزے اڑاؤ۔ افغانستان جاؤ گے تو یہ سہانے دن تمہیں یاد آئیں گے۔ یہاں شراب برائے نام قیمت پر ملتی ہے۔ نہایت حسین عورتیں بے حد ارزاں ہیں اور یاد رکھو جوانی بار بار نہیں آیا کرتی“

میں نے جواباً پوچھا: ”کیا آپ کا پڑھنے کو جی نہیں چاہتا؟“



سیری بات سن کر دونوں خوب ہنسے پھر ایک صاحب نے طنزاً کہا : ” غالباً آپ پڑھنے کے لیے تشریف لائے ہیں ؟“

میں نے ان کے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا : ” کم از کم ڈگری حاصل کرنے کے لیے توجہ و جہد کرنی پڑے گی۔“

کہنے لگے : ” یہاں کون پڑھنے آتا ہے ، یہ چھ برس تو ہمیں ہمارے عظیم ہمسائے روس نے تحفے میں دیے ہیں ۔ وہ چاہتے ہیں ہم ان کے مہمان بنیں ، عیش کریں ڈگری تو مل ہی جاتی ہے ۔ یہاں سے فیل ہو کر کون جاتا ہے ؟“

انہوں نے بتایا کہ فوجی اداروں میں تعلیم کے لیے بہت محدود اوقات ہیں ۔ کچھ وقت لائبریری میں کتابوں کے نوٹ لینے پڑتے ہیں ۔ کتاب ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ۔ کالج کے باہر کا وقت فارغ ہوتا ہے ۔ اب یا تو اس میں بیٹھے مکھیاں مارتے رہیں یا اس کا ”صحیح“ استعمال کریں ۔ تھیٹروں سینماؤں اور رقص گاہوں میں جائیں ۔ بھنوروں کی طرح اچھے اچھے پھول تلاش کریں ۔ یہیں یقین دلایا گیا ہے کہ چاہے ہم پڑھیں یا نہ پڑھیں یہیں ڈگری سے محروم نہ کیا جائے گا ۔

### چور بازار میں

اڈیسہ میں غیر ملکی اشیاء با افراط مل جاتی ہیں ۔ دوسرے ممالک سے آنے والے جہاز بندر گاہ میں لنگر انداز ہوتے ، تو جاپان کے ریڈیو ، ٹیپ ریکارڈر ، گھڑیاں اور مغربی ممالک کے ملبوسات اور سامانِ تعیش اڈیسہ کے چور بازاروں میں پہنچ جاتا ہے ۔ روسی نوجوانوں کی اکثریت مغربی ممالک کے اشیاء کی دیوانی ہے ۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں بیرونی ممالک کے ملاحوں سے روابط استوار کر لیتے ہیں اور معمولی چیزوں کے بدلے بھاری رقم ادا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے ۔ اڈیسہ میں بعض لوگوں نے بتایا کہ یہاں



غیر مالک کا آتشیں اسلحہ بھی سہل ہو کر پہنچتا ہے، لیکن بے حد مہنگا ہونے کی وجہ سے اس کی خرید و فروخت محدود ہے۔ ہم نے بھی یہ بازار دیکھا، لیکن کوئی چیز ہماری پسند کی نہ تھی۔

## زرعی فارم ہیں

اڈیسہ میں قیام کے دوران میں ایک روز ہمیں ایک مقامی کلخوز (زرعی فارم) میں دعوت پر بلایا گیا۔ شہر کے مضافات میں واقع اس کلخوز پر ہمیں ایک بس کے ذریعے لے جایا گیا۔ ہمارا استقبال فارم کے افسروں اور کاشت کاروں نے مل کر کیا۔ سب سے پہلے ہم نے اس فارم کے مختلف حصوں کی سیر کی۔ کلخوز کے سربراہ نے ہر شعبے کے طریق کار اور کارکردگی کے بارے میں معلومات پہنچائیں۔ اگرچہ ان کی باتوں میں مبالغہ آرائی صاف محسوس ہوتی تھی، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کلخوز کا ہر شعبہ ایک خاص قرینے اور نظم کے تحت کام کر رہا تھا۔ کارکن بالکل کمپیوٹر کی طرح اپنے افسروں کے اشاروں پر چلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

مہمانوں کی تواضع کے لیے سامان خورد و نوش کی فراوانی تھی۔ خصوصاً "نوش" کا انتظام کچھ زیادہ ہی فراخ دلی سے کیا گیا تھا۔ کلخوز کے عوامی ہال میں مہمانوں کے اعزاز میں جلسے کا اہتمام بھی تھا۔ اس ہال کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی سینما، کبھی تھیٹر، کبھی رقص گاہ تو کبھی سیاسی اجتماعات، علاوہ ازیں عام تقریبات کے لیے۔ مثلاً شادی بیاہ کے موقع پر اس ہال کو مہمان خانے میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

ہال کے باہر ایک نمایاں جگہ پر جلی حروف میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی :

”ہم عہد کرتے ہیں کہ حکومت اور پارٹی سے کیے گئے پیمان کو نبھائیں گے اور دسواں پانچ سالہ منصوبہ وقت سے پہلے مکمل کریں گے۔“

داخلے کے دروازے کے عین اوپر ایک پوسٹر آویزاں تھا جس پر ایک دیہقان



اور مزدور کی تصویر تھی۔ دہقان کے ہاتھ میں درانتی اور مزدور کے ہاتھ میں تھوڑا تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا: "تعاون اور ہم آہنگی" ہال کے اندر سٹیج کے اوپر بڑے بڑے حروف میں "دہقان، کاریگر اور دانشور کی دوستی زندہ باد" کا نعرہ درج تھا۔ اس نعرے کے اوپر سرخ رنگ کے کاغذ پر لینن کی قد آدم تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے پچیسویں اجلاس کے موقع پر کلخوز کی جانب سے تہنیتی کلمات سکھ گئے تھے۔ لینن کی تصویر کے پہلو میں کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل اور روس کے صدر برژنیف کی تصویر بھی موجود تھی۔

سامعین کے اجتماع گاہ میں پہنچتے ہی کاروائی کا آغاز ہو گیا۔ سٹیج سیکرٹری نے استقبالی کلمات ادا کیے اور علاقے کا مختصر تاریخی اور جغرافیائی پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا:

”کچھ مدت پہلے پانی کی قلت اور آب رسانی کے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے اس علاقے کی زمینیں خشک تھیں۔ آپ ہریالی اور خوش حالی کا جو منظر دیکھ رہے ہیں یہ سرکار کی انقلابی زرعی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔“

اس کے بعد غیر ملکی طلبہ سے فرمائش کی گئی کہ وہ بھی حاضرین کو اپنے ممالک کے حالات بتائیں۔ سٹیج سیکرٹری نے موضوع کا تعین کرتے ہوئے کہا کہ دیا کہ بہتر ہو گا اگر مہمان گرامی اپنے ممالک میں ترقی پسند پارٹیوں اور روس کے ساتھ دوستی پر کچھ روشنی ڈالیں۔

اپنے میزبانوں کے حکم سے سرتابی کرنے کی کے مجال تھی۔ سب نے مختصر تقاریر کیں اور حاضرین کے رٹے رٹائے سوالوں کے جوابات دیے۔

میں ابھی اپنی بات ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک صاحب نے کھڑے ہو کر مجھ سے

پوچھا:



”تمہارے ملک میں سوویت یونین کے بارے میں کیا قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں؟“  
 ”قیاس آرائیوں“ سے ان کا مطلب یہ تھا کہ افغانستان کے کتنے لوگ روسی نظریے کو مانتے ہیں، میں نے ان کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ بات ہمارے ملی وقار کی تھی اور میں روسیوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے ملک کے وقار کو مجروح کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے کہا:

”میرا وطن ایک لپساندہ مگر خود دار ملک ہے۔ ہماری قوم اپنے داخلی مسائل اور اقتصادی الجھنوں کو حل کرنے میں مصروف ہے۔ ہم آزاد اور غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں اور مغرب و مشرق کی طاقتوں کی باہمی چپقلش میں شریکے ہونا نہیں چاہتے۔“

ابھی میری بات ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک دہقان نما شخص کھڑا ہو گیا اور قہر آلود لہجے میں میری بات کاٹتے ہوئے بولا: ”ابھی چند روز پہلے“ پر اودا“ میں افغانستان پر ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھا گیا ہے کہ تمہارے ملک کی ایک اہم شخصیت روس آئی ہے اور اس نے کامریڈ برزنیف اور دوسرے لیڈروں سے باہمی تعاون کے مسئلے پر بات چیت کی اور ایک سمجھوتے پر دستخط کیے ہیں۔“

ان صاحب کے لہجے کی کاٹ یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ انہیں افغانستان کے غیر جانبدار کردار والا ملک قرار دینے کی وجہ سے مجھ پر غصہ آیا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ دنیا کے تمام پس ماندہ ممالک کے دفود روس آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس نے کیوبا، ویت نام اور مشرقی یورپ کے بعض ممالک کے ساتھ افغانستان کا نام لیا۔ میں نے اپنے لہجے میں درستی پیدا کیے بغیر کہا: ”ہمارے دفود تو دوسرے مغربی ممالک کے دورے بھی کرتے ہیں، چین اور جاپان بھی جاتے ہیں۔“

اس پر ایک اور صاحب غصے سے بھرے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں



نے مجھ سے پوچھا :

”کیا برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک کے ساتھ آپ کے ملک کے تجارتی روابط قائم ہیں؟“

میرا جواب اثبات میں تھا۔ اس پر وہ بڑے ہمدردانہ مگر طنز بھرے لہجے میں مجھے مخاطب کر کے بولا :

”امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک تجارت کے نام پر آپ سے خام مال لے کر آپ کو تباہی کے کنارے لے جا رہے ہیں، آپ روس سے تجارت کیوں نہیں کرتے؟“  
میں نے اُن سے کہا : ”تجارت تو ہم آپ سے بھی کرتے ہیں۔ کیا آپ ہم سے خام مال نہیں لیتے؟“

انہوں نے کہا : ”ہم آپ سے خام مال ضرور لیتے ہیں، مگر ہم آپ کے دوست ہیں اور ہم آپ کو ہر قسم کا تعاون بھی دے رہے ہیں۔“

اس پر میں نے حاضرین کو بتایا کہ افغانستان کا زیادہ تر خام مال اور قدرتی گیس وغیرہ روس کو برآمد کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے مغربی ممالک کے ساتھ ہماری زیادہ تر تجارت نقدی کی شکل میں ہوتی ہے۔

ایک صاحب نے بحث کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا : ”آپ نے کیونسٹ پارٹی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا؟“

میں نے کہا : ”ہمارے ملک میں ابھی تک کیونسٹ پارٹی کے نام سے کسی منظم جماعت کا وجود نہیں ہے۔ اس لیے میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔“

اس پر انہوں نے چند نام دیے کہ تمہارے فلاں فلاں لوگ تو تمہارے ہاں بڑھے قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص نے جو نام دیے میں ان میں سے کسی کو پہچانتا تک نہ تھا، اسے کیا بتاتا۔



اس کے بعد ایک سوال پوچھا گیا : ”آپ کے تعلقات امریکہ کے ساتھ کیسے

ہیں ؟

میں نے بلا توقف کہا : ”تقریباً ایسے ہی تعلقات جیسے روس کے ساتھ ہیں۔“  
جب یوں بات نہ بنی تو ایک نوجوان نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال

کیا : ”اچھا یہ بتائیے امریکہ اچھا ہے یا روس ؟“

میں نے ٹانے کی غرض سے کہا : ”میں نے ابھی تک امریکہ نہیں دیکھا۔ روس کے  
ساتھ اس کا مقابلہ کیونکر کر سکتا ہوں البتہ روس کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک  
خوبصورت ملک ہے۔“

اس پر مقامی کمیونسٹ پارٹی کے ایک عہدیدار اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے  
روس اور امریکہ کے درمیان باقاعدہ تقابل کر کے یہ ثابت کرنا شروع کر دیا کہ روس  
دنیا کے غریب اور پس ماندہ ممالک کا حقیقی بھائی خواہ ہے جب کہ امریکہ ان کا استحصال  
کر رہا ہے۔ انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ افغانستان میں روس کے  
جوانجینڈر اور اساتذہ خدمات انجام دیتے ہیں وہ امریکیوں کے مقابلے میں کئی گنا  
زیادہ کام کرتے ہیں، لیکن تنخواہیں تھوڑی لیتے ہیں۔

میں نے بحث کو طول پکڑتے دیکھ کر فیصلہ کیا کہ روس کی تعریف میں چند فقرے

کہہ ڈالوں : چنانچہ میں نے کہا : ”افغانستان نے آزادی کا اعلان کیا تو روس پہلا  
ملک تھا جس نے اس کی آزادی، خود مختاری اور غیر جانبداری کو تسلیم کیا۔ ہم اپنے  
ہمسائے سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اسی طرح ہماری آزادی اور خود مختاری کا احترام  
کرے گا۔“



## حق دوستی ادا کرتے ہیں

میری جان چھوٹی، تو دوسرے ممالک کے طلبہ نے باری باری اپنے ملکوں کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ فلسطین اور جنوبی یمن کے طلبہ نے روس کے احسانات کی کچھ ایسی تصویر کھینچی کہ خود روسی بھی حیران رہ گئے۔ ترجمان جب ان کی تقاریر کا ترجمہ کرتا تو اجتماع گاہ میں تالیوں کا طوفان آجاتا۔ بہت سے لوگوں کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو جاتیں۔ گویا وہ مجھ سے کہہ رہے ہوں:

”دیکھو! حق دوستی یوں ادا کرتے ہیں؟“

تقریب کے اختتام پر مقامی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری نے حاضرین اور غیر ملکی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے خطاب میں اپنے غیر ملکی دوستوں کے لیے جو پیغام پنہاں تھا وہ میں کئی مجالس میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ انہوں نے کہا: ”لینن کی دھرتی کے معزز مہمانو! جب آپ یہاں سے واپس جائیں تو مارکسزم اور لیتنزم کے مبارک اصول ساتھ لے کر جائیں۔ لینن کے اصولوں کو الہامی کتابوں سے زیادہ مقدس جانیں۔ صرف اسی صورت میں آپ اپنی قوم کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ سوویت حکومت آپ سے ہر ممکن تعادل کرے گی۔“

اختتامی کلمات پر وائس کرائیڈر نے کہے۔ انہوں نے — کلخوز کے عہدیداروں اور کاشت کاروں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں یقین دلایا کہ ان کے غیر ملکی شاگرد اعلیٰ علمی صلاحیتیں اور بصیرت رکھتے ہیں۔ روس نے طلبہ کی مدد سے لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیائی ممالک میں اپنے نظریے کی تخم ریزی کی ہے۔ آپ نے ہمارے ساتھ جس خلوص کا برتاؤ کیا ہے اسے میں اور میرے ساتھی طلبہ کبھی فراموش نہ کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے غیر ملکی ساتھی روسی اصطلاح کے مطابق سچے ”نیک حلال“



ثابت ہوں گے۔“

اس واقعے سے مجھے روس آنے والے طلبہ کے ساتھ روسیوں کے حُسنِ سلوک کی غایت معلوم ہو گئی۔ واپسی پر ایک روسی طالب علم نے اس بات پر مجھے داد دی کہ میں نے جلسہ گاہ میں اپنے ملک کے وقار کے خلاف کوئی بات نہ کی۔ اس نے کہا کہ میری باتوں سے کمیونسٹ کیمپ میں تشویش کی لہر دوڑ گئی ہو گی۔ اس لیے کہ وہ باہر سے آنے والوں پر اتنی سرمایہ کاری اس لیے نہیں کرتے کہ وہ ان کے منہ پر انہیں کھری کھری سنائیں۔ یہ روسی طالب علم دنیا بھر کی حریت پسند قوتوں کا مدح خواں اور سپر طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا سخت مخالف تھا۔ اس نے دوسرے غیر ملکی طلبہ کی روش پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ہماری حکومت پوری دنیا میں ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہے جن میں غداری اور ملک فروش کی جراثیم موجود ہوں۔ انہیں روس لاکر تعلیم و تربیت کے نام پر عیش و عشرت کا رسیا بنایا جاتا ہے، تاکہ ان کی قومی غیرت بالکل جاتی رہے۔ اس کے بعد ایسے میٹھے انداز سے ان پر لینن ازم کا جادو پھونکا جاتا ہے کہ واپس جاتے ہوئے وہ ہمارے بے دام غلام بن چکے ہوتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں اس نے کہا کہ روسی یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے غیر ملکی طلبہ میں مشکل پانچ فیصد تعداد ایسی ہو گی جو تعلیمی صلاحیت کی بنیاد پر آتے ہیں۔ بچانے والے فیصد طلبہ محض کمیونسٹ پارٹیوں سے وابستگی یا بڑے بڑے کمیونسٹ اور وطن فروش رہنماؤں کی سفارش پر آتے ہیں۔

### بے جیائی کے اڈے

روس کے دوسرے تفریحی علاقوں کی طرح اڈیسہ بھی شہوت رانیوں کا مرکز ہے۔ راستے، پارک، دیرانے اور آبادیاں — کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں سر عام بے جیائی کے مناظر نہ دکھائی دیتے ہوں۔ سر عام بوس و کنار اور پارکوں میں جانوروں کی طرح آزادانہ



اختلاط بالکل عام سی بات ہے۔ یہ سب کچھ قانون کی نظروں میں بے ضرر ہے۔ کوئی اس پر اعتراض کرے، تو اسے بوڑھائی زہنیت قرار دے کر جھڑک دیا جاتا ہے۔ نوبت یہاں تک آپہنچتی ہے کہ بازاروں میں جوان عورتیں کسی پسندیدہ مرد کو دیکھ کر سرعام آوازے کستی اور سیٹیاں بجاتی ہیں۔ اگر کوئی خاتون خانہ اپنے شوہر سے کہے کہ وہ اپنے کسی مرد دوست سے ملنے جا رہی ہے اور رات کو گھر نہ آ سکے گی، تو شوہر کو اپنی بیوی کو روکنے کا کوئی قانونی حق حاصل نہیں ہے۔ اعتراض کا حق بس اس افسر کو ہے جس کے کارخانے یا فارم میں وہ عورت کام کرتی ہے۔ صرف وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اسے اپنے دوست سے ملنے کے لیے چھٹی نہیں مل سکتی، کیونکہ کارخانے کی پیداوار میں کمی کا اندیشہ ہے۔

ساحل سمندر پر اکثر لوگ جڑوں کی شکل میں جاتے ہیں۔ جو اکیلے ہوتے ہیں انہیں اپنا دوسرا ساتھی تلاش کرنے میں کسی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ بالخصوص عورتوں کے اس قدر بہتات ہوتی ہے کہ ہر قدم پر ایک عورت مسکرا کر آپ کا استقبال کرنے کو موجود ہوتی ہے۔ غیر ملکی طلبہ کی آنکھیں اس منظر کو دیکھ کر چندھیا جاتی ہیں اور اکثر ان کے قدم بہک جاتے ہیں۔

روسی نوجوان بھی عیش و عشرت کے دلدادہ ہیں، لیکن ان کے انداز میں نندیدہ پڑے نہیں ہوتا۔ پھر ان کے شوق و جنون کے دوسرے مراکز بھی ہیں۔ وہ مغربی موسیقی کے شوقین ہیں، غیر ملکی ملبوسات پر جان دیتے ہیں، فرانس اور امریکہ کے پرفیومز اور دوسرے سامان عشرت کے دلدادہ ہیں۔ دوسرے جنسی آزادی ہونے کی وجہ سے ان کو پسند کی لڑکی تلاش کرنے میں کسی مشکل کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑتا۔

روسی طلبہ غیر ملکی طلبہ سے دوستی کے خواہاں رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ انہیں مہمان سمجھ کر ان سے اخلاص و مروت کا سلوک کرنا چاہتے ہوں۔ اس سے ان



کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے کردار میں جا کر مغربی موسیقی سن سکیں۔ ان سے اپنے لیے غیر ملکی سامان آرائش یا کسی کپڑے کا تحفہ حاصل کر سکیں یا ان سے کوئی دوسرا فائدہ حاصل کر سکیں۔ دوست بنانے کی ترکیب بھی بہت آسان ہے۔ کوئی روسی طالب علم راستے میں بڑی محبت سے آپ کو دعوت دے گا۔

”کیا آپ مہربانی فرما کر میرے ساتھ ایک جام شراب نوش کریں گے؟“  
اگر آپ کہیں کہ میں شراب نہیں پیتا تو کافی اور چائے پر بھی دوستی کا آغاز ہو سکتا ہے۔ پھر جس طرح شراب کا نشہ جلدی اتر جاتا ہے، اسی تیزی سے روسی دوستوں کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ طوطے کی طرح نظروں پھیر لیتے ہیں۔ مستقل دوستی کا روس میں کوئی تصور نہیں ہے۔

### بھڑچال

اپنی راہیں آپ تلاش کرنے کا جذبہ روسی فوجوانوں میں موجود نہیں یا پھر ختم ہو چکا ہے۔ وہ کسی خبر کو سن کر عام طور پر یہ کھوج لگانے کی کوشش نہیں کرتے کہ وہ سچ ہے یا جھوٹ، اسے فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ خصوصاً سرکاری خبر رساں ادارے جو کچھ بھی انہیں بتا دیں، بلا تامل اسے مان لیتے ہیں۔ ہمارے روسی ہم سبق روزانہ ہمیں ”پراودا“ اور روسی ٹیلی ویژن کے حوالے سے انہونی خبریں سناتے تھے۔ آج فلاں ملک میں روس نے یہ کمال کر دیا اور فلاں مقام پر امریکہ نے یہ قیامت ڈھادی۔ ہمارے اساتذہ جب روس کی اقتصادی کامرانیوں کا تذکرہ کرتے، تو اکثر اسے سوشلزم اور روسی حکومت کی پالیسیوں سے منسوب کرتے تھے۔ وہ ہمیں بتاتے کہ جنگ کے دوران میں روس کی اقتصادی حالت بہت خراب تھی۔ قحط کا سماں تھا۔ پھر وہ اپنے لہجے میں ساری ہمدردی سمیٹتے ہوئے ہمیں کہتے کہ اگر ہم بھی اپنے ممالک میں سوشلزم لے آئیں تو عوام کی غربت اور بھوکے



کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے کردوں میں جا کر مغربی موسیقی سن سکیں۔ ان سے اپنے لیے غیر ملکی سامان آرائش یا کسی کپڑے کا تحفہ حاصل کر سکیں یا ان سے کوئی دوسرا فائدہ حاصل کر سکیں۔ دوست بنانے کی ترکیب بھی بہت آسان ہے۔ کوئی روسی طالب علم راستے میں بڑی محبت سے آپ کو دعوت دے گا :

”کیا آپ مہربانی فرما کر میرے ساتھ ایک جام شراب نوش کریں گے؟“

اگر آپ کہیں کہ میں شراب نہیں پیتا تو کافی اور چائے پر بھی دوستی کا آغاز ہو سکتا ہے۔ پھر جس طرح شراب کا نشہ جلدی اتر جاتا ہے، اسی تیزی سے روسی دوستوں کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ طوطے کی طرح نظریں پھیر لیتے ہیں۔ مستقل دوستی کا روس میں کوئی تصور نہیں ہے۔

### بھڑچال

اپنی راہیں آپ تلاش کرنے کا جذبہ روسی نوجوانوں میں موجود نہیں یا پھر ختم ہو چکا ہے۔ وہ کسی خبر کو سن کر عام طور پر یہ کھوج لگانے کی کوشش نہیں کرتے کہ وہ سچ ہے یا جھوٹ، اسے فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ خصوصاً سرکاری خبر رساں ادارے جو کچھ بھی انہیں بتا دیں، بلا تامل اسے مان لیتے ہیں۔ ہمارے روسی ہم سبق روزانہ ہمیں ”پراودا“ اور روسی ٹیلی ویژن کے حوالے سے انہونی خبریں سناتے تھے۔ آج فلاں ملک میں روس نے یہ کمال کر دیا اور فلاں مقام پر امریکہ نے یہ قیامت ڈھادی۔ ہمارے اساتذہ جب روس کی اقتصادی کامرانیوں کا تذکرہ کرتے، تو اکثر اسے سوشلزم اور روسی حکومت کی پالیسیوں سے منسوب کرتے تھے۔ وہ ہمیں بتاتے کہ جنگ کے دوران میں روس کی اقتصادی حالت بہت خراب تھی۔ قحط کا سماں تھا۔ پھر وہ اپنے لہجے میں ساری ہمدردی سمیٹتے ہوئے ہمیں کہتے کہ اگر ہم بھی اپنے ممالک میں سوشلزم لے آئیں تو عوام کی غربت اور بھوکے



مٹ جائے گی۔ ان کے خیال میں روس دنیا کا واحد ملک ہے جہاں سوشلزم کی برکت سے عوام و خواص کو روٹی اور کپڑا میسر ہے۔ جو ملک آج بھی سوشلزم سے محروم ہیں ان کے خیال میں روٹی سے بھی محروم ہیں۔

میرے روسی طالب علم ساتھی ہمیشہ مجھ سے پوچھتے تھے کہ آیا ہمارے ملک میں روٹی راشن کارڈ پر ملتی ہے؟ میں انہیں بتاتا کہ ہمارے ہاں ابھی روٹی اور غلے کی کمی نہیں ہے، مگر وہ کہتے ہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ تم لاکھ چھپاؤ، مگر سوشلزم کے بغیر بھوک ختم نہیں ہو سکتی۔ میں ان سے پوچھتا کہ انہیں کس نے بتایا ہے کہ افغانستان میں روٹی کی راشن بندی ہے تو وہ پر اودا اور اپنے ریڈیو کا حوالہ دیتے۔

ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسرے ذرائع ابلاغ نے روسی عوام کے اذہان میں یہ خیال اچھی طرح راسخ کر دیا ہے کہ امریکہ اسلحے کے لحاظ سے اتنا پیچھے ہے کہ روس آسانی سے امریکہ کو فتح کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں چیکو سلوواکیہ کی تسخیر کی مثال دی جاتی ہے۔ فخریہ انداز میں کہا جاتا ہے کہ روس دنیا کے کسی بھی ملک کو صرف ایک گھنٹے میں مسخر کر سکتا ہے۔ یہاں میں یہ بتانا چلوں کہ روسی عوام سے میری مراد روس، یوکرین اور بیلاروس کے لوگ ہیں۔ جہاں تک روس میں بسنے والی اقلیتوں مثلاً تاجیکیوں، ترکمانوں، ازبکوں اور آذربائیجانیوں کا مسئلہ ہے، تو وہ نہ تو حالات سے مطمئن ہیں نہ ذرائع ابلاغ کے پروپیگنڈے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی اکثریت اسلام پر پختہ یقین رکھتی ہے۔ وہ روس اور اشتراکیت کو اپنا بدترین دشمن خیال کرتے ہیں۔ ان میں سے جو لوگ بظاہر مذہب سے برگشتہ ہو چکے ہیں۔ وہ بھی مسلمانوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں مثال کے طور پر ان میں سے ہزاروں نوجوانوں نے روسی لڑکیوں سے شادیاں کی ہیں، لیکن وہ اپنی لڑکیاں کسی غیر مسلم سے بیاہنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس رجحان کو ختم کرنے کے لیے روسی ذرائع ابلاغ نے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا۔ مسلمان عورتوں کو روسی مردوں سے



شادی پر راغب کرنے کے لیے ٹیلی وژن پر ایسی فلمیں دکھائی جاتی ہیں جن میں ان کے درمیان عشق و محبت کی فرضی داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ اخبارات بھی ایسی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود مسلمان، روسیوں سے اتنے ہی دور ہیں جتنے غلامی سے پہلے تھے۔

روس میں مسلمانوں پر یہ پابندی غائد کی گئی ہے کہ وہ شادی بیاہ کی اسلامی رسوم سے اجتناب کریں اور مرد و عورتوں کے تحت شادیاں کریں، لیکن مسلمان چوری چھپے اسلامی طریقوں پر عمل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے ہاں بعض ایسے غیر اسلامی رواج بھی موجود ہیں، جن کو بنیاد بنا کر روسی اسلام پر حملہ کرتے ہیں۔ بعض مسلمان قبائل میں لڑکوں کے بدلے رقم لینے کا رواج ابھی تک موجود ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس قطعی غیر اسلامی کام کو بھی اسلامی کہا جاتا ہے۔ اس کے سوا باقی اکثر رسوم و رواج اسلام کے مطابق ہیں۔ اگرچہ روس میں شادی کرنے والے جوڑے کو مخصوص دفتر میں رجسٹر پر دستخط کرنے پڑتے ہیں جس کے ساتھ ہی شادی کی رسم مکمل ہو جاتی ہے، لیکن مسلمان خاندان اس پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کا باقاعدہ اسلامی طریقے سے نکاح پڑھاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں طلاق بھی اسلامی طریقے سے دی جاتی ہے۔ اگرچہ قانونی طریقے پر بھی عمل کرنا پڑتا ہے۔

### سب سے زیادہ مظلوم۔ روسی عورت

جس طرح مغربی ممالک خصوصاً یورپ میں عصمت فروشی کو قانونی تحفظ حاصل ہے، روس میں یہ روایت نہیں ہے۔ کوئی عورت اپنی عزت بیچنے کے لیے بازار میں نہیں بیٹھ سکتی۔ اسی طرح کسی مرد یا عورت کو زبردستی کرنے کا حق بھی نہیں ہے، لیکن طرفین کی رضامندی کے بعد مرد و زن کے درمیان کسی قسم کے تعلقات پر پابندی بھی نہیں



چاہے وہ شادی شدہ ہی کیوں نہ ہوں۔ کوئی شوہر اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد سے اور کوئی عورت اپنے شوہر کو دوسری عورت سے تعلقات استوار کرنے سے نہیں روک سکتی۔

اس "آزادی" کے باوجود روس کی عورت دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم ہے۔ کانوں کی کھدائی جیسے پر مشقت کاموں کے ساتھ ساتھ بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کا سارا کام کاج بھی عورتوں کو کرنا پڑتا ہے۔ کھانا وہ تیار کرتی ہیں، بچوں کے کپڑے وہ سیتی ہیں، بازار سے سودا سلف وہ لاتی ہیں۔ شدید سردی کے دنوں میں وہ راستوں سے برف ہٹاتی ہیں، بھاری بوجھ اٹھاتی ہیں، بھاری بھر کم مشینیں دھکیلتی ہیں، دیوہیکل گاڑیاں چلاتی ہیں، زراعت، مال مویشی پالنے اور مختلف قسم کے کاموں میں حصہ لیتی ہیں۔ سکولوں اور نرسریوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی کثرت ہے۔ کھیت مزدور اور کارخانے کی کاریگر، ہوٹلوں میں ویٹرس، دکانوں کی ملازم، سیلنگرل، ٹیلر اور حجام، غرضیکہ ہر جگہ عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش کام کرنا پڑتا ہے۔ گھر کا کام اس پرستند، کیونکہ روسی مرد چاہے کتنا ہی آزاد خیال ہو گھر کا کام کرنا نشانِ مردانگی کے خلاف سمجھتا ہے۔

عورتوں کے مقابلے میں روسی مرد کاہل ہوتے ہیں۔ اکثر فارغ اوقات میں شراب پیتے اور شطرنج وغیرہ کھیلتے ہیں۔ جو پیسے مرد کماتے ہیں اس کا کم ہی حصہ گھریلو ضروریات کے لیے دیتے ہیں۔ زیادہ تر گھومنے پھرنے اور شراب نوشی پر خرچ کر دیتے ہیں۔ بیچاری عورتوں کو گھرداری کا نظام چلانے کے لیے فاضل وقت میں بھی کام کرنا پڑتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کر سکیں۔ کارخانوں اور دوسرے اداروں میں مرد وزن کے تمیز روا نہیں رکھی جاتی۔ ایک سا کام، ایک سا لباس اور ایک سے حالات کار۔ گفتگو کے موضوعات مشترک ہوتے ہیں۔ جس طرح مرد عورتوں سے ہنسی مذاق کرتے ہیں اسی



طرح عورتیں ان کا مذاق اڑاتی ہیں۔

روسی عورتوں کی ایک بنیادی مشکل یہ ہے کہ انہیں مناسب اور موزوں شوہر نہیں ملتا۔ اس کے یوں تو کئی اسباب ہیں، لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ روسی معاشرے میں شادی مرد اور عورت کے درمیان اخلاص و محبت کا نہیں، باہمی مفادات کے اشتراک کا ایک معاہدہ رہ گیا ہے۔ مفادات ختم ہوتے ہی شادی کا ڈھونگ ختم ہو جاتا ہے یا کم از کم مرد کی عورت سے دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے عورتیں اچھے شوہروں کی تلاش میں ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں سفر کرتی رہتی ہیں۔ مجھے ایک روسی خاتون نے بتایا :

”میں نے سینکڑوں میل کا سفر کیا تب مجھے ایک شخص نے شادی کی پیش کش کی، لیکن جب اس کا کام نکل گیا تو اس نے مجھ سے منہ پھیر لیا۔“

### ناکام شادیاں

روس میں طلاق کی شرح شاید دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ اس کے باقاعدہ اعداد و شمار بتانے تو مشکل ہیں، لیکن محتاط اندازے کے مطابق ایک سو میں سے ستر جوڑے چند برس کی رفاقت کے بعد ہی جدائی اختیار کر لیتے ہیں۔ مرد و زن کی باہمی رضامندی سے انجام پانے والی شادیوں میں سے پچانوے فیصد کا انجام طلاق ہوتا ہے۔ جن شادیوں میں والدین کی رضامندی شامل ہو، وہ بھی زیادہ مدت نہیں چلتیں۔ جب بھی کسی فریق کو اپنے شریک زندگی سے شکایت پیدا ہوتی ہے وہ خوب تر کی تلاش میں رہنے لگتا ہے۔

عام طور پر روسی عورتوں کا آئیڈیل ایسا مرد ہوتا ہے جو کم عمر ہو اور شراب نہ پیتا ہو یا کم پیتا ہو۔ اگرچہ روس جیسے معاشرے میں ان دونوں خوبیوں کا ایک جا ہونا محال ہے



بات ہے۔ شراب سے خواتین کے گریز کی وجہ یہ ہے کہ شراب پینے والے شوہر اپنی بیویوں کو کچھ دینے کے بجائے الٹا ان سے چھین کر کھا لیتے ہیں۔ شراب کے لیے پیسے نہ ملیں یا زیادہ شراب پی لیں، تو گھر کے کمزور افراد، بچوں اور عورتوں کو مارتے ہیں۔ کئی بار ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں کہ فلاں روسی شوہر نے شراب کی خاطر پیسے نہ دینے پر اپنی بیوی بچوں کو مار مار کر ہلاک کر دیا۔

روسی قانون کے مطابق سترہ برس سے کم عمر کی روسی لڑکی کو شادی کی اجازت نہیں، جب کہ ایٹائی علاقوں میں شادی کی عمر کی حد پندرہ برس ہے۔ اسی طرح ازدواجی قانون کی رو سے کسی مرد یا عورت کو خالہ زاد، ماموں زاد اور چچا زاد بھائی یا بہن سے شادی کی اجازت نہیں۔ اس قانون کی غایت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگوں کے تعلقات وسیع ہوں اور وہ اپنے خاندان کی تنگنائیوں میں محصور نہ رہیں، لیکن اس کے برعکس اس قانون نے خاندان کے قریبی رشتے داروں میں اخلاص و مروت کی رہی سہی قدر بھی مٹا ڈالی ہیں اور خاندان سے باہر رشتے نہ آسانی سے ملتے ہیں نہ اس آتے ہیں۔ روس میں مرد اور عورتیں شادی کے بعد انگوٹھیاں پہنتے ہیں۔ اس لیے انگوٹھی کو شادی شدہ ہونے کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ شادی کے بعد عورتیں اپنے نام کے ساتھ شوہر کے خاندان کا نام بھی لگاتی ہیں۔ بعض اوقات شوہر بھی اپنی بیوی کے خاندان کے نام کا سابقہ یا لاحقہ لگاتے ہیں۔

طلاق دینے کا طریقہ نہایت آسان ہے۔ جو فریق طلاق دینے یا لینے کا خواہاں ہوتا ہے وہ حکومت کو پچاس روپل ادا کر کے اس پابندی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اکثر روسی عورتیں غیر ملکی طلبہ اور تیاہوں سے شادی رچانے کے خواب دیکھتی ہیں۔ بیرونی ممالک سے آنیوالے کچھ طلبہ روسی لڑکیوں سے شادی کرتے دیتے ہیں، لیکن یہ شادیاں زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوتیں، اس لیے اکثر نوجوان اپنی بیویوں کو اپنے ساتھ وطن



لے جانے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ بہت تھوڑے لڑکے ایسے ہوتے ہیں جو یا تو اپنی بیویوں کے ہمراہ روس ہی رہ جاتے ہیں یا اپنے ساتھ روسی بیویوں کو اپنے وطن لے جاتے ہیں۔

کئی روسی طالبات نے بتایا کہ انہیں مشرقی یورپ، کیوبا اور ویت نام کے لڑکوں سے بہت چڑ ہے۔ وہ افریقی کالوں کو تو شریکِ حیات بنا سکتی ہیں، لیکن کسی کمیونسٹ ملک کے باشندے سے شادی نہیں رچا سکتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتی ہیں کہ ان کمیونسٹ ملکوں میں انہیں روس ہی کی طرح پابندیوں میں زندگے گزارنی پڑے گی۔

### مذہب آزاد ہے یا پابند !

روس جانے سے پہلے میں سنا کرتا تھا کہ وہاں مذہب پر پابندی ہے۔ روس کے حمایتی کہتے تھے وہاں مذہب آزاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روس میں مذہب پر براہِ راست کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ اگر کوئی شخص کلیسا جاتا ہے، جائے نماز پڑھتا ہے، پڑھے۔ اس پر کسی سے باز پرس نہیں کی جاسکتی، کسی کو جیل نہیں بھیجا جاسکتا۔ اس لحاظ سے تو واقعی مذہب آزاد ہے۔ پابندی کا معاملہ قدرے مختلف ہے جو بظاہر اہل مذہب سے تعرض نہیں کرتا۔ پابندی ہے نئی مساجد اور کلیساؤں کی تعمیر پر، شکستہ اور بوسیدہ عبادت گاہوں کی مرمت اور تعمیر نو پر۔ ہر اس درس گاہ پر جسے حکومت کی مرضی کے خلاف کھولا جائے۔ اگر کوئی شخص قرآن پاک یا بائبل پڑھتا نظر آ جائے، تو اس سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ وہ یہ خلافِ قانون کتا ہیں کہاں سے لایا، مذہبی کتابوں اور جگلوں پر روس کے سارے دروازے بند ہیں۔ کسی سیاح کو اس وقت تک روس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی جب تک اس کا سامان دیکھ کر یقین



نہ کر لیا جائے کہ اس کے پاس مذہبی مواد پر مشتمل کوئی کتاب، رسالہ، پوسٹر اور اخبار تک نہیں ہے۔

خدا کی عبادت کرنے والوں کو روسی معاشرے میں کوئی باعزت مقام نہیں دیا جاتا۔ ایسے لوگوں کو اچھی نوکری نہیں مل سکتی۔ سرکاری ذرائع ابلاغ مذہب کے خلاف مضحکہ خیز الزامات پھیلاتے اور پروپیگنڈا کرتے ہیں، لیکن کوئی شخص بھی اپنا کوئی مذہبی حق تسلیم کرنے کے لیے عدالت سے رجوع نہیں کر سکتا۔

مذہب کے ماننے والوں کو اجازت ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ناموں میں اسلامی یا عیسائی سابقہ یا لاحقہ لگالیں، لیکن وہ ان کو مذہب کی تعلیم نہیں دے سکتے۔ اگر کسی شخص کے بارے میں پتہ چل جائے کہ وہ اپنے بچے یا بچی کو مذہبی تعلیم دیتا ہے، تو اس کے خلاف غداری کا مقدمہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس جرم کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے اور سائبیریا کی جلا وطنی بھی۔ حکومت نے تمام تدبیریں بروئے کار لا کر ان راستوں کو بند کر دیا ہے جن سے مذہبی تعلیم کے پھیلاؤ کا اندیشہ تھا۔

مذہبی رسوم کو خلاف عقل اور سائنس دشمن قرار دے کر خلاف قانون ٹھیرا گیا ہے۔ اسلامی طریقے سے نکاح اور جنازہ پڑھنا خلاف قانون ہے۔ بچے کی ولادت پر اس کے کان میں اذان کہنا، اس کا ختنہ اور عقیقہ کرنا قانوناً جرم ہے۔ عید الفطر اور بقر عید پر کسی قسم کا اجتماع کرنا یا فطرانہ جمع کرنا اور قربانی دینا خلاف قانون ہے۔ دینی تعلیم کے حصول کے لیے کسی دوسرے ملک جانے پر پابندی عائد ہے۔ یہاں تک کہ حج کے لیے سفر بھی ممنوع ہے۔

سیاحت اور تعلیم کے لیے روس آنے والوں کو مذہب کی زیادہ آزادی حاصل ہے۔ انہیں اجازت ہے کہ وہ "اپنے انتظام سے" عبادت کریں، لیکن اس آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کلیسا اور مسجد جاسکتے ہیں، یا آزادانہ طور پر عبادت کر سکتے



ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کو پسندیدہ بھی نہیں سمجھا جاتا۔ انہیں کئی مراعات سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ وہ طلبہ جو عبادت گزار ہوتے ہیں، روسی طلبہ کو ان کے خلاف اکسایا جاتا ہے، تاکہ وہ ان پر عرصہٴ حیات تنگ کیے رہیں۔ ایسے طالب علموں کو ان کے اپنے ہم وطنوں کے ذریعے بھی پریشان کیا جاتا ہے۔ راقم الحروف کو ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہوا۔ مجھے افغانستان سے آئے ہوئے ”پرچی“ اور ”خلقی“ طلبہ نے مسلسل اس بات پر مذاق کا نشانہ بنائے رکھا کہ میں نماز پڑھتا ہوں۔ وہ مجھے ہر وقت بخوشی میں الجھاتے رہتے۔ میں دلائل دیتا اور وہ نماز روزے کو فسرورہ رسمیں اور وقت کا ضیاع قرار دے کر مجھے چڑاتے رہتے، بہر حال یہ تو ان کی بات ہے، لیکن میرا تجربہ ہے کہ پابندیوں کے ماحول میں نماز روزے کا جو لطف حاصل ہوا وہ اس آزادی سے کہیں زیادہ تھا جس سے میں محروم تھا۔ میں نماز ادا کرنے اور روزہ رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ تنہا رہتا تھا۔ دوسرے لڑکے مجھ سے اچھوتوں کی طرح کا سلوک کرتے تھے۔ اس کے باوجود مجھے اس احساس سے بڑی راحت نصیب ہوتی تھی کہ اس وسیع ملک میں جہاں خدا کا نام لینے والے بہت کم تھے، مجھے خدا نے اپنا ذکر کرنے سے محروم نہ فرمایا۔

### تم نے دیکھا ہے خدا کو؟

مذہب کے متعلق یونیورسٹی کے اساتذہ کا رویہ زیادہ معاندانہ نہ تھا۔ کم از کم وہ عبادت کرنے والوں کی حوصلہ شکنی نہ کرتے تھے۔ بعض اساتذہ نے مجھے دلائل سے پچھاڑنے کی کوشش ضرور کی، لیکن ہر مرحلے پر خدا کی مدد شامل حال رہی۔ بجائے اس کے کہ وہ میرے دل میں اسلام کے بارے میں شک و شبہ کا کوئی کاٹنا چھوتے ہمیشہ میں ہی ان کے عقائد کے ایوانوں میں تسنزل پیدا کرتا رہا۔



ایسے ہی لوگوں میں ہمارے استاد رفیق ماسین کا بھی تھے۔ وہ ٹرانسپورٹ کے پروفیسر اور اس شعبہ تعلیم کے سربراہ تھے۔ نام ان کا مسلمانوں کا ساتھ تھا کہ وسط ایشیا کے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا تھا، لیکن انتہا پسند کمیونسٹ تھے۔ ایک روز انہوں نے مجھے نماز ادا کرتے دیکھ لیا اور دوسرے ہی روز اپنے دفتر میں بلا یا کہ وہ مجھ سے مذہب کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں بغیر کسی ذہنی تحفظ کے بات کروں۔ وہ میری بات کو معقولیت سے سنیں گے۔ میں سمجھ گیا کہ اس بات چیت کی محرک میری نماز بنی ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتے؟ تو انہوں نے سوالات کا آغاز یوں کیا :

”کیا تم خدا پر یقین رکھتے ہو؟“

”جی ہاں میں خدا کے واحد پر ایمان رکھتا ہوں“ یہ میرا جواب تھا۔

”کیا تم مجھ سے زیادہ عقل و دانش رکھتے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

میں نے کہا کہ اس کا فیصلہ میں کیسے کر سکتا ہوں۔ اس پر انہوں نے اپنی علمی برتری جتائی :

”میں فیکلٹی کا چیئر مین ہوں، تخصص کی ڈگری حاصل کر چکا ہوں۔ کمیونسٹ پارٹی کا اہم رکن ہوں اور تم محض ایک طالب علم“

میں نے سوچا، اگر میں ان کے علمی رعب میں آگیا، تو ان سے حق نہ کہہ سکوں گا۔ اس لیے مرعوب نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ موڈ بانہ لہجے میں کہا : ”استاد محترم! مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ یونیورسٹی میں کوہستانی ٹرانسپورٹ کے شعبے کے سربراہ ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے اہم رہنما بھی ہیں، لیکن معاف کیجیے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ مذہبیات کے تقابلی مطالعے پر بھی اتھارٹی ہیں۔ یا آپ مابعد الطبیعیات کے مشکلم بھی ہیں؟ کیا آپ میری نبض پر ہاتھ رکھ کر بتا سکتے ہیں کہ میں کونسی بیماری میں مبتلا ہوں؟“



رفیق ماسینکا صاحب نے اعتراف کیا کہ وہ اپنے مضمون کے علاوہ دوسرے علوم سے زیادہ آگاہی نہیں رکھتے، لیکن ان کا اصرار تھا کہ وہ سوشلزم کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے ہیں۔ اس لیے میں علم و عقل اور فہم و فراست میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا کہ وہ صرف ٹرانسپورٹ اور سوشلزم کے بارے میں مجھ سے بہتر معلومات رکھتے ہیں۔ دین اور معدنیات کے بارے میں میری معلومات ان سے فائق ہیں۔ وہ اسلام یا دوسرے مذاہب کے بارے میں سرسری واقفیت رکھتے ہیں اس لیے میں انہیں اس سلسلے میں چیلنج کر سکتا ہوں۔

رفیق ماسینکا نے عجیب سوال کیا: ”یوری گاگارین خلائی سفر پر گیا، تو واپسی پر اس نے کہا تھا کہ میں نے لاکھوں میل کا سفر کیا لیکن خدا کو کہیں نہ دیکھا۔ تم نے کہیں دیکھا ہے خدا کو؟“

میں نے کہا: ”گاگارین کا سفر نامہ سفر تھا جو خلا کی انتہا گہرائیوں کے حسن میں خالق کائنات کی عظمت کو نہ پاسکا۔ جو شخص جگنو کی طرح چمکتے تاروں، چاندی کے کشتی کی طرح ہلکورے لیتے ہوئے چاند اور نور کے سرچشمے سورج کو دیکھ کر بھی بے نور رہا ہو اس کی کور بلی کا کیسا اعتبار؟ مجھے تو ہر ذرے اور ہر پتے میں خدا کی موجودگی کے ناقابل تردید شواہد نظر آتے ہیں۔“

رفیق صاحب نے میری بات کا تاثریہ بغیر دوسرا سوال کیا: ”میں نے سنا ہے تم ابھی تک چودہ سو برس پرانی کتاب سے اثر لیتے ہو۔ اگر یہ بات درست ہے تو اس سے زیادہ رجعت پسندی اور کیا ہو سکتی ہے؟“

میں نے قرآن کی آیات کے حوالے سے انہیں بتایا کہ چودہ سو برس پہلے قرآن پاک نے انسانیت کو جو روحانی اور اقتصادی نظریات دیے تھے اور خود کائنات کے



بارے میں جن حقائق سے آگاہ کیا تھا، حالات نے ان کی صداقت ثابت کی ہے۔ چودہ سو برس گزرنے کے باوجود اس کی آب و تاب میں کوئی کمی نہیں آئی۔ قرآن سائنسی علوم کی تردید نہیں کرتا نہ حقیقی سائنس قرآنی حقائق کو جھٹلا سکتی ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر آپ دل میں تلاش حق کی سچی نگیں لے کر قرآن کا مطالعہ کریں تو آپ کے نظریات میں انقلاب رونما ہو جائے۔ اس لیے کہ قرآن سامانِ ہدایت فراہم کرتا ہے انہی کو جو حق کے متلاشی ہوں جیسا کہ اس میں کہا گیا :

”وہ لوگ جو ڈرتے ہیں، ان کیلئے یہ (کتاب) سامانِ ہدایت ہے“

اس موقع پر ماسینکا صاحب نے پھر میری بات کاٹی۔ کہنے لگے : ”لوگوں کو باتوں کی نہیں پیٹ بھروٹی کی ضرورت ہے، تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا درکار ہے۔ کیا اسلام اس کی ضمانت دیتا ہے کہ غریبوں کا استحصال نہ ہو؟“

میں نے انہیں بتایا : ”آج غریبوں کے استحصال کی باتیں تو بہت ہو رہی ہیں لیکن کسی معاشرے میں اس کا عملی اطلاق موجود نہیں جب کہ ہمارے محسن و مربی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو برس پہلے عملاً ایسے معاشرے کا نمونہ پیش فرمایا اور اعلان کیا : ”وہ شخص مومن نہیں ہو سکتا جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا

پڑوسی بھوکا ہو۔“

ظلم و استحصال کو روکنے کے لیے حکم دیا :

”اپنے بھائی کی مدد کر دیا ہے وہ ظالم ہو یا مظلوم“ — ظالم بھائی کی مدد کا مفہوم یہ بتایا کہ اس کا ظلم کرنے والا ہاتھ روک دیا جائے اور مظلوم کی مدد اس طرح کہ ظالم کو ظلم کرنے سے روک دیا جائے۔“

کامریڈ ماسینکا کا اگلا سوال علم کے بارے میں تھا۔ ان کا کہنا تھا یہ دور سائنس و ٹیکنالوجی کا ہے۔ لوگ اس چیز کو قبول نہیں کرتے جس کا ادراک علمی ذریعے سے نہ ہو



جائے، جبکہ مذہب جامد نظر یہ ہے۔ یہ پیسے کو اٹھا گھمانے کی کوشش ہے۔  
 میں نے انہیں بتایا کہ اسلام ہی وہ دین ہے جس نے طلب علم کو ہر مسلمان مرد اور  
 عورت پر فرض اور واجب قرار دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے،  
 ”گہوارے سے قہز تک حصول علم کے لیے کوشاں رہو۔“  
 میری گفتگو نے ماسینکا صاحب کو خاصا متاثر کیا۔ ان کا ارادہ تو یہ تھا کہ وہ اپنے  
 دلائل سے مجھے پچھا لیں گے، لیکن میری باتوں نے ان کو خاموش کر دیا۔ خاصی دیر  
 تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور یہ کہتے ہوئے مجھے رخصت  
 کر دیا کہ فرصت ملی تو اس موضوع پر مزید بات چیت ہوگی۔

### خدا نے میری حفاظت کی

روس میں قیام کے دوران میں ہمیشہ مجھے یہ خطرہ لاحق رہا کہ عبادت میں مصروف دیکھ  
 کر مجھے کوئی گزند نہ پہنچائے۔ بعض اوقات تو ایسے منصوبے بھی بنائے گئے کہ مجھے کسی  
 طرح سے خوفزدہ کر کے نماز پڑھنے سے روکا جائے۔ ایسے منصوبوں میں میرے اپنے  
 وطن کے لوگ بھی شریک ہوتے تھے۔ کئی بار مجھے روسی وزارت خارجہ کے دفتر سے تنبیہ  
 کی گئی کہ ہمیں تمہاری ایسی سرگرمیوں کی اطلاع ملی ہے جو غیر دوستانہ ہیں۔ میرا جواب یہ ہوتا  
 کہ میں روس میں تخریبی سرگرمیوں میں حصہ لینے نہیں آیا بلکہ تحصیل علم کے لیے آیا ہوں۔  
 مجھے آئندہ احتیاط کرنے کے لیے کہا جاتا، لیکن یہ کبھی نہ بتایا جاتا کہ میرا اصلی جرم کیا  
 ہے۔ دوسرے ذرائع سے یہ پتہ چلتا کہ میں چونکہ نماز اور روزے کا پابند ہوں اور  
 قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتا ہوں، اس لیے میرے بارے میں شکوک پیدا ہوتے ہیں حالانکہ  
 میری عبادت میرے کمرے تک محدود تھی۔ میں نے کسی دوسرے کے آرام میں مغل  
 ہونے کی کوشش کبھی نہیں۔



ایک روز میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا کہ کامریڈ ماسینکا صاحب میرے کمرے میں تشریف لے آئے۔ وہ سمجھ تو گئے، لیکن پھر بھی انہوں نے پوچھا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں؟ میں نے انہیں بتایا کہ یہی ہماری کتاب ہدایت، قرآن پاک ہے۔

کہنے لگے: ”ذرا مجھے دکھانا تو، اس میں کیا لکھا ہے جس پر تم اتنے فریفتہ ہو؟“

میں نے انہیں بتایا کہ میں قرآن پاک آپ کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ اس میں لکھا ہوا ہے کہ صرف پاک لوگ ہی اسے چھو سکتے ہیں۔

آپ غسل کر کے آجائیے۔ میں اسے آپ کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ اس لیے کہ اس کتاب ہدایت پر جتنا حق میرا ہے، اتنا ہی حق آپ کا ہے۔“

ماسینکا صاحب کو بہت حیرانی ہوئی۔ کہنے لگے: ”میں نے آج تک کسی کتاب کی اتنی تکریم ہوتے نہیں دیکھی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے؟“

میں نے انہیں بتایا کہ یہ کتاب خالق کائنات کی طرف سے پوری انسانیت کے لیے ہدایت بنا کر بھیجی گئی ہے۔ وہی سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ روس میں اسے ”لوگ“ کہا جاتا ہے، ہم اسے اللہ کہتے ہیں۔ وہی فطرت اور قوانین فطرت کا خالق ہے۔ اس لیے ہمارا عقیدہ ہے کہ صرف اللہ کے بنائے ہوئے قوانین اور ضوابط ہی انسانیت کے لیے ہمیشہ مفید ہو سکتے ہیں۔ جس طرح وقت گزرنے کے ساتھ سچائی جھوٹ میں تبدیل نہیں ہو سکتی، اسی طرح قرآن کے تابندہ اصول حیات بھی کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے۔“

اس کے بعد میں نے اسلام کے چند زریں اصول ان کو بتائے۔ کامریڈ ماسینکا نے میری باتیں پوری توجہ سے سنیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز اندر سے انہیں تلاش حق کے لیے اکسار ہی ہے، لیکن وہ ماحول کے جس اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے اس سے کیسے نکلتے۔ پھر بھی اس کے بعد جتنا عرصہ میں روس میں رہا، ماسینکا صاحب کا سلوک میرے ساتھ بہت اچھا رہا۔



ماسینکا صاحب کے علاوہ کئی دوسرے اساتذہ سے بھی اسلام کے موضوع پر بات ہوئی اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے اکثر ان کے دل میں اسلام کے لیے نرم گوشہ بھی پیدا کیا، ہمارے یہودی اساتذہ کی اسلام دشمنی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ روس کی یونیورسٹیوں میں رہ کر صہیونیت کے فروغ کے لیے کام کر رہے تھے۔ مسلمان طلبہ سے وہ عام طور پر معاندانہ برتاؤ کرتے تھے، جن مسلمان طلبہ کے بارے میں انہیں تپہ چلتا کہ وہ مذہبی میلانات رکھتے ہیں، انہیں زک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرتے تھے۔ لیکن پھر کے دوران میں ان کی دل آزار باتیں میرے لیے سواہن روح سے کم نہ ہوتی تھیں۔



## آٹھواں باب

### قفقاز میں چند ہفتے

چوتھے برس کے اختتام پر عملی کام کے لیے ہمیں صنعتی اداروں میں بھیج دیا گیا۔ اس مرتبہ میرے ساتھیوں میں ایک الجزائرئی اور دوسرے ویت نامی طالب علم تھے۔ ہمارے لیے قفقاز کا علاقہ چنا گیا تھا۔ یہاں ہمیں کارخانوں میں کام کرنا تھا۔ یہ کام بھی ہمارے نصاب کا باقاعدہ حصہ تھا۔

غیر ملکی طلبہ کو جب فیلڈ ورک کے لیے دور دراز کے علاقوں میں بھیجا جاتا ہے، تو انہیں سفر خرچ کے لیے اتنی کم رقم دی جاتی ہے جس سے وہ بمشکل کسی معمولی قسم کی ریل گاڑی کے ناقص ڈبے ہی میں سفر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کو سفر خرچ یا سامان لے جانے کا کرایہ بھی نہیں ملتا، البتہ ہر طالب علم کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے سفر کرے۔ ہم تینوں ساتھیوں نے الگ الگ سفر کیا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ پتی گورسک تک ہوائی جہاز اور آگے بس کے ذریعے سفر کروں۔ اس طرح مجھے سرکاری اخراجات سے کئی گنا زیادہ مصارف کرنے پڑے، لیکن سفر آرام سے کیا۔

سوویت یونین کے مختلف شہروں کے درمیان جو بسیں چلتی ہیں، ان میں سے اکثر مشرقی یورپ کے کیونسٹ ممالک کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ روسی ساخت کی بسوں



میں لوگ سفر کرنا پسند نہیں کرتے۔ رومانیہ کی ساختہ بسیں نسبتاً کشادہ اور آرام دہ ہیں۔ خوش قسمتی سے میں نے پتی گورسک سے میڈنا گورسک تک جس بس میں سفر کیا، وہ رومانیہ ہی کی بنی ہوئی تھی۔

بسوں کی طرح روسی جہازوں میں بھی مسافروں کے آرام کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ دوسری فضائی کمپنیوں کے مقابلے میں ایئر فلوت کے جہازوں کی نشستیں تنگ ہیں اور درمیانی فاصلہ اتنا کم ہے کہ بعض جہازوں پر تو آدمی کو پاؤں سکپٹر کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انتظامیہ نے مسافروں کی تعداد میں روز افزوں اضافے کے پیش نظر ایسا کیا ہے۔

روس میں بس پر سفر کے دوران ایک پہلو جو مجھے بہت پسند آیا، یہ تھا کہ عام طور پر ہر بس کے ساتھ دو ڈرائیور ہوتے ہیں۔ اس طرح طویل سفر کے دوران میں ایک ڈرائیور پر بے آرامی اور نیند کا غلبہ نہیں ہوتا اور حادثات کی شرح کم ہو جاتی ہے۔ ہر بس کو روانگی سے پہلے تکنیکی اور مکینکی امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور درستی کا اجازت نامہ لیے بغیر کسی گاڑی کا سٹرک پر چلنا محال ہے۔ اسی طرح ڈرائیور کا بھی طبی معائنہ کیا جاتا ہے۔ جس ڈرائیور نے شراب پی رکھی ہو یا وہ جسمانی طور پر فٹ نہ ہو، اسے گاڑی چلانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

### غیر ملکی مال کا ضبط

پتی گورسک سے ہماری بس صبح سویرے روانہ ہوئی۔ راستے میں کئی مقامات پر رکے۔ دوپہر کا کھانا کھایا۔ ایسٹو کی پیچھے، تو ڈرائیور نے مختصر وقفے کے لیے آرام کی نوید سنائی۔ ہم بس سے اترے ہی تھے کہ خبر مل گئی، یہاں سے کچھ فاصلے پر غیر ملکی قیصیں فروخت ہو رہی ہیں۔ اس خبر نے سوار یوں میں ہچل مچادی۔ تمام سواریاں بس سے



ازگئیں۔ ڈرائیور نے تاکید بھی کی کہ وقت تھوڑا ہے بس سے دُور نہ جائیں، مگر لوگ سنی ان سنی کرتے ہوئے بتائی ہوئی جگہ کی طرف بھاگنے لگے۔ میں نے سوچا، دیکھ تو لوں آخروہ قیصیں ہیں کیا چیز! اور میں بھی روانہ ہو گیا۔

تقریباً ایک کلومیٹر فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک مقام پر سنبھے جہاں لوگ طویل قطاروں میں کھڑے تھے۔ ہماری بس کے مسافروں نے خاصا شور مچایا کہ ہماری بس جانے والی ہے پہلے ہمیں دو، مگر کسی نے ان کی درخواست نہ سنی۔ جب بات سے کام نہ چلا تو دھکم پیل شروع ہو گئی ایک بوڑھی خاتون گری تو کئی آدمی اس کے اوپر سے گزر گئے۔ اس بے چاری کو خاصی زخمی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا۔

ہمارے ساتھیوں میں سے صرف دو یا تین ہی قیصوں کا "گوہرِ نایاب" حاصل کر سکے۔ باقی اس کش مکش میں تھے کہ ان کی جدوجہد کو نیا رخ مل گیا۔ قطار میں ایک آدمی ماٹے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ وہ یہ جنس گراں مایہ کہاں سے لایا ہے؟ تو اس نے بتایا کہ فلاں جگہ یہ "امپورٹڈ" مال بک رہا ہے اور لوگوں نے قیصوں کا خیال چھوڑ دیا اور سب ماٹے خریدنے چل پڑے۔ اس دُور میں صرف دو آدمی مجھ سے آگے تھے وہاں پہنچے تو ماٹے تو موجود تھے، لیکن گاہک بہت کم تھے۔ یہ تپہ چلا کہ بیچنے والوں نے خریداروں کا ہجوم دیکھ کر۔ قیمت کئی گنا بڑھا دی ہے اور اس وجہ سے بھیڑ چھٹ گئی ہے۔ ہم اتنے مہنگے ماٹے خریدنا تو نہ چاہتے تھے، لیکن اتنی بھاگ دوڑ کے بعد خالی ہاتھ جانا مناسب نہ تھا اس لیے ایک ایک کلو خرید لیے۔

ہم جس بس پر آئے تھے وہ ہماری تلاش میں پہلے قیصوں کی جائے فروخت پر پہنچی، وہاں سے چند سواریوں کو اٹھا کر ماٹے بکنے کی جگہ پر آئی اور ہمارے بجاکر لوگوں کو اٹھا کیا اور آگے روانہ ہوئی۔ اوریوں تاخیر ہونے سے بمشکل شام تک منزل مقصود میٹنا



گور شک پیچے۔

اگلی صبح میں اس کارخانے میں گیا جہاں مجھے بطور رضا کار کارکن کام کرنا تھا۔  
 اور وہ "تانا با صاف کرنے کی بہت بڑی فیکٹری ہے جس میں تقریباً پانچ ہزار ٹن خام  
 مال کی کھپت ہے۔ اس کے منیجر نے مجھے کام کی نوعیت اور مختلف شعبوں میں ہونے  
 والے کام کی تفصیل بتائی۔ کارخانے کی مشینوں کی مہیب گڑ گڑاہٹ سے کانوں کے  
 پردے پھٹے جاتے تھے اور لوگ چیخ چیخ کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔  
 دنیا بھر میں اس نوعیت کے کارخانے اب زیادہ تر خود کار مشینوں سے چلائے  
 جا رہے ہیں لیکن ہوس ابھی تک اس سے گریزاں ہے۔ ان لوگوں کی منطق یہ ہے کہ اگر  
 کارخانے خود کار بنادیں گے تو اعلیٰ قابلیت کے افراد بیکار ہو کر رہ جائیں گے  
 اور نتیجہ ماہرین کی کمی کی شکل میں برآمد ہو گا۔ ویسے خود روشی ماہرین کا خیال ہے کہ یہ  
 نظریہ غیر معقول ہے۔ اچھی صلاحیت رکھنے والے افراد کو زندگی کے دوسرے شعبوں  
 میں کھپایا جاسکتا ہے۔ خود کار مشینوں سے مصارف کم آتے ہیں اور خام مال کا ضیاع  
 بھی کم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کارخانے میں خام مال کا ضیاع پندرہ فیصد تھا  
 جو بین الاقوامی معیار سے بہت زیادہ تھا۔ بین الاقوامی معیار کے مطابق مال کا ضیاع  
 آٹھ فیصد سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔ امریکہ میں اس نوعیت کے کارخانوں میں خام  
 مال کا ضیاع صرف پانچ فیصد ہے۔

### کارخانے کے مسائل

اس کارخانے کے کام میں متعدد تکنیکی خامیاں تھیں، مگر نہ تو کوئی اس کی نشاندہی  
 کرتا تھا اور نہ کسی کو تبدیلی کی پروا تھی۔ سنگ شکنی کے کام میں اتنی گرد و اڑتی ہے کہ گرد  
 نواح کی فضا گرد و غبار سے مستقل طور پر اٹی رہتی ہے۔ یہ گرد صحت کے لیے بے حد



مضر ہے۔ قریبی آبادیوں کے اکثر لوگ ضیقِ نفس اور دمے جیسی بیماریوں میں مبتلا تھے۔

اسی طرح دیو قامت مشینوں کا مہیب شور انسانی آرام اور سکون کا دشمن ہے۔ جو لوگ پہلی بار کارخانے میں جاتے ہیں وہ تو مشینوں کی گڑ گڑاہٹ میں خود کو پاگل محسوس کرنے لگتے ہیں۔

کارخانے کے اندر سے مسموم ہوا اور گرہا ہر نکالنے کا کوئی معقول انتظام نہیں حتیٰ کہ مزدوروں کو گرہ دے بچانے کے لیے منہ پر باندھنے کے لیے کپڑا تک نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح کئی دوسرے مسائل حل طلب تھے لیکن اس بد انتظامی کے باوجود کارخانے کی انتظامیہ کے لوگ اکثر مغربی ممالک کے کارخانوں کے انتظام پر اعتراض کرتے تھے کہ وہاں مزدوروں سے جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔

مجھے جس مسئلے نے ذاتی طور پر پریشان کیا یہ تھا کہ کارخانے میں کام کے دوران میں بھوک مٹانے کا انتظام کیا ہو! اس لیے کہ کارخانے کے مزدوروں کے لیے ایسی کوئی جگہ موجود نہ تھی جہاں بیٹھ کر چائے کی ایک پیالی ہی پی سکتے۔ دوسرے روز پتہ چلا کہ کارخانے سے کچھ دور ایک قہوہ خانہ موجود ہے۔ وہاں گیا تو بھٹیاری خانے سے مشابہ ایک جگہ نظر آئی۔ قہوہ خانے والوں نے بتایا کہ اگر میں چاہوں تو "کرؤنی" موجود ہے۔ میں نے حامی بھری۔ معلوم ہوا کہ ابلی ہوئی سویاں ہیں جن میں نمک، میٹھا کچھ بھی نہیں۔ عرض کیا، کچھ اور ہوگا؟ بتایا گیا، کباب ہیں، مگر تازہ نہیں۔ یہ امر مجبوراً ہی منگوا لیے، لیکن ان کی بدبو نے پریشان کر دیا۔ شکایت کی تو خشک روٹی کا ایک ٹکڑا پیش کیا گیا۔ جسے بڑے شوق سے کھایا۔ بعد میں ایک مزدور ساتھی نے بتایا کہ یہاں کبھی روٹی میں صرف اتنی فیصد آٹا ہوتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا باقی بیس فیصد کیا چیز ہوتی ہے؟ تو اس نے کہا :



”یہ تو لیبارٹری ٹیسٹ سے ہی معلوم ہو سکتا ہے“

ہم ہاسٹل میں رہتے تھے، لیکن وہاں بھی کھانا بے حد ناقص ملتا تھا۔ کسی نے بتایا کہ ہاسٹل سے کچھ دور ایک رستوران ہے جہاں اچھا کھانا مل سکتا ہے۔ وہاں گیا تو معلوم ہوا روٹی، چاکلیٹ اور شراب کے سوا کچھ موجود نہیں۔ مجبوراً چند روز دیر کا کھانا فیکٹری کے ”قہوہ خانے“ ہی میں کھانا رہا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معدے کی پرانی بیماری عود کر آئی۔ مجبوراً فیکٹری کے مینجر کے پاس گیا اور انہیں بتایا کہ مجھے فیکٹری کے کھانے سے تکلیف ہو گئی ہے، ڈر ہے کہیں زیادہ بیمار نہ ہو جاؤں۔ انہوں نے مجھے مقامی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری سے ملنے کا مشورہ دیا اور کہا :

”صرف پارٹی کے لیڈروں کو گوشت، پنیر، مکھن، دودھ، دہی اور ہر قسم کی تازہ سبزیاں ملتی ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو آپ کو بھی حصے دار بنا سکتے ہیں“

### صحت کے مرکز میں

میں پارٹی کے سیکرٹری صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھے حصے دار تو نہ بنایا، لیکن رہنمائی ضرور کی۔ میری شکل کا حل ان کے خیال میں یہ تھا کہ میں اپنے ہاسٹل کے قریب واقع بحالی صحت کے مرکز جا کر ڈاکٹر صاحب سے ملوں، ڈاکٹر صاحب تصدیق کر دیں کہ میں واقعی بیمار ہوں تو پھر میری صحت اور خوراک کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

اگلی صبح میں سیدھا ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا۔ انہوں نے بڑی شفقت سے میرا حال احوال پوچھا اور آنے کا مقصد دریافت کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں فیملی درک کے لیے یہاں آیا ہوں اور خوراک ناقص ہونے کی وجہ سے معدے کی بیماری میں مبتلا ہو چکا ہوں۔



ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میرا تعلق کس ملک سے ہے؟ اور جب میں نے بتایا کہ افغانستان سے تعلق رکھتا ہوں، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے: ”پھر تو ہمارے علاقے قفقاز کے مسلمانوں کی زبان جانتے ہو گے؟“

میں نے انہیں بتایا کہ میری مادری زبان پشتو اور فارسی ہے، تو انہوں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا: ”کتنا اچھا ہوتا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی ایک ہی زبان ہوتی، تاکہ وہ جہاں بھی جاتے ایک دوسرے سے بات کر سکتے!“

ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے افغانستان کے بارے میں متعدد سوال کیے۔ ان کا ایک سوال یہ بھی تھا کہ آیا افغانستان میں لوگوں کو خدائے واحد کی عبادت کرنے کی اجازت ہے؟

میں نے انہیں بتایا کہ افغانستان کے لوگوں کو نہ صرف عبادت کرنے کی اجازت ہے، بلکہ وہاں ہزاروں مساجد ہیں، پانچ وقت باجماعت نماز ادا کی جاتی ہے۔ مساجد کے اونچے میناروں سے اذانوں کی آوازیں گونجتی ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب نے اداس لہجے میں کہا: ”پھر تو آپ بڑے خوش قسمت ہیں، ہم روس کے مسلمان اس نعمت سے محروم ہو چکے ہیں۔“

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنا اور اپنے خاندان کا مختصر تعارف کرایا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے خاندان کے افراد ابھی تک اسلام سے اپنا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ وہ خود بھی اسلام اور اس کی عظمت رفتہ کے عاشق زار تھے، مگر اسلام کے بارے میں انہیں کچھ زیادہ معلومات نہ تھیں۔ عربی کے چند فقرے انہیں یاد تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح روس سے کسی اسلامی ممالک کی طرف نکل جائیں۔ انہوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں اس سلسلے میں ان کی مدد کروں۔

ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کا سلسلہ اتنا طویل ہو گیا کہ وہ اصل مسئلہ بھول ہی گئے۔



میں نے دوبارہ انہیں یاد دہانی کرائی کہ میں بیمار ہوں اور ان کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ وہ مجھے اپنے سینے ٹوریم میں قیام کی اجازت دے دیں تو انہوں نے جلدی جلدی میرے کاغذات دیکھے اور مجھے ایک ماہ کے لیے اپنے ہاں داخل کر لیا۔ بڑی شفقت سے میرے لیے دو ابھی تجویز کی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایک ماہ ختم ہونے کے بعد وہ مجھے مزید قیام کی اجازت دے دیں گے۔

اس طرح مجھے نہ صرف بد ذائقہ کھانے سے نجات ملی، بلکہ فقہار کے خوبصورت ترین علاقے میں واقع اس خوش منظر سینے ٹوریم میں جسمانی اور روحانی سکون بھی نصیب ہوا۔ سینے ٹوریم کے ڈاکٹر صاحب سے دوستی کی وجہ سے الگ کمرہ مل گیا۔ یہ کمرہ دوسری منزل پر تھا اور اس کی بالکونی میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی سہولت بھی موجود تھی۔ یہاں سینے ٹوریم میں قیام کرنے والوں کے علاج کا بھی معقول انتظام تھا یہ علاج زیادہ تر معدنی پانی، معدنی کچڑ اور سپرائین پر مشتمل تھا۔ معدنی پانی ایستند کی شہر سے لایا جاتا تھا جہاں صحت بخش پانی کے کئی چشمے موجود ہیں۔

### قومی تعصب

سینے ٹوریم میں قیام کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے مجھے روس کے مختلف قوموں کے درمیان منافرت، خصوصاً اقلیتوں سے روسیوں کے امتیازی سلوک کا پتہ چلا۔ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ ایک رات تقریباً دس بجے میں بالکونی میں ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میرا مقصد صرف وقت گزاری تھا۔ کچھ دیکھنے کا کام بھی میرے پاس تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے مکمل کر لوں۔ اتنے میں ایک شخص جو چالیس پچاس کے پٹے میں تھا اچانک ایک کمرے سے نکلا اور میرے قریب آکر انتہائی درشت لہجے میں وہاں سے اٹھنے کا حکم دیا۔

میں نے بڑی نرمی سے مصالحانہ انداز میں اسے سمجھایا کہ اگر میں اس کے آرام



میں مغل ہو ہوں تو چلا جاتا ہوں، لیکن میں تو یہاں ٹھہر کر کچھ کھنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے میری بات سننے بغیر چلنا شروع کر دیا کہ اگر میں فی الفور وہاں سے چلا نہ گیا تو وہ میری اچھی طرح خبر لے گا!

اس پر میرے افغان لہو نے جوش مارا۔ میں نے وہاں سے جانے سے انکار کر دیا اور اس کی طرف توجہ دیے بغیر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اب تو اس شخص کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ اس نے گالیاں بکھی شروع کر دیں۔ کچھ دوسرے لوگ بھی کمروں سے باہر نکل آئے۔

میں نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا: ”انسان نبو!“  
اس نے میری یہ بات سنتے ہی میرے سر کے بال پکڑ لیے۔ اور چیخ کر بولا: ”تم دو ٹکے کے لوگ روس میں بات کرنے کا حق نہیں رکھتے۔“

میں نے اپنے بال چھڑا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اسے پھر خبردار کیا کہ وہ حدود پھلانگنے کی کوشش نہ کرے، مگر اس کے غیظ و غضب میں کوئی فرق نہ آیا۔ کہنے لگا: ”تمہیں جو کچھ کہا جا رہا ہے۔ کتوں کی طرح اسے مان لو ورنہ میں ابھی تمہیں تھانے بھیجتا ہوں پولیس تمہیں بتا دے گی کہ اس ملک میں تمہاری حیثیت کیا ہے۔“

اتنے میں ایک خاتون ڈاکٹر وہاں آگئی۔ وہ مجھے جانتی تھی۔ اس نے اس آدمی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے بتایا کہ میں غیر ملکی طالب علم ہوں اور میرے ساتھ اس کا یہ سلوک اس کے لیے پریشان کن بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی اُس کا رنگ اڑ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ میرے سامنے گھکھیا رہا تھا: ”میں تو آپ کو فقار کا کوئی جاہل شخص سمجھتا تھا۔ آپ کے بال بالکل داغستانی مسلمانوں جیسے ہیں۔ اسی لیے مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔“

بات اب میری سمجھ میں آئی کہ وہ مجھے کیوں تکلیف پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ مجھے مقامی



مسلمان سمجھا تھا۔ مسلمانوں کے لیے یہاں "داغستانی" اور "ایستینی" کی اصطلاحیں رائج ہیں۔ اس شخص نے کہا کہ وہ داغستانیوں اور ایستینیوں کو جان بوجھ کر چھڑتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ حکومت کے مخالف ہیں۔ اگر وہ مزاحمت کریں، تو پتہ چل جاتا ہے کہ ابھی ان میں روح باقی ہے اس لیے انہیں تھانے لے جا کر پولیس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ پولیس ان پر مشق ستم کرتی اور ان کے کس بل نکالتی ہے۔ خود میں نے لیڈی ڈاکٹر کی آمد کو اپنے لیے تاہید انیردی سمجھا۔ وہ نہ آئی تو مجھے شاید خاصے ذہنی صدمے سے گزرنا پڑتا۔

### اسلام سے محبت کرنے والی لڑکی

کالے باتوں کے حوالے سے اسی شہر کا ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ ہمارے ہوسٹلے کچھ ہی دور ایک ٹیلرنگ شاپ تھی جس پر کام کرنے والوں کی اکثریت لڑکیوں پر مشتمل تھی۔ مجھے ایک پتلون سلوانے کی ضرورت پڑی تو اس دکان پر گیا۔ جس لڑکی نے میرے پتلون تیار کی اس کا نام فاطمہ تھا۔ اس کے بال سیاہ تھے اور شکل و صورت سے وہ بالکل افغان لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

خدا جانے اس نے کس سے میری رہائش کا پتہ چلا یا۔ ایک روز میں سینی ٹوریم سے ہاسٹل آیا تو اسے اپنے کمرے کے سامنے کھڑے دیکھا۔ میں نے اس سے خیر خیریت پوچھی اور آنے کا مقصد دریافت کیا، تو اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا: "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے، کیا کمرے میں بیٹھنے کی دعوت نہ دو گے؟" میں نے کمرے کا دروازہ کھولا، تو وہ بغیر "دعوت" کے ہی میرے کمرے میں داخل ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھے یہ نام سے مخاطب کیا، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اسے میرا نام کس نے بتا دیا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہاسٹل میں میرے کسی جاننے



والے نے اسے میرا نام بھی بتایا اور یہ بھی کہ میں مسلمان ہوں۔ وہ کہنے لگی: ”مجھے تمہارے طور اظہار سے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم مسلمان ہو۔ میرا دل خود بخود تمہاری طرف کھینچا تھا۔ میری شدید آرزو ہے کہ تم مجھے دوست بنالو۔“

فاطمہ نے بتایا کہ وہ بھی مسلمان ہے اور اسلام سے محبت کی بنا پر مسلمانوں کو پسند کرتی ہے۔ اسے آرزو تھی کہ میں اسے اسلامی روایات و رسوم بتاؤں اور اسلامی عبادات و مراسم سکھاؤں۔ اپنے والدین کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اور اپنی اولاد کو بھی مسلمان دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے فاطمہ کو اسلام کے بنیادی مسائل سے روشناس کرانے کی کوشش کی تھی اور اب اس فکر میں تھے کہ اس کے مستقبل کا ساقی بھی مسلمان ہو۔ فاطمہ نے بتایا کہ اسے نماز پڑھنی نہیں آتی، مگر اس کے والدین نماز روزے کے پابند ہیں۔ اس نے کہا:

”میرے ماں باپ اسلام پر فدا ہیں، مگر اس شہر سے دور ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ مجھے اسلام سے محبت انہوں نے ہی سکھائی ہے۔ مجھے مسلمانوں سے اتنی محبت ہے کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ کسی مسلمان کی آواز مجھے بے خود کر دیتی ہے۔ یہ کہہ کر فاطمہ نے بڑی عاجزی سے کہا کہ میں اسے نماز سکھا دوں۔“

یہ کام بے حد مشکل تھا۔ اس لیے کہ روس میں نماز پڑھنا جرم نہیں، لیکن نماز پڑھنا سکھانا قتل و غارت گری سے بھی سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ کسی نوجوان اور اجنبی لڑکے کے ساتھ نشست و برخاست بھی روس میں معیوب نہیں سمجھی جاتی، مگر میرے لیے یہ بات خاصی مشکل تھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اس کا میرے پاس آنا جانا دونوں کے لیے نقصان رساں ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ روسی جانتے ہیں کہ میں مسلمان ہوں اور مجھے اپنے مذہب سے محبت ہے۔

اسے شاید ان باتوں کی زیادہ پروا نہ تھی۔ کہنے لگی: ”میں ہر قیمت پر نماز سیکھنا



چاہتی ہوں۔ چاہے مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں۔  
میں نے اس کا ارادہ پختہ دیکھا، تو حامی بھری۔ ہفتے میں ایک مرتبہ میں نماز  
کے الفاظِ روسی تلفظ میں سمجھ کر پنی دیتا جسے وہ یاد کرتی اور اگلے ہفتے مجھے سنا کر باقاعدہ  
اصلاح لیتی تھی۔ جو عبارت وہ یاد کر لیتی اسے وہ اپنی مسلمان سہیلیوں کو دے دیتی تاکہ  
وہ بھی اسے یاد کر لیں۔

اس طرح میں نے فاطمہ کو اسلام کے بنیادی اصول بتائے۔ ارکانِ اسلام سکھائے  
اور مسلمان عورت کی حیثیت سے اُس پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں اور پابندیوں سے  
آگاہ کیا۔

وہ زبانی طور پر تو یہ باتیں مانتی تھی، لیکن ان پر عمل کرنا اس کے لیے دشوار تھا۔  
اس کا لباس مغربی انداز کا تھا اور طور اطوار بھی اسلامی نہ تھے اور یوں اس سے یہ توقع بھی  
فصول تھی۔ ایک خالصتہً غیر اسلامی ماحول میں یہی غنیمت تھا کہ اس کے دل میں اپنے  
دین کی محبت زندہ تھی۔

میرے لیے آزمائش کا لمحہ وہ تھا جب فاطمہ نے مجھ سے شادی کی خواہش  
ظاہر کی۔ اس روز وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ کہنے لگی: ”اس ملک میں مسلمان کے طور  
پر زندگی گزارنی بے حد دشوار ہے۔ تم مجھے اپنے ساتھ افغانستان لے چلو۔ میرے  
ساتھ شادی کر لو۔“

میں نے اپنی مشکلات بتائیں اور سمجھایا کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں تو وہ کہنے  
لگی: ”کوئی مضائقہ نہیں۔ اسلام میں تو چار شادیوں کی اجازت ہے۔“  
میں نے پھر بھی غدر کیا تو کہنے لگی: ”خدا گواہ ہے، میں صرف اس کفرستان سے  
نکل بھاگنا چاہتی ہوں۔ افغانستان لے جا کر چاہے تم مجھے کتوں کے آگے ڈال دینا  
مگر یہاں سے مجھے نکال لے جاؤ۔“



یہ باتیں کرتے ہوئے وہ بار بار رو پڑتی تھی۔ مجھے اس لی بے بسی پر شدت سے ترس آتا تھا، لیکن میری مجبوریاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ روس میں پانچ کروڑ بے بس مسلمان بستے ہیں۔ ان کی غالب اکثریت روس سے ہجرت کی آرزو رکھتی ہے، لیکن موجودہ حالات میں اشتراکیت کے پنچے سے رہائی آسان کام نہیں ہے۔

### مسلمانوں کی پروردستان

کارخانے میں ایک ایٹینی نوجوان کام کرتا تھا۔ وہ اکثر میرے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور ہم فارغ اوقات میں گپ شپ بھی کرتے تھے۔ اس کا نام مسلمانوں جیسا تھا، غالباً شریف، اس نے ابتدا میں مجھے اپنے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ شاید وہ اشتراکیت کے رنگ میں رنگا ہوا ہوگا، لیکن چند روز کی نشست و برخاست کے بعد جب اسے معلوم ہوا کہ میں مسلمان ہوں اور مجھے روسی مسلمانوں کی حالت زار پر سخت کڑھن ہوتی ہے، تو اس نے بتایا کہ وہ بھی مسلمان ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس علاقے کے مسلمانوں کے حالات معلوم کروں، لیکن مجھے شریف کے ساتھ علیحدگی میں بیٹھنے کا موقع کم ہی ملتا تھا، لیکن یہ موقع فراہم ہو ہی گیا۔

ایک روز میں کارخانے کے مزدوروں کے ساتھ قریبی جنگل میں گھاس کاٹنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ یہ علاقہ جسے "سیناکوٹ" کہا جاتا ہے، جنگلی پھولوں اور فطری حسن کا نادر نمونہ ہے۔ گھاس کے وسیع قطعوں میں ہزاروں رنگ برنگے پھول روح کی تازگی کا سامان کر رہے تھے، لیکن میں زیادہ دیر تک اس نظارے سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ وجہ یہ تھی کہ میری طبیعت ٹھیک نہ تھی اور گھاس کاٹنے کا کام خاصا دشوار تھا۔ کارخانے کے منیجر نے مجھے چھٹی نو دے دی، لیکن واپس جانے کے لیے کوئی گاڑی نہ تھی اس لیے میں نے اپنے ساتھ شریف کو لے جانے کی اجازت چاہی جو مل گئی۔



راتے میں شریف نے قفقاز کی تاریخ کے کچھ عبرتناک واقعات سنائے۔  
اس نے بتایا کہ اب یہاں کے مسلمانوں کے کیسے حالات ہیں اور مستقبل کے لیے  
ان کے کیا منصوبے ہیں؟ یہ گفتگو میرے لیے بڑی دلچسپ تھی۔ میں یہاں اس کے چند  
حصے نقل کرتا ہوں۔

قفقاز کے مسلمانوں نے آزادی کی تحریکوں میں شامل ہو کر بڑی قربانیاں پیش کی  
ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں اشتراکی انقلاب کے فوراً بعد ترک داغستان کے نام سے آزاد حکومت  
کا اعلان ہوا۔ اس سے پہلے داغستان کی اسلامی تحریک نے امام شاملؒ کی قیادت میں  
قفقاز کی وادیوں اور میدانوں میں شجاعت اور جاں نثاری کے بے مثال کارنامے  
انجام دیے۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی اور حریت کی روح پھونکی  
مگر روس کی بڑھتی اور پھیلتی فوجی قوت اور جبر کے طوفان کے سامنے مزاحمت کی تمام  
کوششیں دم توڑ گئیں۔

تاہم یہ قفقاز کے مسلم قبائل کی مسلسل جدوجہد ہی کا نتیجہ تھا کہ لینن نے عوام  
کو مطمئن کرنے کے لیے سٹالین کو وہاں بھیجا جس نے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ :  
”داغستان کو مکمل مذہبی آزادی اور خود مختاری دی جائے گی اور اس  
کی آزادی کا احترام کیا جائے گا“

مگر یہ وعدہ صرف مسلمانوں کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے کیا گیا تھا۔  
جیسے ہی یہ مقصد پورا ہو گیا، سارے وعدے پس پشت ڈال دیے گئے۔

### دلوں میں دبی چنگاریاں

اس کے بعد روسی فوجیں دوسرے علاقوں کی طرح قفقاز کے مختلف حصوں کو  
بھی یکے بعد دیگرے منسوب کرنے لگیں۔ مسلمانوں نے اپنی سرزمین کے ایک ایک چپے



کے لیے جنگ لڑی۔ ابانا کے مشہور قلعے کی ایک ایک انچ زمین پر مسلمان حریت پسندوں کے ہونے کے پھینٹے موجود ہیں۔ یہ ان کا اہم مرکز تھا۔ انہیں خوراک اور سامان جنگ کی کمی کا سامنا ہوا، مگر وہ پیٹ پر پتھر باندھ کر لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت جسام شہادت نوش کر گئی، جو بچ گئے کیونسٹوں نے انہیں ٹرکوں میں بھر کر ساٹیریا بھیج دیا۔ یوں قفقاز کا پورا علاقہ روس میں شامل کر لیا گیا۔

آج قفقاز بھی دوسری مسلم ریاستوں کی طرح اپنا ملی تشخص کھو چکا ہے اور روسیہ حکومت کی جبری پالیسی کی وجہ سے کسی کی مجال نہیں کہ وہ علانیہ طور پر اسلام پر چل سکے۔ اس کے باوجود اسلام یہاں رہنے والوں کے دلوں میں زندہ ہے اور دلوں میں دبی ہوئی چنگاری کسی وقت آزادی کے شعلے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

جب میں نے شریف سے پوچھا کہ آیا اس کے خیال میں مسلمان موجودہ صورت حال سے مایوس ہو چکے ہیں یا ایسا ممکن ہے کہ آزادی کی کوئی تحریک دوبارہ اُبھر سکے؟ تو اس نے کہا: ”بدقسمتی سے علماء کی اکثریت ختم ہو چکی ہے۔ چند بچے کچھے عالم بھی اس لیے بچ گئے ہیں کہ انہوں نے علماء کی طرح کا حلیہ بنانا ترک کر دیا ہے اور وہ عام لوگوں میں مل کر رہتے ہیں۔ انہوں نے مل کر مقامی مسلمانوں کے لیے ایسا طریق کار وضع کیا ہے جس سے ان کا عقیدہ اور وجود دونوں سلامت رہیں۔ علماء کے متفقہ فیصلے کے مطابق ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ ۱۔

۱۔ اسلام سے اپنی وابستگی قائم رکھے۔ اس لیے کہ مسلمان ہونے کے لیے ایمان بنیادی ضرورت ہے۔ ہر مسلمان بچے کو خدا، رسول اور قیامت پر ایمان کی تعلیم دینا ضروری ہے۔

۲۔ چونکہ روس کے اسلام دشمن ماحول میں عبادت کرنے کی آزادی نہیں اس لیے تمام مسلمان اپنے گھروں میں مخصوص اوقات میں عبادت کریں مقررہ اوقات میں نماز



ادانہ کی جائے تورات کے وقت یا دن کے کسی وقت پانچوں نمازیں اکٹھی پڑھی جا سکتی ہیں۔

۳۔ روسی حکومت روزہ رکھنے والے مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔ اس لیے جو شخص روزہ نہ رکھ سکے وہ فدیہ ادا کرے۔ فدیہ ادا کرنے کی توفیق بھی نہ ہو، تو کوئی ایسی عبادت کر لی جائے جو ممکن ہو۔

۴۔ حج اور عیدین جیسی اجتماعی عبادات ساقط ہو چکی ہیں۔ ان کی جگہ ہر مسلمان انفرادی طور پر ذکر و اذکار کرے اور خدا کے حضور دعا کرتا رہے کہ مسلمانانِ روس کو ظلم و جبر کے پنجے سے رہائی نصیب ہو تاکہ وہ ایک بار پھر خانہ کعبہ اور روضہ رسولؐ کی زیارت کر سکیں اور حج، زکوٰۃ اور نماز ادا کر سکیں۔

### اسلام کے خلاف سرکاری حربے

شریف نے بتایا: ”حکومت کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلام فقہاء کے عوام کے رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہا ہے۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو اسلام سے متنفر کرنے کے خاص حربے استعمال کر رہی ہے۔ اسلامی عقائد کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ مثلاً روزے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس سے انسان کی توانائی ضائع ہوتی اور کارکردگی میں کمی آتی ہے۔ کچھ نام نہاد مسلمان اور علماء بھی اس پروپیگنڈے میں حکومتی ذرائع ابلاغ کا ساتھ دیتے ہیں۔ علماء نے اس پروپیگنڈے کے جواب میں لوگوں کو بتایا ہے کہ روزہ نہ صرف معدے کی متعدد بیماریوں کا علاج ہے، بلکہ اس کے ذریعے سرطان جیسے لاعلاج مرض کا علاج ممکن ہے۔ اس کے ثبوت میں بہت سے ایسے مریضوں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو صرف روزہ رکھنے کی بنا پر کینسر اور دوسری مہلک بیماریوں سے نجات پا گئے۔

کیونسلٹ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو مسلمان نماز نہ پڑھیں یا روزہ نہ رکھیں، علماء انہیں



مسلمان نہیں سمجھتے۔ اس لیے ایسے مذہب کو گلے لگانے سے کیا فائدہ جس کے علماء اتنے تنگ نظر اور متعصب ہوں۔

علماء نے اس حربے کا توڑ کرنے کے لیے متفقہ طور پر فیصلہ کیا اور اپنے فیصلے سے عام مسلمانوں کو آگاہ کر دیا ہے کہ صرف نماز اور روزے کے ترک کرنے سے کوئی شخص دائرۃ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ ہر وہ شخص جو خدائے واحد پر یقین رکھتا ہو، مسلمان ہے۔ عمل کرے گا تو اجر پائے گا۔ عمل نہ کرے گا تو سزا کا مستحق ہوگا، لیکن محض عمل نہ کرنے سے کوئی شخص دائرۃ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ اس سے کیوسٹوں کا حربہ خود بخود ناکام ہو گیا۔

عید قرباں کے موقع پر مسلمان قربانی کرتے تھے۔ حکومت نے خاص طور پر حکم نافذ کیا کہ اس روز کوئی جانور ذبح نہ کیا جائے۔ علماء نے اس مشکل کا حل بھی نکال لیا۔ لوگوں سے کہا گیا کہ وہ اس پابندی سے مایوس نہ ہوں، بلکہ قربانی کی رقم جمع کر کے ایسے کاموں پر صرف کریں جن سے دین کی اشاعت میں مدد ملے۔

مسلمانوں کی تمام بستیوں میں مختلف سوشل پروگرام ہوتے ہیں، خصوصی دعوتیں اور مجالس برپا ہوتی ہیں جو بظاہر سماجی بہبود کے نام پر ہوتی ہیں، لیکن ان میں اجتماعی عبادات ہوتی ہیں۔ دین کی اشاعت اور تبلیغ کے پروگرام طے پاتے ہیں اور نئی نسل کو اسلام سے روشناس کرنے کے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ اہل تصوف نے اپنے

---

۱۔ فقہاء کے مسلمانوں کے خاص حالات کی بنا پر تو شاید اس بات کو درست سمجھا جائے، ورنہ نماز تو دین کا ستون ہے اور ہر حالت میں اس کی ادائیگی ضروری ہے۔ یہی حکم روزے اور دیگر ارکان دین کا ہے۔



حلقے قائم کر رکھے ہیں عوام الناس مختلف بزرگوں سے باقاعدہ بیعت کرتے اور سلوک و ارشاد کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔

علماء کی طرح صوفیاء بھی عام لوگوں کو جبر کے سامنے سینہ سپر ہونے اور دلوں میں اسلام بسائے رکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور فقہاء کا شاید ہی کوئی گھرا لیا ہو جس کی کسی نہ کسی سلسلہ ارشاد سے وابستگی نہیں ہے۔

### جذبات کے بجائے حکمت

حالات نے روسی مسلمانوں کو بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ وہ یہ سب کام ایسی حکمت سے کرتے ہیں کہ حکومت ان پر ہاتھ بھی نہیں ڈال سکتی۔ سوشلسٹوں کے دل جیتنے کے لیے مسلمان آبادیوں میں محنت اور دیانت کا چلن عام کرنے کے لیے باقاعدہ پروگرام تشکیل دیے جاتے ہیں۔ اجتماعات میں انصاف، عدل اور مساوات کے موضوعات پر تقاریر ہوتی ہیں۔ ان تقاریر میں کارخانوں کی پیداوار بڑھانے اور ملک کی ترقی میں حصہ لینے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے۔ لوگوں کو سچ بولنے، ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھنے، کمزوروں اور غریبوں کی مدد کرنے اور رزقِ حلال کمانے کی تلقین کی جاتی ہے۔ غلط نصیحت کا یہ سلسلہ باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ مسلمانوں میں ملی وحدت کا شعور جاگ اٹھا ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح کمیونزم کے فکری غلبے اور استیلاء سے ہراساں نہیں ہیں۔

نوجوانوں میں نظم و ضبط اور ملی احساس کا شعور بزرگوں سے بھی زیادہ ہے۔ کارخانوں اور کلخوزوں میں کام کرنے والے مسلمان نوجوان دوسروں کی نسبت زیادہ چست، محنتی اور روشن خیال ہیں۔ یہ سوچ ان کے دلوں میں راسخ ہو چکی ہے کہ اسلام دنیا میں غالب ہونے کے لیے آیا ہے اور کمیونزم کے بعد پھر اسلام کی باری ہے۔



شریف کی باتوں میں شعور کی نچسگی سے مجھے عجیب سا روحانی سرور حاصل ہوا۔ جب اس نے مجھے یہ بتایا کہ ہمارے کارخانے کے مزدوروں کی بڑی تعداد مسلمان ہے اور وہ دل و جان سے اسلام کے شیدائی ہیں تو مجھے اس تصور نے بڑی راحت پہنچائی کہ میں اس دباؤ وغیر میں بھی اپنوں کے درمیان ہوں۔ شریف نے کہا :  
 ”ہم نے اچھی طرح سیکھ لیا ہے کہ روس میں کفر کی طاقت کا مقابلہ حکمت و بصیرت ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حالات کبھی پھر ہمیں ان کے مقابل لاکھڑا کریں، فی الحال ہم ٹھہر کر اپنا وجود مٹانے کے بجائے، اپنا وجود منوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

شریف کی بات کی تصدیق ایک کمیونسٹ استاد نے بھی کی۔ وہ یونیورسٹی میں ہیں پڑھاتے تھے۔ ایک روز روس میں اقلیتوں کے موضوع پر لیکچر کے دوران میں انہوں نے کہا :

”مسلمانوں کی ریاستوں سے کمیونزم کو زبردست خطرہ ہے۔ وہاں آج بھی اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے مصلحتاً روسی قانون کے سامنے سر جھکا رکھے ہیں۔ حقیقت میں وہ سچے مسلمان ہیں۔ جیسے ہی انہیں موقع ملا پوری طاقت کے ساتھ کمیونزم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔“

### مذہب دشمنی کا مہنگا تجربہ

روس کو مذہب دشمنی کا تجربہ خاصا مہنگا پڑا ہے۔ گزشتہ چھ عشروں میں حکومت نے پوری قوت سے ہر اس ادارے کو ختم کرنے کی کوشش کی جو مذہب کا نام لیوا تھا۔ اس کا نتیجہ پوری روسی قوم خصوصاً نوجوانوں کی بے راہروی کی شکل میں نکلا ہے۔ روسی اپنے معاشرے سے خدا کو نکالنے کی کوشش میں خوفِ خدا سے محروم ہو چکے ہیں۔ شراب نوشی



بدکاری، بددیانتی، کام میں غفلت اور چوری جیسے قبائح معاشرے میں عام ہو چکے ہیں۔ روحانیت سے محرومی نے "مادیت" کو بھی دھچکا لگایا ہے۔ کارخانوں میں پیداوار کا گراف نیچے گر رہا ہے۔ کلخوزوں میں اجناس کی پیداوار تمام وسائل کے باوجود کم ہے۔ سب سے بڑا اثر خاندانی تعلقات پر پڑا ہے۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کے رشتے کا پنچ کی دیوار بن گئے ہیں۔ میاں بیوی کے درمیان تعلقات "کمرشل" ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ کیونسٹ جنہوں نے اپنی زندگیاں مذہب دشمنی کے لیے وقف کر رکھی تھیں، اب اپنی آوارہ اولاد کے ہاتھوں اس قدر پریشان ہیں کہ خود کو شمش کرتے ہیں ان کے بیٹے بیٹیاں اسلام یا عیسائیت کی طرف مائل ہو جائیں۔

یہ صورت حال کرملین کے "بڑوں" کے لیے بجا طور پر قابل تشویش ہے۔ کیونز کم کے لیے قربانیاں پیش کرنے والی نسل اٹھتی جاتی ہے اور اس کی جگہ لینے والی نئی نسل کیونز کم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ اس کے بجائے معاشرے میں بے راہروی رواج پا چکی ہے۔ اب کوئی جادوگر ہی نئی نسل کو زیادہ عرصے تک کیونسٹ نہیں رکھ سکتی۔ فکری تربیت کرنے والے اداروں کو بار بار ہدایات دی جاتی ہیں کہ وہ نوجوانوں کو خالص اور مخلص اشتراکی بنائیں۔ انہیں سائنٹفک سوشلزم کی ایسی تربیت دیں کہ وہ آنے والے دور میں روس کو دنیا کی عظیم ترین قوت بنا سکیں مگر اس کا نتیجہ صفر نکلتا ہے۔ اب روسی منصوبہ سازوں پر یہ حقیقت فاش ہو چکی ہے کہ نئی نسل مذہب سے دور ہونے کے ساتھ ساتھ اشتراکیت سے بھی دور ہو چکی ہے۔ اس کے سامنے کوئی مقصد اور منزل نہیں ہے۔

تفقاز میں روسی اور یوکرینی باشندوں کو بڑی تعداد میں بسایا گیا ہے، لیکن مقامی باشندوں کی تعداد اب بھی زیادہ ہے۔ خصوصاً دیہات میں تو تفقازی مسلمانوں کی اکثریت واضح ہے۔ صنعتی علاقوں میں روسی زیادہ ہیں۔ دیہات کی مسلم آبادی کی عورتیں صرف اپنے گھر کا کام کاج کرتی ہیں۔ کارخانوں اور زرعی فارموں پر کام مرد ہی کرتے ہیں۔ افغانستان کی طرح



فقہاء کی آبادی بھی مختلف قبائل پر مشتمل ہے اور ہر قبیلہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے ہوئے ہے۔ مختلف قبائل میں دشمنیاں نسل در نسل چلتی ہیں۔ مجھے لوگوں نے بتایا کہ ماضی میں قبائل کے درمیان عداوتیں بہت شدید تھیں۔ کیونستوں نے اس سے فائدہ اٹھایا تاہم اب صورت حال تبدیل ہو چکی ہے۔ مختلف مسلم قبائل کے درمیان خاصی مفاہمت آچکی ہے۔ وہ سب اپنے مشترکہ دشمن کیونزیم کے خلاف متحد ہونے کے لیے تیار ہیں۔

### چرکس بازار

کارخانے میں چرکس بازار کا بہت شہرہ سنا تو مجھے بھی شوق ہوا کہ اسے ایک نظر دیکھوں تو سہی جس کی اتنی تعریفیں ہوتی ہیں۔ میرے ساتھی کارکن کہتے تھے کہ فقہاء کے نیوچرکس بازار میں دنیا کی نادر سے نادر چیز موجود ہے۔

میں ادارے کے سربراہ سے اجازت لے کر ایک دن چرکس بازار دیکھنے گیا۔ پتہ چلا کہ یہ ایک طرح کا "باڑہ بازار" ہے۔ ہر چیز یہاں بک رہی تھی۔ یہاں تک کہ کتے اور گدھے فروخت کرنے کی منڈی بھی موجود تھی، مگر جس چیز نے اس بازار کو حقیقی مغنول میں رونق بخشی، وہ کپڑا تھا۔ کپڑا بھی غیر ملکی۔ جاپان، کوریا، سنگاپور اور یورپ کا بنا ہوا ہر قسم کا سوتی اور ریشمی کپڑا موجود تھا۔

زیادہ مانگ جاپانی کپڑے کی تھی۔ دکاندار لوگوں کی نفسیات سے آگاہ ہو چکے ہیں اس لیے جاپان کے ٹھپے لگا کر روسی کپڑا بھی فروخت کر دیتے ہیں۔ بازار کا نام قریبی گاؤں چرکس کی وجہ سے چرکس بازار پڑ گیا ہے۔ مجھے فقہاء کی گھریلو دستکار عین خصوصاً کشیدہ کاری کے نمونے بہت پسند آئے۔

نیوچرکس بازار کھلے میدان میں لگتا ہے۔ میلے کا سا سماں ہوتا ہے۔ تین دن بھر



ایک دکان سے دوسری دکان پر جاتا دکانداروں سے گفتگو کرتا اور ان کے حال احوال پوچھتا رہا۔ دکانداروں کی اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ مسلمان بھی راسخ العقیدہ اور عزم و استقامت والے۔ عام طور پر روس کے مسلمان دل کی بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں لیکن قفقاز کے مسلمان خوف سے کوسوں دور ہیں۔ وہ دل کی بات فوراً زبان پر لے آتے ہیں۔

ایک دکاندار نے مجھے یہ بتا کر حیرت میں ڈال دیا کہ ان کے گاؤں کی مسجد میں امام صاحب پانچوں وقت باجماعت نماز پڑھاتے اور درس دیتے ہیں۔ ان کی تصدیق کرنے کے لیے میں نے دوسروں سے بھی پوچھا۔ تقریباً ہر شخص کا جواب یہی تھا کہ دیہات میں لوگ باقاعدہ مسجد میں جاتے ہیں۔

حکومت پہلے روکتی رہی۔ لیکن اب بے بس ہو چکی ہے۔ دکانداروں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں افغانستان کا مسلمان ہوں، تو انہوں نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ مجھے اپنے گاؤں کے مسلمانوں سے ملائیں گے، لیکن میرے لیے یہ بات آسان نہ تھی۔ اپنی مرضی سے کہیں جانے کا مجھے اختیار نہ تھا؛ چنانچہ معذرت کر لی۔

## قرآن پاک کے نسخے

بجز کس بازار میں دستیاب چیزوں میں سب سے قیمتی جنس قرآن پاک کے نسخے تھے۔ قرآن پاک یہاں نہایت خفیہ طریقے سے لایا جاتا اور دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے۔ ایک دکاندار نے مجھے ایک ایرانی نسخہ دکھایا۔ اس کی قیمت سینکڑوں روپے تھی۔ اس دکاندار نے بتایا کہ قرآن پاک کی خرید و فروخت قانونی طور پر سخت ممنوع ہے۔ حکومت چھاپے مارتی رہتی ہے۔ پتہ چلنے پر سخت سزائیں بھی دی جاتی ہیں، لیکن قرآن



پاک کی حفاظت خدا تعالیٰ نے اپنے ذمے لگا رکھی ہے۔ حکومت کی ساری مشینری قرآن کی خرید و فروخت کو نہیں روک سکتی۔

ایک ایستینی دکاندار نے بتایا کہ مسلمانوں کی اکثریت قرآن پاک پڑھ سکتی ہے۔ جو لوگ نہیں پڑھ سکتے وہ بھی خطیر رقم خرچ کر کے قرآن پاک خریدتے ہیں۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ مسلمانوں کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ قرآن گھر میں رکھنا بھی موجب ثواب اور باعث خیر و برکت ہے۔

ایک دکاندار نے قرآن پاک کی چند آیات پڑھ کر سنائیں اور بڑے فخر سے کہا کہ اس گاؤں کی اکثر آبادی قرآن خواں ہے۔ اس کے اپنے گھر کے بچے تک قرآن پڑھنا جانتے ہیں۔ اسی نے بتایا کہ بعض لوگوں کے پاس روسی ترجمے والے نسخے بھی موجود ہیں۔ ایک دکاندار نے بتایا کہ اس بازار میں قرآن پاک کی روسی زبان میں تفسیر کے چند نسخے بھی موجود ہیں، لیکن ان کی قیمت ہزاروں روپے ہے اس لیے عام آدمی انہیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اُس نے بڑی حسرت سے کہا :

”کاش یہاں چھاپ خانے آزاد ہوتے۔ میں اس تفسیر کی طباعت کراتا اور ہر گھر

تک پہنچا دیتا۔“

قفقاز میں کچھ جاہلانہ رسوم بھی زندہ ہیں۔ ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ فلاں مقام سے ایک نوجوان ایک لڑکی کو اغوا کر کے جنگل میں لے گیا ہے، تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ اس لیے کہ اس معاشرے میں جہاں اس قدر جنسی آزادی ہے، کسی لڑکی کو اغوا کرنے کی نوبت کیوں آگئی؟

پوچھنے پر مجھے بتایا گیا کہ یہاں لوگوں میں ایک رسم قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے کہ اگر کوئی نوجوان کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہو، تو وہ اسے اغوا کر کے جنگل میں لے جاتا اور ہفتے عشرے کے بعد اپنے گھر والوں کو اپنے ”کارنامے“ کی اطلاع



دیتا ہے؛ چنانچہ لڑکے کے والدین یا سرپرست لڑکی کے والدین سے ملتے اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہیں۔ فریقین کے درمیان مذاکرات ہوتے ہیں اور چند شرائط پر صلح ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد لڑکا اور لڑکی باعزت طور پر واپس بلائے جاتے ہیں اور بزرگ مل بیٹھ کر ان کا باقاعدہ نکاح کر دیتے ہیں۔ اگرچہ لوگوں کی اکثریت اس رسم بد سے سخت نفرت کرتی ہے، لیکن فقہ قازی نوجوان اسے بڑے فخر سے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

### ملی تشخص کی خاطر

اس بات کی تعریف کرنی ہوگی کہ اشتراکیت کے غلبے کے باوجود روس میں آباد مسلم اقوام نے شادی بیاہ کے سلسلے میں اپنے ملی تشخص کو قائم رکھا ہے۔ اگرچہ روسی حکومت نے ذرائع ابلاغ کی مدد سے پوری کوشش کی کہ مسلم اور غیر مسلم قومیں آپس میں شادیاں کریں۔ ایسے قوانین وضع کئے گئے جن سے مسلمانوں کی دوسری غیر مسلم اقوام شادیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی، لیکن اس کے باوجود وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کے مسلمانوں نے اپنی روایت اور مذہب کے مقابلے میں حکومت کی پالیسی کو رد کر دیا ہے۔ مختلف اقوام کے نوے فیصد سے زیادہ لڑکوں نے اپنے قبیلے کی لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ اس سلسلے میں روسی حکومت کے اعداد و شمار خلاصے دلچسپ ہیں۔ یہ اعداد و شمار ۱۹۶۹ء کے ہیں :

اپنی قوم میں شادیاں کرنے والے

۹۳،۶ فیصد

۹۵،۴

۹۰،۶

قوم

قازق

قرغیز

ترکمان



۹۸، ۸ فیصد

آذربائیجانی

۸۶، ۲

ازبک

۷۷، ۳

تاجک

ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی تک مسلم قبائل میں اپنے قبیلوں میں شادی کرنے کا رواج ہے تھوڑی شادیاں جو قبائل سے باہر ہوتی ہیں وہ بھی دوسرے مسلم قبائل میں ہوتی ہیں۔ کیونستوں کی تقلید میں اکادکا شادیاں غیر مسلموں کے ساتھ بھی ہونے لگی ہیں، لیکن ان کا بھی طریق کاریہ ہے کہ لڑکا مسلمان ہوتا ہے اور لڑکی غیر مسلم۔ یہ مسلمان لڑکے اپنے لیے شریک حیات کا انتخاب خود کرتے ہیں، لیکن وہ بھی روسی اور یوکرینی کے بجائے تاجک، ازبک اور آذربائیجان کے علاقوں کی غیر مسلم لڑکیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

روس میں اپنے طویل قیام کے دوران میں مجھے کم ہی ایسی مثال ملی کہ کسی مسلمان لڑکی نے کسی غیر مسلم سے شادی کی ہو۔ روسی طلبہ ایسی مثالیں پیش کرتے تھے، لیکن ہمارے مسلمان کلاس فیلو اس کی تردید کرتے اور کہتے تھے کہ کچھ مسلمان لڑکیوں نے لاپلج یاد باؤ میں آکر ایسا کیا ہوگا، لیکن ایسی لڑکیوں کو نہ تو والدین قبول کرتے ہیں نہ ان کا قبیلہ۔ سرکاری اندازوں کے مطابق مسلمان لڑکوں کی غیر مسلم لڑکیوں سے شادی کا تناسب بڑھا ہے۔ مگر اضافے کے باوجود ابھی تک شرح فقط چار فی ہزار ہے۔

ہمارے ایک قازق مسلمان ساتھی نے ایک یوکرینی غیر مسلم لڑکی سے شادی کی، تو میں نے ایک روز اس سے پوچھا کہ اس نے غیر مسلم لڑکی سے شادی کیوں کی؟ اسلام میں تو مسلمانوں کے علاوہ صرف اہل کتاب سے شادی کی اجازت ہے! اُس نے بتایا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مالی حالات اچھے نہیں۔ اس کی بیوی پیسے والی ہے۔ اس لیے اس نے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے شادی کی ہے۔



جب تعلیم مکمل ہو جائے گی تو وہ اس سے جان چھڑا لے گا اور اپنے قبیلے کی لڑکی سے شادی کر لے گا۔

کریوے روگ میں ہم نے ایک مسلمان انجینئر کی شادی میں شرکت کی جس نے ایک روسی لڑکی سے شادی کی تھی، لیکن دوسرے برس تعلیم مکمل ہوتے ہی اس نے اسے طلاق دے کر ایک مسلمان لڑکی سے شادی کر لی۔

صرف شادی بیاہ ہی نہیں، مسلمان دوسری رسوم میں بھی اسلامی شخص پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ مثلاً مسلمانوں میں یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر رائج ہے کہ جس کا ختنہ نہیں وہ مسلمان نہیں۔ حالانکہ روس میں ختنہ کرنا قانوناً منع ہے، لیکن مسلمان اس پابندی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ایک تاجک مسلمان طالب علم نے بڑے فخر سے کہا کہ مسلمان روسیوں سے ہمیشہ ممتاز رہیں گے۔ چاہے وہ کمیونزم کی ہر بات قبول کر لیں، لیکن یہ بات نہیں مان سکتے کہ اپنا ختنہ نہ کرائیں۔ ختنہ کرنا ہمارا قومی شخص ہے۔

### بچوں کے اسلامی نام

روسی مسلمان اپنے بچوں کا نام رکھنے میں خاصا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کے ناموں میں عام طور پر بزرگانِ دین کے نام لاحقے یا سابقے کے طور پر شامل ہوتے ہیں۔ عبد اللہ، عبد الرحیم جیسے ناموں کے علاوہ پیغمبروں کے ناموں پر بھی نام رکھے جاتے ہیں۔ شیعہ حضرات اپنے بچوں کے نام کے ساتھ علی، حسن، حسین اور رضا وغیرہ کے سابقے اور لاحقے لگاتے ہیں۔

بعض علاقوں میں شادی بیاہ کے سلسلے میں ایک قبیح رسم بھی رائج ہے۔ لڑکی کے والدین لڑکے سے ایک مخصوص رقم وصول کرتے ہیں اور اسے مہر کا نام دیتے ہیں۔ اس نام نہاد مہر کی وجہ سے بہت سے لڑکے شادی کے انتظار میں بوڑھے ہو جاتے



ہیں۔ ویسے یہ رسم اب متروک ہو رہی ہے

عیدین کے اجتماعات پر پابندی کے باوجود قفقاز اور دوسری مسلم ریاستوں کے مسلمان عید کی خوشی بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ اس موقع پر ایک دوسرے کے گھروں میں تحفے بھیجے جلتے ہیں۔ بڑی بڑی دعوتیں دی جاتی ہیں اور عید کی نماز ادا کرنے کے لیے اجتماعات منعقد کیے جاتے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے لوگ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے تہواروں کو روس کی سالمیت کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عید کے اجتماعات مسلمانوں میں اتحاد کی روح پھونکتے ہیں۔ قفقاز میں کئی لوگوں نے مجھے بتایا کہ کمیونسٹ جس قدر مسلمانوں کو عید منانے سے روکتے ہیں، اُسی قدر ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

میرے ایک غیر ملکی جرنلسٹ دوست نے مجھے بتایا کہ اس نے ازبکستان کے علاقے میں جشن اکتوبر کے موقع پر کئی لوگوں سے پوچھا کہ آیا اس علاقے کا سب سے بڑا جشن، اجتماع اکتوبر کے موقع پر ہوتا ہے؟ تو انہوں نے اس کی نفی کی اور کہا عید الفطر کا اجتماع سب سے بڑا جشن ہوتا ہے، حکومت کے کارندے عید کے جشن کو فضول خرچی اور فیوڈل ازم کی یادگار کہتے ہیں، مگر اس فضول خرچی کو روکنا کسی کے بس میں نہیں۔

### اہل تصوف کے حلقے

مسلمانوں میں اہل تصوف کی بہت قدر و منزلت ہے۔ صوفیاء کے دوسلے : نقشبندیہ اور قادریہ زیادہ متعارف ہیں۔ قفقاز کے علاقے میں تو صوفیاء کو معاشرے میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ ایک اندازے کے مطابق چھ لاکھ مسلمان اس علاقے میں مختلف مشائخ سے بیعت ہیں۔ میرے دوست شریف داغستانی نے بتایا کہ قفقاز کے لوگوں کی بود و باش اس قسم کی ہے کہ ان پر حکومت کی اقتصادی گرفت زیادہ مضبوط



نہیں ہو سکتی۔ وہ کارخانوں اور زرعی فارموں سے ابھی تک دور ہیں۔ زیادہ تر لوگ تجارت اور کاشتکاری کرتے ہیں، یا بھیڑ بکریاں اور دوسرے مویشی پالتے ہیں۔ اس طرح انہیں اقتصادی لحاظ سے پرسکون زندگی گزارنے کے مواقع ملتے ہیں۔ بہت سے بزرگانِ دین اور علماء کرام لوگوں کو روحانی علوم کی تعلیم دیتے ہیں، لیکن حکومت ان کا احتساب نہیں کر سکتی۔

افغانستان کے قبائل زیادہ تر پہاڑوں پر آباد ہیں۔ ان کی بستیوں میں چھوٹی چھوٹی مساجد اور صوفیاء کی خانقاہیں موجود ہیں۔ مذہب ان کے لیے صرف عقیدے کا نام نہیں، بلکہ زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا ہے۔ شہر دوں میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے اسلام پر چلنا محال ہے۔ خصوصاً مراسمِ عبادت کی ادائیگی ان کے لیے بے حد مشکل ہے۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو اسلام سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ ایک عرصہ کمیونسٹوں کے دباؤ میں رہنے کے باعث اب وہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے بھی آگاہ نہیں، لیکن اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے کم نہیں سمجھتے۔ چرکس بازار کے ایک دکاندار سے گفتگو ہوئی۔ جسے کلمہ تو یاد تھا، مگر اس کا مفہوم معلوم نہ تھا وہ کہنے لگا :

”ہمارا جینا اور مرنا سب کچھ ہمارے دین کے لیے ہے“

### آزادی کا مفہوم

۱۹۷۵ء کے جشن انقلاب کے موقع پر روس کے صدر لیونید برزنیف نے تقریر کرتے ہوئے عوام کو آزادیٰ فکر کی نوید سنائی۔ ان کے فرامین کی بڑی تہنیر کی گئی۔ انہوں نے کہا :

”روس میں مطلق العنانی ختم کر کے صحیح معنوں میں عوامی حکومت کو فروغ دیا جائے“

صدر کے اس فقرے نے ان لوگوں کو بہت حوصلہ دیا۔ کارخانے میں میرے ساتھی



بڑی خوشی کا اظہار کرتے اور کہتے تھے کہ اب ہم بر ملا کلمہ حق کہہ سکیں گے اور ہماری گردنوں سے غلامی کا طوق نکل جائے گا۔ ان ہی دنوں قفقاز کے اس کارخانے میں جہاں ہم کام کرتے تھے، جشن انقلاب منایا گیا۔ اس جشن کے موقع پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے لوگوں کی ساری خوش فہمی کا فور ہو گئی۔

اجتماع کا آغاز برزنیف کے اعلان پر عمل درآمد کے عزم کے اظہار سے ہوا۔ کارخانے میں پارٹی کے سیکرٹری نے پولٹ بیورو کے فیصلوں اور برزنیف کے اعلان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ آج کے بعد کسی کو سن مانی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ ہر شخص کو آزادانہ حق رائے دہی حاصل ہوگا۔ ہر ادارے کے عام کارکنوں اور کارگیروں کو بھی یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے کارخانے کے افسر اعلیٰ پر تنقید کریں اور ان کی خامیوں کی نشاندہی کریں۔

پارٹی کے سیکرٹری کی بات ختم ہوئی تو ایک نوجوان کارکن کھڑا ہو گیا اور اس نے کارخانے کے چیف انجینئر پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ کارکن کا کہنا تھا کہ مذکورہ افسر اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، غریب کارکن عورتوں کو جبراً نشانہ ہوس بناتا ہے۔ جو عورتیں اس کے کہنے پر نہیں چلتیں انہیں شرمناک سزائیں دیتا ہے۔ بعض منظور نظر لوگوں کو مفت تنخواہیں دیتا اور محنتی کارکنوں کو ذلیل کرتا ہے۔ کارخانے کا کوئی مزدور اس سے خوش نہیں ہے۔

کارخانے کے مزدوروں نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور کارکن کی باتوں کے حق میں نعرے بلند کیے۔

یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ چیف انجینئر سے کوئی کارکن خوش نہیں ہے۔ وہ غریب خاتون مزدوروں پر دست درازی کرنے کے علاوہ مزدوروں کی بیویوں کو بھی پریشان کرتا تھا۔ اسی نوعیت کا ایک شرمناک واقعہ میرے ذاتی علم میں آچکا تھا۔



واقعہ یوں تھا ایک روز رات گئے کارخانے سے ہاسٹل واپس جاتے ہوئے میرے چند پڑوسی کارکن بھی ساتھ تھے۔ ہاسٹل کے قریب رہنے والا ایک مزدور مجھ سے خاصا بے تکلف تھا۔ جب ہم اس کے گھر کے پاس پہنچے، تو اس نے مجھے چائے کی دعوت دی۔ اس کے اصرار پر میں اس کے ہاں چلا گیا۔ مجھے نشست گاہ میں بٹھا کر وہ گھر کے اندر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پریشانی کے عالم میں باہر آیا۔ کہنے لگا کہ اس کی بیوی گھر میں نہیں ہے۔ وہ کبھی رات کے وقت گھر سے باہر نہیں جاتی۔ نہ جانے کہاں چلے گئی۔ خاصی دیر انتظار کے بعد بھی نہ آئی تو ہم دونوں باہر نکلے۔ میں اسے پریشانی کے عالم میں تنہا نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک دو دروازوں پر دستک دی۔ اس کے بعد وہ مجھے چھوڑنے ہاسٹل جانے لگا۔ ابھی ہم تھوڑی دُور گئے تھے کہ وہ خاتون ایک جانب سے آتی دکھائی دی۔ میرے ہمراہی کا غصے سے برا حال تھا۔ میری موجودگی کا خیال کیے بغیر کہنے لگا: ”تم کہاں مر گئی تھیں؟“

اس کی بیوی نے جھنجلاہٹ اور غصے کے لہجے میں جواب دیا: ”شام کے وقت تمہارا چیف انجینئر بلا کر ساتھ لے گیا تھا۔ اب چھوڑا ہے۔“

بیوی کی یہ حالت دیکھ کر خاوند زمین میں گر پڑا جاتا تھا۔ ناچار میں نے اس سے اجازت لے کر ہاسٹل کی راہ لی۔

اُس روز اجتماع میں چیف انجینئر کے خلاف اٹھنے والی آواز ہم سب کے دلوں کی آواز تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ چیف انجینئر کو سزا ملے گی تو تمام مزدوروں کی اشک شونی ہوگی، مگر کچھ نہ ہوا اور جو ہوا اس نے برزنیف کے نعرہ آزادی کی قلمی کھول کر رکھ دی۔ جیسے ہی مزدور چیف انجینئر کے خلاف الزامات عائد کر کے بیٹھا۔ کارخانے کا مینجنگ ڈائرکٹر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کارخانے کے چیف انجینئر کا دفاع کرتے ہوئے کہا: ”وہ کیونرم کا ہیرو ہے۔“



کارخانے کے سربراہ کی زبان سے اس فقرے کے ادا ہوتے ہی سینکڑوں مزدوروں کی تہی ہوئی گردنیں ڈھیلی پڑ گئیں اور جس کارکن نے ”آزادی اظہار“ کا حق استعمال کیا تھا وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

مینجنگ ڈائرکٹر صاحب نے سلسلہ کلام یوں آگے بڑھایا: کارکنوں کو آزادی دینے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیں بدنام کرتے پھریں۔۔۔۔۔ جو شخص ادارے کے باعزت افسروں کی بے عزتی کرنے کی کوشش کرے گا اسے کڑی سزا کے لیے تیار رہنا چاہیے! یہ سنتے ہی غریب مزدور روتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور عاجزی سے معافی مانگتے ہوئے کہنے لگا: ”میرا مطلب اپنے افسرِ اعلیٰ کی بے عزتی کرنا نہ تھا“

کارخانے کے سربراہ نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا: ”آزادی کا یہ مفہوم نہیں کہ جس کے جی میں جو آئے کر سکتا ہے۔ کامریڈ برزنیف نے جس آزادی کا وعدہ کیا ہے وہ بے لگام اور بے مہار آزادی نہیں۔ ان کا مطلب تو یہ تھا کہ مزدور کارخانے اور کلخوز کی پیداوار بڑھانے کے لیے آزادی سے اپنی تجاویز پیش کریں، تعمیری تجاویز نہ کہ تخریبی“

اس مزدور کا کیا حشر ہوا کچھ معلوم نہ ہو سکا، تاہم اس روز کے بعد کسی نے اسے کارخانے میں نہ دیکھا۔

### کارخانے کی رہائشی کالونی

میڈنا گورسک کے اس کارخانے کی اپنی رہائشی کالونی تھی۔ جہاں کارخانے کے اعلیٰ افسران اور مزدور ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔ یہ ایک الگ بات کہ افسروں اور مزدوروں کی رہائش گاہوں میں ناقابل یقین فرق تھا۔ افسروں کو شہزادوں جیسے عیش و عشرت کے سامان میسر تھے جب کہ مزدوروں کو قوتِ لاموت بھی بمشکل دستیاب۔ مزدوروں



میں ایسے لوگوں کی اکثریت تھی جن کو صرف ساٹھ روپل ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جبکہ اعلیٰ افسروں کی تنخواہ ہزاروں میں تھی۔ مجھے اندازہ ہے کہ ساٹھ روپل (تقریباً سات سو پاکستانی روپے) میں وقت گزارنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ہمیں نوے روپل ماہانہ ملنے تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے لیے کمائی کے دوسرے ذرائع بھی تھے۔ مثلاً ہم عملی کام کے دوران میں مزید رقم کمالیتے تھے۔ ہمیں چھٹی گزارنے کے لیے تفریحی مقامات پر قیام و طعام کی مفت سہولتیں حاصل تھیں۔ غیر ملکی طلبہ کو "پراپیلیکور" کی مہمانی کا لطف اٹھانے کا موقع بھی ملتا تھا۔

روس میں مزدور انجمنوں کا یہ طریق کار ہے کہ وہ مزدوروں سے ایک مخصوص رقم چندے میں لے لیتی ہیں۔ اس رقم سے مزدوروں کی بھلائی اور بہبود کے کام کیے جاتے ہیں۔ بہبود کے ان کاموں میں غیر ملکی طلبہ کی مفت مہمان نوازی بھی شامل ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اتنی سہولتیں اور معاشی سہولتیں حاصل ہونے کے باوجود ہمارے دن عسرت میں گزرتے تھے۔ ان غریب مزدوروں پر کیا گزرتی ہوگی جنہیں بسا اوقات ساٹھ روپل میں پورے کنبے کا پیٹ پالنا ہوتا تھا۔

کارخانے کی رہائشی کالونی میں ہیلتھ سنٹر، لائبریری اور کھیل کے میدان کے علاوہ بچوں کی عمدہ نرسری بھی تھی۔ میرے لیے یہ نرسری بڑی پرکشش جگہ تھی۔ اس جگہ معصوم بچوں کے کھیل کود کا سامان اور ان کی پسند کی تمام چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ یہاں زیادہ تر ان بچوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے جن کے ماں باپ دونوں کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ ماٹرن علی الصبح اپنے بچوں کو باغ اطفال (نرسری) میں چھوڑ جاتی ہیں اور شام کو کام سے لوٹتے ہوئے ساتھ لے جاتی ہیں۔ اس کے بدلے میں نرسری برائے نام سامعہ صنفہ وصول کرتی ہے۔ بڑے شہروں میں ایسی نرسیاں زیادہ تعداد میں ہیں اور وہاں بچوں کی دیکھ بھال زیادہ منظم طریقے سے ہوتی ہے۔ سرکاری بس بچوں کو نرسری لے جاتی اور گھر



چھوڑ جاتی ہے۔ خصوصی حالات میں بچوں کے نرسری میں مستقل قیام کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔

## عائلی زندگی کے مسائل

روس میں ہر شخص صرف ایک قانونی بیوی کا شوہر ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تعلق اور دوستی پر کوئی پابندی نہیں۔ مرد ہی نہیں عورت بھی ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہے۔ شوہر اپنی بیوی پر یہ پابندی عائد نہیں کر سکتا کہ وہ اس کی وفادار رہے اور اس کے گھر میں مرد دوستوں سے نہ ملے یا دوسروں کے گھروں میں راتیں نہ گزارے، لیکن اس کے باوجود عورتوں کی اکثریت اپنے شوہروں کی وفادار ہے۔ کمیونسٹ اس صورت حال کو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے ان کے خیال میں انقلاب اس وقت مکمل ہو گا جب مرد پر کسی ایک عورت اور عورت پر کسی ایک مرد کا ٹھپہ باقی نہ رہے گا۔ لیکن ابھی تک وہ کمیونزم صرف کتابوں اور نعروں تک محدود ہے۔

روسی معاشرے میں ماں باپ، بہن بھائی، چچا چچی اور خالہ خالو جیسے رشتے ختم نہیں ہوئے۔ جنسی آزادی سے عائلی زندگی متاثر ضرور ہوئی ہے اور بہت سے ایسے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں روسی معاشرے کا حصہ بنے ہیں جو باپ کے بجائے ماں کا نام جانتے ہیں۔ اس کے باوصف عوام کی اکثریت اپنے خاندان سے وابستہ اور ماں باپ سے متعلق ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ بے وفا شوہر اپنے لیے وفادار اور پاکدامن بیویوں کے خواہاں ہوتے ہیں، چنانچہ شوہر دیدہ یا جہان دیدہ عورت کو آسانی سے اچھا شوہر نہیں مانتا، جبکہ شریف اور کنواری لڑکیوں کے کئی کئی امیدوار ہوتے ہیں۔ اکثر طلاق یافتہ عورتیں شوہر کی تلاش خود کرتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ دوسرے شہروں اور دیہات



کارِ مخ کرتی ہیں۔ جہاں لوگ ان کے ماضی سے زیادہ آگاہ نہیں ہوتے۔ اس طرح دھوکہ دہی کا سلسلہ چل نکلا ہے۔

روس کی خاندانی زندگی کو مادہ پرستانہ حالات نے بہت متاثر کیا ہے۔ گھر کے مرد اور عورتیں الگ الگ ملازمتیں کرتے اور پیسے کماتے ہیں۔ اس لیے ہر ایک کو اپنی کمائی کے پیسے خرچ کرنے کا اختیار ہے۔ گھر کے اجتماعی اخراجات میں ہر فرد اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ عام طور پر شام کے وقت سب لوگ مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا اور صبح کا ناشتہ ہوٹلوں اور کارخانوں میں کیا جاتا ہے۔ گھر کا ہر فرد خالص مادہ پرستانہ سوچ رکھتا ہے۔ ایک ایک روپے کا حساب لیا جاتا ہے۔ بیٹا باپ کو ضرورت کے وقت بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔ گھر کے بوڑھے افراد بڑی کس سپرسی کی زندگی گزارتے ہیں۔ خاندان کے افراد کے پاس ان کیلئے وقت نہیں بچتا اور وہ ضعیفی اور بیماری سے لاچار تنہائی کے شب و روز گزارتے ہوئے کھوں کھوں کرتے مر جاتے ہیں۔

## کام چوری

روس میں انسانی صلاحیت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے انعامات کا طریقہ رائج ہے۔ ہر شعبے میں چاہے وہ صنعتی ہو، زرعی ہو یا علمی، کام کا ایک مخصوص ہدف یا پیداوار کی ایک مقررہ مقدار کامیابی سے پورا کرنے یا اس سے بڑھ جانے والا انعام کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ محنت اور کام کی رغبت دلانے کے لیے یہ حکومت کی نہایت مؤثر پالیسی ہے لیکن اس کے باوجود لوگ محنت سے جی چراتے ہیں۔ قفقاز کے جس کارخانے میں مجھے کام کرنے کا موقع ملا، میں نے ایسے لوگوں کی اکثریت دیکھی جو روزانہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی کے دوران بمشکل ایک آدھ گھنٹہ کام کرتے تھے۔ باقی وقت حیلوں بہانوں میں ٹال دیتے تھے۔



محنت کا فقدان۔ سب سے زیادہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پایا جاتا ہے۔ طلبہ کو پڑھانے کے لیے تمام وسائل بہم کیے گئے ہیں۔ تعلیم لازمی ہے۔ درس گاہوں میں وظائف دیے جاتے ہیں، لیکن طلبہ سکولوں اور کالجوں میں وقت گزاری کے لیے آتے ہیں۔ اکثریت ان طلبہ کی ہے جو کتاب کو چھوڑتے بھی نہیں۔ صرف ان اساتذہ کی کلاسوں میں جاتے ہیں جن سے سزا ملنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

امتحان کے دنوں میں تعلیمی اداروں کی عجیب حالت ہوتی ہے۔ ہر طالب علم نقل کا مواد تیار کرنے میں لگا ہوتا ہے۔ بعض "بار سوخ" قسم کے طلبہ امتحان سے پہلے ہی پرچے کے سوالات حاصل کر کے ان کے جوابات کھوا لیتے ہیں۔ رہی سہی کسر کمرہ امتحان میں پوری ہو جاتی ہے۔ اساتذہ عام طور پر نقل کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تاکہ ان کی کارکردگی پر حرف نہ آئے۔ اس کا جواز وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ جب دوسرے طلبہ نقل کے ذریعے سو فیصد نمبر حاصل کرتے ہیں تو ان کے شاگرد کیوں پیچھے رہیں!

غیر ملکی طلبہ بھی روسی ساتھیوں کے نقل کے فن سے استفادہ کرتے ہیں، لیکن ان میں پڑھنے والوں کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔ ہاسٹل میں جب روسی طلبہ مجھے پڑھتے دیکھتے تو مذاق کرتے تھے۔ بعض میری حالت پر رحم کھاتے ہوئے کہتے: "یہ کیا دردِ سر ہے۔ نقل کی تیاری کرو۔ نقل کے بغیر اچھے نمبر کبھی نہ ملیں گے۔"

### روس میں سیاسی قیدی نہیں ہوتے

سوویت یونین میں حکومت سے اختلاف کا تصور موجود نہیں ہے۔ سیاسی اختلافات کے بجائے پورا معاشرہ سرکاری پالیسیوں کی حمایت کرتا ہے۔ اس لیے کہ جن لوگوں نے ماضی میں حکومت سے اختلاف کی جسارت کی ان کا عبرت ناک انجام لوگوں کے سامنے ہے۔ عدالتوں اور پولیس سٹیشنوں پر زیادہ تر مقدمات اور جھگڑے چوری، دھوکہ دہی



وغیرہ کے ہوتے ہیں یا پھر عائلی جھگڑے اور شرابیوں کے ہمسایوں کو ستانے کے سائل جیلوں میں بھی زیادہ تعداد اخلاقی جرائم کے مرتکبین کی ہوتی ہے۔ سیاسی قیدی اول تو ہوتے نہیں، جو ہوتے ہیں انہیں جیلوں میں نہیں بھیجا جاتا۔ ان کے لیے کم سے کم سزا یہ ہے کہ زندگی کے باقی ایام سائبیریا میں یورینیم کی کانیں کھودتے گزار دیں۔

انقلاب روس کے بعد حکومت سے اختلاف کرنے والی ایک نسل ختم ہو چکی ہے۔ نئی نسل نے مفاہمت کے ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ یہ حد درجہ قناعت پسند لوگ ہیں۔ زیادہ پلنے کی ہوس نہیں رکھتے اس لیے کہ اس میں مال و جان کا خطرہ ہے اور جس بات میں جان کا خطرہ ہو روسی اس کے قریب کبھی نہیں جاتے۔ شاید یہ بات قارئین کے لیے عجیب ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ روسی نوجوانوں کی اکثریت بڑے عہدوں سے بھاگتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اونچے مناصب پر پہنچنا تو آسان ہے، لیکن بہت سے لوگ اونچی کرسیوں پر سرگنوا بیٹھتے ہیں۔

### مسلمان ڈاکٹر کی حسرت

قفقاز سے رخصت ہونے سے پہلے ایک بار پھر میں سیلنی ٹوریم کے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ مجھ پر ان کی مہربانی کا شکریہ واجب تھا۔ وہ بڑی شفقت سے ملے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ میں جاتے ہوئے قرآن پاک کا نسخہ انہیں دے جاؤں تو وہ ممنون ہوں گے۔ میں نے بتایا کہ میرے پاس ایک ہی نسخہ ہے اور میں پابندی سے تلاوت کرتا ہوں۔ یہ سن کر انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں چند قرآنی آیات ہی کچھ کر دے دوں۔ یہ بات میں نے بخوشی مان لی۔

یہ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ روس سے نکل کر کسی اسلامی ملک میں جا بسیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے، کیا ایسا ممکن ہے؟ تو میں نے اس ضمن میں روسی حکومت کی جانب سے



پیش آنے والی ممکنہ مشکلات انہیں بتائیں۔ کہنے لگے :  
 ”مکئی بار سوچتا ہوں، ماسکو جا کر کسی اسلامی ملک کے سفارت خانے میں سیاسی  
 پناہ طلب کروں یا کوئی مسلمان سربراہ ماسکو آئے تو اس سے درخواست کروں کہ وہ  
 مجھے ہمراہ لے جائے۔“  
 مجھے ڈاکٹر صاحب کا منصوبہ کمزور ہی لگتا تھا، مگر وہ اپنی بات پر بضد تھے۔  
 میں ان کی کامیابی کے لیے دعا ہی کر سکتا تھا۔

تفقاز میں بہت سے ایسے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی جو روس سے بھاگنے  
 کی تدبیریں کر رہے تھے۔ کچھ آرمینی باشندے تھے جو مکئی بار خضیہ طور پر پکینیڈا یا برطانوی  
 سفارت خانے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش بھی کر چکے تھے۔ ایک صاحب نے بتایا  
 کہ وہ کئی بار امریکی سفارت خانے میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کی کوشش کر چکے ہیں  
 لیکن روس میں کسی عام آدمی کے لیے غیر ملکی سفارت کاروں سے میل جول پر سخت پابندی  
 عائد ہے۔ وہ ہر بار ناکام ہو جاتے تھے۔ عام آدمی تو کجا کسی اخبار نویس کو بھی سرکاری  
 اجازت حاصل کیے بغیر غیر ملکی سفارت خانوں کے عملے کے کسی فرد سے ملنے نہیں دیا  
 جاتا۔

روس میں ایک فقہ زربان زرد عام و خاص ہے : ”روس سے نکل بھاگو۔ باقی ہر  
 جگہ خیریت ہے۔“

ثقافتی و فوجدور دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو واپس آنے سے انکار کر دیتے  
 ہیں۔ کئی بار تو بڑے بڑے مناصب پر فائز افسر اور دانشور غیر ملک میں منعقد ہونے  
 والی کانفرنسوں میں شریک ہونے کے لیے باہر گئے اور واپس نہ آئے۔ روس کے  
 بیرونی سفارت خانوں کے لوگوں کا فرار تو آئے دن کا معمول ہے۔ بہت سے کھلاڑی  
 کھیلوں کے مقابلے میں حصہ لینے باہر جاتے ہیں اور وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔



حالانکہ روس میں کھلاڑیوں کو بڑی مراعات حاصل ہیں۔  
 غیر ملکی سیاحوں اور طلبہ سے رشتہ آشنائی استوار کرنے والی عورتیں سب  
 سے پہلا مطالبہ یہ کرتی ہیں کہ وہ انہیں شادی کر کے ساتھ لے جائیں۔ بعض اوقات  
 تو بس سٹاپ پر چند منٹ کی ملاقات میں ہی اظہارِ مدعا کر دیا جاتا ہے۔

---



## نواں باب

### قفقاز کے انفرادیت پسند

قفقاز میں اپنا کام نمٹالینے کے بعد مجھے دوبارہ اڈیسہ جانے اور وہاں ایک ماہ کی تفریحی رخصت گزارنے کی اجازت مل گئی۔ ریل گاڑی قفقاز کی وادیوں سے شمال مغرب کی طرف بڑھنے لگی، تو جنگلات سے ڈھکے ہوئے پہاڑ اور سبزہ زار نگاہوں کو لبھانے لگے۔ قفقاز کا کوہستانی علاقہ بے حد خوبصورت ہے۔ جنگلی پھولوں پھلوں اور جڑی بوٹیوں کی بہتات ہے۔ ان پہاڑوں میں ایک خاص قسم کا اخروٹ ہوتا ہے جو روس بھر میں مشہور ہے۔ پہاڑوں میں بسنے والے لوگ اخروٹ اکٹھے کر کے خاصی رقم کماتے ہیں۔ پہاڑوں کی مڑوب ڈھلانوں پر کھمبی بھی بڑی مقدار میں پیدا ہوتی ہے۔ بازار میں اس کے منہ مانگے دام ملتے ہیں۔

مقامی لوگ جنگل سے سوختنی اور عمارتی لکڑی بھی کاٹتے ہیں جس کا حکومت کو ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

قفقاز کے دیہات میں لوگ زیادہ تر اپنے مکانات بنا کر رہتے ہیں۔ سرکاری عمارتوں میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ زمین حکومت سے قیمتاً مل جاتی ہے۔ لوگ انفرادیت پسند ہیں۔ حکومت کی ترغیبات انہیں پسند نہیں آتیں۔



ریل گاڑی میں تین فقہازی مسلمان میرے ہم سفر تھے۔ تینوں بے حد خلیق اور مخلص۔ مجھے مسلمانوں کے حالات معلوم کرنے کا نادر موقع ہاتھ آیا۔ ان سے بہت سی مفید باتیں معلوم ہوئیں۔ انہوں نے بتایا کہ فقہاز میں ایک منظم اسلامی تحریک قائم ہو چکی ہے اور کامیابی سے چل رہی ہے اسے ختم کرنے کے لیے روسی حکومت نے کئی حربے استعمال کیے ہیں، لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔ لوگوں کو اسلامی تحریک کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دینے کے لیے علاقائی زبانوں میں کئی پروگرام شروع کیے ہیں۔ حکومت ان پروگراموں کی مقبولیت کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان پروگراموں کو عوام کم ہی سنتے ہیں۔ دوسرے ذرائع ابلاغ سے بھی رجعت پسندوں کی تحریک کو ختم کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ لوگوں پر طرح طرح سے دباؤ ڈالا جاتا ہے، لیکن سرکاری مخالفت عوام کی آتش شوق کو مزید ہوا دے رہی ہے۔

میں نے اپنے ہم سفروں سے فقہاز میں کیونسٹ پارٹی کی قوت کا حال پوچھا تو انہوں نے کہا: ”کیونسٹ پارٹی کا وجود صرف سرکاری اعداد و شمار میں ہے۔ فقہاز کے مسلمان صرف اسلام کو جانتے ہیں“ انہوں نے کہا: ”ہم قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں آزاد اور خود مختار زندگی گزارنا چاہتے ہیں“

ان کی باتوں میں جذبے کی صداقت اور عزم کی گھلاوٹ صاف معلوم ہوتی تھی۔ انہوں نے مزید کہا: ”یہ تین افراد کی نہیں فقہاز کے لاکھوں مسلمانوں کی آواز ہے۔ آپ کو یہاں بچہ بچہ یہ بتائے گا کہ وہ صرف اسلام چاہتے ہیں“

دوسرے روز ہم رستوف پہنچ گئے۔ مجھے اڑیسہ جانے کے لیے گاڑی کا انتظار تھا اور دوسری صبح تک کوئی گاڑی جانے والی نہ تھی۔ اس لیے مجھے رستوف کی سیاحت کا اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ دریائے ڈان کے دائیں کنارے آباد رستوف ایک خوبصورت شہر ہے۔ شمالی فقہاز کا سب سے بڑا شہر ہونے کی بنا پر رستوف کو اہم مقام حاصل



ہے۔ مجھے لوگوں نے بتایا کہ اسے قفقاز کا دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا صنعتی اور زرعی مرکز ہے۔ بنیادی صنعتوں اور زرعی مشینوں کے کئی کارخانے یہاں موجود ہیں۔ اسی طرح جوتوں، آلات موسیقی، صابن ادویات اور سگریٹ وغیرہ کے متعدد کارخانے بھی ہیں۔

دریائے ڈان کا بے مثال حسن سیاحوں کو مسحور کر دیتا ہے۔ شاعروں نے اس دریا کے حسن اور اس کے پرسکون پانیوں پر تیرنے والے بحروں پر سینکڑوں نظمیں لکھی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم نے رستوف کے صنعتی وجود کو مٹا کر رکھ دیا تھا۔ تمام بڑی بڑی عمارتیں مکمل تباہی کے بعد دوبارہ تعمیر کی گئی ہیں۔

شہر میں گھومتے پھرتے ہوئے ایک افغان طالب علم مل گیا۔ اس نے بتایا کہ رستوف میں بہت سے افغان لڑکے زیر تعلیم ہیں۔

اگلی صبح اڈیسہ جانے والی گاڑی مل گئی۔ قفقاز سے ساتھ آنے والے مسلمان بھائیوں نے بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا۔ وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں رستوف آئے تھے۔

اڈیسہ پہنچا تو بڑی آسانی سے قیام گاہ میں جگہ مل گئی۔ اس شہر کا ماحول میرے لیے اجنبی نہ تھا۔ گزشتہ برس بھی میں یہاں قیام کر چکا تھا۔ قیام گاہ اگرچہ مختلف تھی، لیکن شب و روز وہی تھے۔ اس مرتبہ یہاں تفریحی چھٹی گزارنے کے لیے ہماری یونیورسٹی سے لڑکوں کا ایک گروپ آیا تھا۔ ان میں ایک افغان طالب علم بھی تھا۔

## جاپانی سیاح

اڈیسہ آئے ہوئے چند ہی روز گزرے تھے کہ کچھ جاپانی سیاح آ گئے۔ شہر میں ان کا گھومنا پھرنا غیر معمولی واقعہ سمجھا گیا۔ میں ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ انہیں دیکھ



لیا۔ ان کے جلو میں بیسیوں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی چل رہے تھے۔ وہ جس کان پر رکتے۔ وہاں گاہکوں کی بھیڑ ہو جاتی، وہ جس چیز کو چھوتے سب اسے ہاتھ لگانے کے آرزو مند ہوتے۔ میرے لیے یہ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔

دوسرے روز ہم سمندر کے کنارے گئے تو وہاں کئی روسی نوجوانوں کو جاپانیوں کا ذکر کرتے پایا۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے کہتے تھے: ”کیسی خوش قسمت ہے یہ جاپانی قوم صنعت و حرفت میں سب سے آگے یہ ہیں۔ دولت ان کے پاس ہے۔ کیسی آزادی سے شہر شہر گھوم رہے ہیں!“

ایک روسی لڑکا کہنے لگا: ”یہ بھی تو دیکھو انگریزی اور روسی زبان بھی جانتے ہیں۔ فریج بھی انہیں آتی ہے۔“

### ایمان کی آزمائش

میری اقامت گاہ کے قریب عراق کا ایک طالب علم فروکش تھا۔ وہ پی ایچ ڈی کرنے روس آیا تھا۔ ہم روزانہ ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ایک روز مجھے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے لے گیا۔ راستے میں اس کے ساتھ جو گفتگو ہوئی اس سے پتہ چلا کہ وہ مسلمان تو ہے لیکن ترقی پسند کہلانا زیادہ پسند کرتا ہے۔ چلتے چلتے وہ ایک جنرل سٹور پر کچھ دیر کے لیے رکا۔ مجھے کچھ بتائے بغیر چند چیزیں خریدیں۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا: ”شراب اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں خریدی ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں مسلمان کی بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہر قسم کے مشروبات سے اجتناب کرتا ہوں تو کہنے لگا: ”تم مست پلینا۔“

میں نے پوچھا: ”گھومتے پھرتے ہوئے شراب ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت

ہے؟“ اس نے کہا: ”نہیں ہم کسی جگہ بیٹھیں گے، گپ شپ ہوگی۔ تم کھانا میں پیو گے۔“



ہم تھوڑی دور چلے کہ میرے عراقی دوست کا سارا پردہ گرام میری سمجھ میں آگیا۔ وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے ایک پارک کے قریب پہنچا تو دور و روسی لڑکیاں مسکراتی ہوئی اچانک ہماری طرف بڑھیں۔ پہلے تو میں اسے معمول کی بات سمجھا لیکن جب ان میں سے ایک نے عراقی طالب علم کا ہاتھ تھام لیا اور دوسری نے اپنا ہاتھ میری بغل میں چبھوایا تو سب کچھ میری سمجھ میں آگیا۔ میں نے قدرے "غیر سوشل" رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے لڑکی کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ میرے ساتھی نے مجھے "مہذب" بننے کا اشارہ کیا۔

لڑکی نے مجھے شرمندہ کرتے ہوئے کہا: "کیا تمہارے ہاں خواتین سے ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے؟"

میں نے عالم غضب میں خاصی طویل تقریر کی جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا: "ہمارے ہاں پرانی لڑکیاں تو کجا اپنی بیوی تک یہ جسارت نہیں کر سکتی کہ یوں سر عام اپنے شوہر کا ہاتھ تھام سکے۔"

لڑکی بڑے حوصلے والی تھی۔ میری باتوں کا برا مانے بغیر کہنے لگی: "جمہوریہ روس میں اتنا عرصہ گزار کر بھی تم نے کچھ نہ سیکھا؟"

میں نے کہا: "میں انجینئر بننے کے لیے آیا ہوں اور اپنے پیشے میں مہارت حاصل کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔"

اس پر وہ فتنہ گر ایمان ایک خاص ادا سے سنسی اور بولی: "اچھا چپ ہو جاؤ۔ ان دونوں کو دیکھو اور کچھ شرم کرو۔"

چند قدم چلنے کے بعد میرے ہمراہی ایک چھوٹے سے چمن کے دروازے پر پہنچے اور پھر مجھے ساتھ لیے ہوئے اس میں داخل ہو گئے۔ کسی امیر آدمی کے گھر کا پائیں باغ معلوم ہوتا تھا۔ وہ تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے اور شغلِ مے خواری کرنے لگے۔ مجھے نجات کی ایک صورت نظر آئی۔ نمازِ مغرب کا وقت تھا۔ فوارے کے پانی



سے وضو کیا اور گھاس کے لان پر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

نماز سے فارغ ہوا تو میرے عراقی دوست نے میرے قریب آکر مجھے عربی میں مخاطب کیا: ”مادعوکَ هنا لانَ تصلّی (تمہیں نماز پڑھنے کے لیے تو دعوت نہ دی گئی تھی؟)“

میں نے ترکی بہ ترکی کہا: ”صلیتُ لأخالف اشغالکم (میں نماز کے ذریعے تمہارے مشغلے کی نفی کرتا ہوں)“

میری یہ بات سن کر وہ مجھ سے مایوس ہو گئے۔ میں وہاں سے اٹھ کر باغ کے خوبصورت منظر میں کھو گیا اور وہ پھر شغلِ مے خواری کرنے لگے۔ اب صاف نظر آرہا تھا کہ میری ضرورت باقی نہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دلچسپی کا ارادہ کیا اور اپنے دوست سے اجازت مانگنے گیا تو وہ لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر سوچکے تھے۔ اتنی شراب پی لی تھی کہ ان کے قدم لٹکھڑا رہے تھے۔ دونوں لڑکیاں عراقی طالب علم کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھیں وہ دونوں سے شادی کے وعدے کر رہا تھا۔

جولوڑکی کچھ دیر پہلے مجھ پر ہفت تھی اس نے مجھے دیکھا تو کہنے لگی: ”میں عراق جاؤں گی۔ وہاں میری اپنی کار ہوگی اور عیش و عشرت کا وافر سامان ہوگا“ دوسری نے یہ بات سنی تو اسے گھورتے ہوئے کہنے لگی: ”پھڑیل بکواس مت کرو! وہ تو مجھ سے شادی کر رہا ہے“

پہلی نے اسے گالی دیتے ہوئے کہا: ”تمہیں تو وہ بے وقوف بنا رہا ہے۔ شادی تو مجھ سے کرے گا“

عراقی طالب علم باری باری دونوں کے کانوں میں سرگوشی کرتا اور وہ نہال ہوئی جاتیں۔



شراب کا نشہ آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ ایک مقام تو ایسا آتا ہے جہاں انسانی عظمت اور شرف کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔ میرے لیے اس منظر میں کراہت کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے اس آلائش سے محفوظ رکھا یہ شاید نماز کی برکت تھی۔

”بے شک نماز برائی اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے“

### ظاہر پر مر مٹنے والا نوجوان

اڈیسہ کے قیام کے دوران میں میرے ایک افغان بھائی کے ساتھ بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا۔ اس کا نام ظاہر تھا۔ وہ باکو کے کسی کالج سے تفریحی چھٹی گزارنے یہاں آیا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے ایک دوسرے افغان طالب علم کے ہمراہ رات کے کھانے کی دعوت دی۔ ہم اس کے کمرے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میز پر حلال ماکولات کے ساتھ حرام مشروبات بھی وافر مقدار میں موجود ہیں اور ساتھ ہی ایک ادھیر عمر خاتون غازے سرخی میں لتھری ہوئی بیٹھی ہیں۔ اس نے شوخ چمکیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے اپنی سابقہ شادی کا جوڑا پہن رکھا ہو۔

ہمیں شراب سے مجتنب دیکھ کر ظاہر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ میں جام اٹھا کر خالص کامریڈ سٹائل میں اسے لہرایا اور بولا: ”یہ روس ہے یہاں شراب پینے والے کو کوئی کافر نہیں کہتا۔ آؤ کہ ہم اپنی سابقہ کوتاہیوں اور محرومیوں کا مداوا کریں؟“ پھر اپنی خاتون مہمان کا تعارف کرتے ہوئے کہا:

”ان سے ملو، یہ لود میللا ہیں۔ میں عنقریب ان سے شادی کر رہا ہوں“

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لود میللا کی عمر ظاہر سے دگنی تھی۔ میرے ساتھ نے مجھے پشتوں میں مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”یہ بوڑھی عورت میک اپ



کر کے ظاہر کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ آؤ اس کو اس کے جال سے نکالیں۔  
میں نے ہامی بھرنی۔ ہم نے ظاہر سے گفتگو شروع کر دی۔ تفصیل سے اس کے  
بارے میں معلومات جمع کر لیں۔ جب اس نے بتایا کہ اسے روس میں آئے ہوئے تھوڑی ہی  
عرصہ گزرا ہے اور وہ باکو کے کسی کالج میں زیر تعلیم ہے تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ چونکہ وہاں  
زیادہ تر مسلمان رہتے ہیں اور عورتیں اس طرح گلیوں میں گھوم پھر کر شکار تلاش نہیں کرتیں  
اس لیے وہ اڈیسہ پہنچتے ہی "شکار" ہو گیا۔

میرے ساتھی نے ظاہر کے کان میں کہا: "ابھی اس عورت کے بارے میں کوئی  
فیصلہ نہ کرنا۔ دن کی روشنی میں دیکھ لینا تاکہ تمہیں بعد میں پشیمانی نہ ہو۔"  
اس پر ہماری باتوں کا زیادہ اثر نہ ہوا۔ ہمیں خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں راتوں  
رات وہ دونوں شادی کے بندھن میں نہ بندھ جائیں۔ کوئی دوسری صورت نہ دیکھی تو ہم  
نے لودمیلا کو صورتِ حال سمجھائی اور کہا: "وہ یہاں سے چلی جائے ورنہ ہم پولیس کو  
بتا دیں گے کہ یہ عورت ایک غیر ملکی لڑکے کو دھوکا دے رہی ہے۔ یہ سن کر وہ فوراً ہی  
رفو چکر ہو گئی۔"

دوسرے روز ہم نے ظاہر کے ساتھ مل کر اس عورت کو ڈھونڈا تو وہ سڑک پر  
تربو ز بیچتی ہوئی مل گئی۔ ظاہر تو اس کی اصلیت پہچان کر حیران رہ گیا۔ بے چارہ سخت  
محبوب ہوا۔

ہمیں بعد میں کسی نے بتایا کہ لودمیلا اور اس قسم کی دوسری عورتیں یہاں کسی غیر  
ملکیوں سے شادیاں کر چکی ہیں۔ ان کے غیر ملکیوں سے بچے بھی ہوتے ہیں۔ شادی  
اس امید پر کرتی ہیں کہ شاید وہ روس سے نکل جائیں، لیکن ان کے غیر ملکی شوہر اکثر انہیں  
اپنے بچوں سمیت روس میں چھوڑ جاتے ہیں۔



## اساتذہ کی شفقت

یونیورسٹی میں ہمارے اساتذہ بڑے محنتی اور شفیق تھے۔ خصوصاً وہ سارے اساتذہ جنہوں نے میری رہنمائی کی بہت ہی اچھے تھے۔ وہ اپنے فن میں ماہر تھے اور اپنے شاگردوں کو اپنا فن منتقل کرنے کی ہر تدبیر کرتے تھے۔ اگرچہ یونیورسٹی میں اساتذہ ہفتے میں چار سے چھ گھنٹے تک پڑھاتے ہیں، لیکن ان کی پابندی وقت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ تدریس کے مقررہ اوقات کے علاوہ بھی وہ ہمارے سوالوں کے جواب بڑی فراخ دلی سے دیتے اور ہر ممکن تعاون فراہم کرتے تھے۔ ان کی باتوں میں علمیت اور ان کے انداز میں اخلاص ہوتا۔ ان کے خلوص نے مجھے احساس دلایا کہ اس کے اندر اچھے لوگوں کی کمی نہیں۔

## طلبہ تنظیمیں

کیونٹ پارٹی کی رکنیت حاصل کرنے سے پہلے طلبہ کو کسومول (نوجوان کیونٹ تنظیم) میں شمولیت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد کسومول کے اراکان کیونٹ پارٹی کے باقاعدہ رکن بن سکتے ہیں، البتہ اس کے لیے انہیں اپنے سابقہ اچھے چال چلن کا ریکارڈ پیش کرنا پڑتا ہے۔

کسومول کے امور کی نگرانی کسورگ کرتے ہیں۔ ہر کسورگ میں طلبہ نمائندوں کے علاوہ ایک استاد بھی ہوتا ہے۔ تمام طلبہ اس تنظیم کی مقامی کمیٹی کے ہفتہ وار اجتماعات میں شرکت کرتے ہیں اور کسورگ کو ایک رول ماہانہ چندہ دیتے ہیں۔ کمیٹی طلبہ کے امور پر غور کرتی اور انہیں مشورے دیتی ہے۔ کمیٹی کا کوئی رکن بیمار پڑ جائے تو کمیٹی کا فرض ہوتا ہے کہ اسے ہسپتال لے جائے اور اس کا علاج کرائے۔ کمیٹی کے اجتماعات میں



غیر ملکی طلبہ کو شریک ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔

کسومول کے اہم ارکان پرافسایوز (مزدور انجمن) کے رکن بھی ہوتے ہیں۔ یہ رکن اس تنظیم کے اجتماعات میں بھی شریک ہوتے اور اسے چندہ بھی دیتے ہیں۔ ایسے طلبہ کو دوسری سہولتوں کے علاوہ یہ حق بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ سال میں ایک مرتبہ پراپلیکٹور (سرکاری تفریحی استراحت گاہوں) میں مفت قیام کر سکیں۔

ہر روسی طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ پیشہ وارانہ تدریس کے ساتھ ساتھ کیونزوم کی نظریاتی تعلیم بھی مکمل کرے۔ اس ضمن میں کیونسٹ پارٹی کی تاریخ، مارکسزم کے لادینی نظریہ اور اشتراکی فلسفے کے امتحانات پاس کرنے پڑتے ہیں۔ غیر ملکی طلبہ کے لیے بھی بین الاقوامی کیونزوم کی تعلیم حاصل کرنا لازم ہے۔ اگر کوئی طالب علم یہ امتحان پاس نہ کر سکے تو اسے ماسٹر ڈگری کے لیے مقالہ لکھنے کی اجازت نہیں ملتی۔

ہم نے جو مضامین پانچ برس تک پڑھے۔ ان میں کیونسٹ پارٹی کی تاریخ، فلسفہ مارکس، سیاسی معاشیات، الحاد اور علمی کیونزوم شامل تھے۔ پانچویں برس کے اختتام پر ہمیں ایک "سرکاری امتحان" دینا پڑا جس میں سوشلزم سے ہماری واقفیت جانچی گئی۔ کیونزوم کے امتحان کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ کوئی طالب علم اس امتحان میں جتنے نمبر حاصل کرتا ہے، اپنی ماسٹر ڈگری میں اس سے زیادہ نمبر حاصل نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر اگر اس نے کیونزوم کے امتحان میں ساٹھ فیصد نمبر حاصل کیے ہیں تو اسے کسی صورت میں ڈگری کے امتحان میں ساٹھ فیصد سے زیادہ نمبر نہیں ملیں گے۔

### دوبارہ میڈنا گورسک

سرکاری امتحان سے فراغت کے بعد ہمیں ملی کام کے لیے بھیجا گیا۔ اس کے دوران ماسٹر ڈگری کا مقالہ لکھنے کے لیے مواد اکٹھا کرنا تھا۔ زیادہ تر مواد دستاویزی نوعیت



کا تھا۔ ہم جس کارخانے میں پہلے عملی کام کر چکے تھے، وہاں دوبارہ جانا ضروری تھا۔ چنانچہ میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ ایک مرتبہ پھر قفقاز کے شہر میڈناگورسک گیا۔

گزشتہ مرتبہ میڈناگورسک میں قیام کے دوران میں سینی ٹوریم کی ایک خاتون کارکن نے میری بڑی مدد کی تھی۔ میں نے رخصت ہوتے وقت اس کا شکریہ ادا کیا تو اس نے تعلق کو پائیدار کرنے کی خاطر مجھے تاکید کی، میں دوبارہ میڈناگورسک آؤں تو دنسک کے غیر ملکیوں کے لیے سٹور سے اس کی اکلوتی لڑکی کے لیے جاپانی چھتری اور کچھ کامیکس ضرور خرید کر لاؤں۔

دنسک میں اس خاتون کے ہفتہ وار خطوط آتے رہے۔ ان خطوط میں بیروزگار دگرکاری سٹور سے اشیاء کی خریداری کی یاد دہانی کے علاوہ بڑی لگاؤ کی باتیں ہوتی تھیں۔ یہ خاتون مجھے اپنا داماد بنانے پر بھی بخوشی آمادہ تھیں اور انہوں نے سکھا تھا کہ اگر میں اس پر راضی ہوں تو انہیں سکھوں، تاکہ میری واپسی پر وہ شادی کے انتظامات مکمل کر لیں۔ میں نے شادی سے تو معذرت کر دی تھی، لیکن یقین دلایا تھا کہ میں دوبارہ قفقاز آیا، تو ان کی لڑکی کے لیے مطلوبہ اشیاء ضرور خرید کر لاؤں گا۔

### جاپانی چھتری، سرمایہ افتخار

قفقاز جانے سے پہلے میں دنسک کے سٹور پر گیا۔ پندرہ ڈالر میں ایک چھتری اور کچھ دوسری اشیاء خریدنے کے بعد خاتون موصوفہ کو اپنی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے سکھا کہ میں ان کی چیزیں لے کر آ رہا ہوں۔ خاتون میرا خط لے کر سینی ٹوریم کے اسی مسلمان ڈاکٹر کے پاس چلی گئیں اور میرے پہنچنے سے پہلے ہی سینی ٹوریم میں میرے داخلے کا بندوبست کر دیا۔



میڈناگورسک ریلوے سٹیشن پر خاتون کے علاوہ ان کے کئی ملنے والے بھی میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔ چھتری اور دوسرا سامان دیکھ کر ان کا چہرہ مسرت سے کھل گیا۔ میڈناگورسک جیسے دور افتادہ شہر میں ایک جاپانی چھتری کا حصول اتنی آسان بات نہ تھی؛ چنانچہ جتنا عرصہ میں نے میڈناگورسک میں گزارا وہ چھتری خاتون کے ہاتھ میں رہی۔ لڑکی کا شاید بہانہ تھا۔ اپنے دوستوں کے علاوہ کئی بار انہوں نے مجھ سے فخر یہ لہجے میں کہا: ”یہ چھتریاں ماسکو کے بلند مرتبہ لوگوں کے پاس ہی ہوتی ہیں“

روسی مقولہ ہے: ”اگر عورت کے آئے دن کے جھگڑوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے ایک جاپانی چھتری خرید لو“ مگر میرے لیے یہ چھتری آئے دن کے مسائل کھڑے کرنے کا باعث بن گئی۔ مذکورہ خاتون نے اپنی چھتری کی کچھ اس طرح پبلسٹی کی کہ میڈناگورسک کی آدھی آبادی کو پتہ چل گیا کہ فلاں شخص یہ چھتری دسک سے لایا ہے۔ مجھ سے لوگ ملنے آتے اور حسرت بھرے لہجے میں پوچھتے: ”فلاں خاتون کے لیے چھتری تم لائے ہو؟ بڑے نصیبوں والی ہے“

بات اتنی بڑھی کہ فیکٹری کے جنرل مینجر کے کانوں تک جا پہنچی۔ انہوں نے مجھے بلا کر پیسے تو ڈانٹا کہ میں غیر ملکی ہو کر مقامی لوگوں سے مراسم کیوں بڑھا رہا ہوں، پھر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگے کہ یہاں کے لوگ اچھے نہیں۔ وہ تم سے فائدہ بھی اٹھائیں گے اور تمہیں نقصان بھی پہنچائیں گے۔ مینجر صاحب مجھے رخصت کرنے کے لیے دروازے تک گئے اور دروازے پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی محبت سے کہا: ”اب دسک جاؤ تو میری بیوی کے لیے ایک ایسی ہی چھتری لے آنا۔ ہمارے پاس تمہاری یادگار رہے گی“

سینی ٹوریم میں چھتری کی شہرت اس طرح پھیلی کہ ہر ڈاکٹر نے مجھ سے چھتری کا



مطابق شروع کر دیا۔ پہلے تو میں ہاں ہوں کرتا رہا، لیکن تابہ کے۔ جو بھی فرمائش کرتا میں اس سے کہہ دیتا کہ فیکٹری کے مینجر کو پتہ چل گیا ہے اس لیے اس نے مجھے سختی سے روک دیا ہے۔ اس پر اکثر لوگ میری مجبوری کو مان گئے بعض رازداری کے انداز میں کہتے کہ اگر میں ان کو چھتری لاکر دے سکوں تو وہ مجھے اصل قیمت سے بیس روپے زیادہ دے سکتے ہیں۔

### باشقیری مسلمان

ایک روز میری ملاقات باشقیر کے علاقے کے ایک تاتاری مسلمان کریوف سے ہوئی۔ وہ سینی ٹوریم میں کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ مجھے نماز پڑھتے دیکھا، تو بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا: یوں تو میں بھی مسلمان ہوں، لیکن تمہاری طرح اسلام کے ارکان کھلے بندوں ادا نہیں کر سکتا۔

میرے پوچھنے پر کہ آیا وہ ارکان اسلام سے واقف ہے؟ اس نے کچھ باتیں بتائیں، مگر اسلام کے بارے میں اس کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ نماز کو صرف قیام و سجود کی حد تک جانتا تھا۔ نماز میں کیا پڑھا جاتا ہے اسے معلوم نہ تھا۔ دوسری طرف اسے موسیقی سے بہت شغف تھا۔ ایک دن بڑے فخر سے کہنے لگا کہ اس کے پاس ہندی، فارسی، عربی، ترکی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے ہزاروں موسیقی کے کیسٹ اور ریکارڈ موجود ہیں۔

اس نے بتایا کہ باشقیر کے پورے علاقے میں کوئی مسجد نہیں ہے۔ صرف بوڑھے لوگ گھروں میں چھپ کر نماز پڑھ لیتے ہیں، تاہم اس نے دعویٰ کیا کہ باشقیر میں کئی اسلامی تنظیمیں خفیہ طور پر کام کرتی ہیں۔ جب میں نے پوچھا کہ آیا باشقیر مسلمان روسیوں کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے کرتے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا:



”کوئی باشتقیری عورت کسی روسی سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی“

اس نے بتایا کہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء تک باشتقیری مسلمانوں نے روسیوں کے خلاف زبردست مزاحمت کی اور ترکستانی بھائیوں کی مدد سے دو ڈویژن روسی فوج کو پسپا کر دیا لیکن جب روسیوں نے زیادہ قوت کے ساتھ باشتقیر کو مغلوب کر لیا تو کسی ایسے شخص کو زندہ نہ رہنے دیا جس کے بارے میں شبہ ہو کہ وہ مسلمان ہے۔ ساڑھے چھ لاکھ مسلمان جام شہادت نوش کر گئے۔ علمائے دین چن چن کر قتل کر دیے گئے۔ عوام میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا حوصلہ جاتا رہا۔ مسلم خواتین کی عفت و پاکیزگی پر حملے ہونے لگے مسلمانوں نے اپنی آنکھوں سے ایسی ذلت دیکھی کہ جس کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے اسے عذاب الہی اور آسمانی آفت سمجھ کر خاموشی اختیار کر لی۔

کریوف نے موجودہ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ”اب صورت حال تبدیل ہو چکی ہے۔ اسلام اپنی جگہ لینے کے لیے واپس آ رہا ہے“

### فیکٹری مینجر سے ملاقات

عملی کام کے اختتام پر کارخانے کے مینجر کو ہر طالب علم کے بارے میں رائے لکھنی ہوتی ہے۔ اس رائے پر آئندہ امتحان میں کامیابی کا بڑا انحصار ہوتا ہے۔ ہمارے کارخانے کے سربراہ کی شخصیت ک سخت سی تھی۔ چہرے پر ہر وقت غضب کے آثار رہتے اور کوئی شخص ان سے بات تک کرنے کی جرات نہ کرتا تھا۔

میرے ایک ویت نامی ساتھی کے بارے میں ان کی رائے زیادہ اچھی نہ تھی۔ مجھے بھی خوف تھا کہیں وہ میرے بارے میں غلط رپورٹ نہ لکھ دیں۔ اس طرح میرے لیے ڈگری کا حصول مشکل ہو جاتا؟ چنانچہ اس خوف سے میں نے ایک تحفہ لے کر فیکٹری کے مینجر کے گھر حاضری دی۔ خلاف معمول مینجر صاحب بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔



اس ملاقات میں ویت نامی ہم جماعت کے بارے میں غلط رائے رکھنے کی غایت معلوم ہوئی۔

عام طور پر ویت نامی قابل رشک کردار کے مالک ہوتے ہیں، لیکن یہ طالب علم ایسا نہ تھا۔ فیکٹری مینجر صاحب کے بقول اس نے ایک مشکوک کردار والی خاتون سے تعلقات استوار کر رکھے تھے، کئی بار اسے بار اپنے ہاسٹل بھی لاچکا تھا۔ فیکٹری کی طرف سے اسے بار بار تنبیہ کی جا چکی تھی، لیکن وہ اُسی روش کو اپنائے ہوئے تھا۔ مینجر صاحب نے بتایا کہ مذکورہ عورت کے شوہر کو بھی اس کی خبر ہو چکی ہے اور وہ فیکٹری کے سربراہ کو تحریری شکایت پیش کر چکا ہے۔ مینجر صاحب نے مجھے تاکید کی کہ میں اس ویت نامی لڑکے کو سمجھاؤں۔

انہوں نے کہا، قفقاز مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ یہاں جو روسی بتے ہیں وہ بھی اپنی آزاد روی ترک کیے ہوئے ہیں۔ اگر ویت نامی لڑکے کسی مسلمان عورت سے ناجائز تعلقات استوار کرتا تو اب تک دونوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہوتا۔ مینجر صاحب کی بات سن کر میری جان میں جان آئی۔ ان کی رائے میرے بارے میں بہت اچھی تھی۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ خود تو روسی ہیں، لیکن مسلمانوں کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔

### مقالہ لکھنے کا مرحلہ

عملی کام کے اختتام پر ہمیں مقالہ لکھنے کے لیے تین ماہ کا وقت دیا گیا۔ اس مقالے میں مجھے ان تمام موضوعات، حالات اور واقعات کا تحریری نچوڑ پیش کرنا تھا، جو میں نے پڑھے، لکھے، سنے، دیکھے یا مجھ پر بتیے تھے۔ لکھائی کے علاوہ کچھ عملی تجربات بھی کرنے پڑتے ہیں۔ میرے مقالے کا موضوع



تھا۔ اردو فیکٹری میں میسر مواد سے خود کفالتی اور تکنیکی سکیم کے مطابق مطالعہ و محاسبہ۔“

اس سلسلے میں مجھے تین مختلف سکیموں کا انتخاب کرنا اور ان کا اقتصادی جائزہ پیش کرنا تھا۔ کارخانے کے کام اور طریق کار کی تمام تر تفصیلات کا مطالعہ اور تنقیدی جائزہ لینا اور اس کو ترقی دینے کے لیے اصلاحی اقدامات پیش کرنے تھے۔ عملی کام کے دوران میں برقی جنریٹر، واٹر پمپ، واٹر مشین وغیرہ کو خود کار اور قابل عمل بنانا تھا۔ کارخانے میں استعمال ہونے والی مختلف مشینوں کے ایسے برقی نقشے تیار کرنے تھے جن سے مشینوں کی کارکردگی اور خوبی واضح ہو سکے۔ اس کے علاوہ کارخانے کے شور و شغب اور گرد و غبار کو کم کرنے کے سلسلے میں تعمیری تنقید اور تجاویز پیش کرنی تھیں۔ ان تمام امور میں مجھے اپنے اساتذہ کی مدد اور رہنمائی کی قدم قدم پر ضرورت تھی۔

اس مرحلے پر میرے سبھی ہم جماعت پریشان تھے خصوصاً جن لڑکوں نے پڑھنے لکھنے کا زمانہ غیر نصابی سرگرمیوں میں گنوا دیا تھا، لیکن سب سے زیادہ غمزدہ لڑکیاں تھیں۔ حالانکہ لڑکیوں کی اکثریت محنتی اور فرض شناس تھی، لیکن وہ کام کی زیادتی کی وجہ سے بوکھلا گئی تھیں۔ اکثر تو رونے لگتیں۔

اساتذہ ہمیں بڑی شفقت سے سمجھاتے اور تسلی دیتے کہ ہم وقت پر اپنا کام ضرور پورا کر لیں گے، اس کے باوجود ہماری پریشانی اپنی جگہ باقی تھی۔ اس لیے کہ بہت سے طلبہ کا ماضی سامنے تھا جو کئی برسوں کی بار بار کوشش کے باوجود مقالہ نہ لکھ پائے اور بالآخر انہیں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر دوسرے راستے اختیار کرنے پڑے۔

تکمیل کے بعد مقالے کی نقول متعلقہ اداروں کے ماہرین کے پاس بھیجی جاتی ہیں جو انہیں مطالعے اور محاسبے کی چھلنیوں سے گزارتے ہیں۔ غیر تسلی بخش ہونے کی صورت میں مقالہ طالب علم کو واپس دے دیا جاتا ہے کہ خامیوں کی اصلاح کرے۔ بعض اوقات



تو پورا مقالہ منسوخ کر دیا جاتا ہے۔

اپنا مقالہ مکمل کر کے میں اپنے شعبے کے سربراہ کے پاس گیا انہوں نے اپنے شعبے کے تائیدی خط کے ساتھ رنگدار دھات کے تحقیقاتی ادارے کو بھیج دیا۔ چند روز بعد خود مجھے بھی ایک تعارفی خط کے ساتھ مذکورہ ادارے میں بھیج دیا۔ مجھے اپنے کام کے بارے میں خاصی امید تھی، لیکن میرے ساتھیوں نے یہ کہہ کر مجھے پریشان کر دیا کہ تمہارا مقالہ جس شخص کے پاس بھیجا گیا ہے وہ نہایت باریک بین اور نکتہ رس شخص ہے۔ روسی طلبہ نے ان صاحب کا جو حکیہ بتایا تھا اس کے مطابق وہ ایک سخت گیر استاد تھے، لیکن وہ مجھے ہر لحاظ سے شریف اور مخلص انسان نظر آئے۔ چند منٹ کی بات چیت کے بعد معلوم ہو گیا کہ ان کا تعلق بھی قفقاز کے کسی مسلمان قبیلے سے ہے۔ میں نے پوچھا کہ آیا وہ مسلمان ہیں تو مسکراتے ہوئے بولے: ”الحمد للہ!“

اپنے گھر لے گئے۔ کھانے میں شریک کیا۔ اتنی شفقت اور محبت سے باتیں کیں کہ رُوح سرشار ہو گئی۔ وہیں بیٹھ کر میرے مقالے کا مطالعہ کیا اور اس پر اپنی رائے لکھی۔ انہوں نے اسے ایک کامیاب تحریر قرار دیتے ہوئے اعلیٰ نمبروں کا مستحق ٹھہرایا۔

اس کامیابی کے بعد اگلا مرحلہ زبانی امتحان کا تھا۔ امتحان لینے والوں میں پائیدر ایک ٹرانسپورٹ اور علوم اجتماعی کے اساتذہ کے علاوہ ہمارے شعبے کے چیرمین اور دوسرے اساتذہ موجود تھے۔

اپنے مقالے کی کاپیاں تمام اصحاب میں پہلے ہی تقسیم کر چکا تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں مقالے کا خلاصہ پیش کروں۔ اس کے لیے مجھے نصف گھنٹے کا وقت دیا گیا۔ اس کے بعد کمیشن کے ارکان نے باری باری سوالات کیے اور میں ڈگری کا مستحق قرار پایا۔ یوں میرا چھ سالہ تدریسی دور اختتام کو پہنچا۔



## تقسیم اسناد کی تقریب

کچھ روز بعد ہمیں ایک خصوصی تقریب میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے ڈگریاں عنایت کیں۔ اب ہمیں اپنی ڈگریاں لے کر ماسکو جانا اور دفتر خارجہ میں اندراج کرانا تھا۔ ماسکو میں سب سے مشکل مرحلہ وہ تھا جب ہمیں دفتر خارجہ کے ریکارڈ کے لیے ڈگری کی ایک نقل کے حصول کے لیے تین روز تک انتظار کرنا پڑا۔

ماسکو میں فوٹو سٹیٹ کے لیے صرف ایک ہی جگہ تھی۔ خدا جانے اس کی کیا حکمت ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پورے روس سے لوگ اپنی دستاویزات کی نقل تیار کرنے اسی جگہ آتے ہیں۔ تیسرے روز میں ڈگری کی نقل حاصل کر کے دفتر خارجہ گیا اور وہاں سے تصدیق نامہ مل گیا۔

## ہم وطنوں کی ریشہ دوانیاں

روس میں قیام کے دوران میں اپنے ہم وطنوں سے مجھے خاصی تکلیف اور شرمندگی اٹھانی پڑی۔ میری مراد وہ افغان طلبہ ہیں جو کیونزرم سے اپنے تعلق کی بنا پر منتخب ہو کر روس آئے تھے۔ روس آکر انہوں نے خاصے ہنگامے کیے۔ وہ "خلقی" اور "پرچی" کہلانے پر فخر کرتے اور ایک دوسرے کو کامریڈ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ وہ مجھے بھی کیونزرم سے "مشفق" کرنا چاہتے تھے، لیکن اس میں ناکام ہو کر اوجھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔

جن دنوں میں کریمیا میں تھا، اطلاع ملی کہ سردار داؤد نے ظاہر شاہ کو معزول کر کے عنان اقتدار خود سنبھال لی ہے۔ اس کے بعد سے میرے اشتراکی بھائیوں کے تیور اور بھی تنکھے ہو گئے۔ ان میں جوش کی نی لہر دوڑ گئی۔ مجھے چڑانے کے لیے کہتے کہ اب تو ہمارا کیونسٹ حکمران آگیا ہے ہم کابل جا کر نہیں مزہ چکھائیں گے۔



روس میں بھی انہوں نے مجھے زچ کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ خصوصاً داؤد کے انقلاب کے بعد تو ان کے تیور ہی بدل گئے تھے۔ روسی ٹیلی ویژن اور اخبارات نے بھی داؤد کی آمد کا گرمجوشی سے استقبال کیا تھا۔ کریمیا میں میری موجودگی میں افغان طلبہ نے داؤد کی خوشی میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا جسے افغان اصطلاح کے مطابق ”بزرگداشت“ کہا گیا۔ روس کے دوسرے شہروں میں بھی ایسے ہی اجتماعات ہوئے اس موقع پر مقررین نے نئے افغان سربراہ مملکت کو کامریڈ داؤد کے لقب سے یاد کیا۔ روسی کمیونسٹ لیڈروں نے داؤد کو افغانستان میں سرخ روشنی لانے والا ہیرو قرار دیا۔

ان ہی دنوں پرچم پارٹی کا ایک اہم لیڈر ڈاکٹر نجیب روس آیا۔ اس سے میری ملاقات بھی ہوئی۔ اسے میرے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہ تھیں۔ اس لیے ملاقات کے دوران میں جب میں نے اس سے داؤد کے نظریات کے بارے میں سوال کیا تو اس نے پر جوش انداز میں کہا :

”داؤد روس کا پکا دوست ہے۔ وہ کمیونزم کی تحریک کو استحکام دینا اور افغانستان کے لیے بڑے بڑے کام کرنا چاہتا ہے۔“

داؤد کی ترقی پسندی کی مثالیں دیتے ہوئے ڈاکٹر نجیب نے کہا ”صافیوں کے ساتھ جنگ“ قندھار اور مزار شریف پر بمباری، عورتوں کے لیے آزادی کے اعلان اور پاکستان کے خلاف جنگ کے عزم کا اظہار جیسے اقدامات اس کی ترقی پسندی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

اقتدار میں آتے ہی داؤد پر چمپیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا۔ بعد میں جب اسے پتہ چلا کہ اس کی حیثیت شطرنج کے ہرے سے زیادہ نہیں تو اس نے ہاتھ پاؤ مارے، مگر اب وقت کی باگ پر ہاتھ اس کے نہ تھے، روسیوں کے تھے۔

ان ہی دنوں میں تعطیلاتِ سرما میں افغانستان گیا۔ کابل میں افغان روس دوستی کا



جشن منایا جا رہا تھا۔ ”خانہ دوستی ملل“ میں بہت بڑا اجتماع منعقد ہوا جس میں روسی سفارت خانے کے لوگ بھی شریک تھے۔ داؤد حکومت کے دو وزیر بھی اجتماع میں شریک تھے۔ اجتماع گاہ کی دیوار پر سرخ رنگ کے چوکھٹوں میں لینن اور برزنیف کی قد آدم تصاویر لٹک رہی تھیں اور روس کے نعرے درج تھے۔

روس میں افغانستان کے سفیر ڈاکٹر علی احمد پوپل نے روس کے ساتھ اپنی ناقابل تلیخ دوستی کا اعلان کیا۔ ان کے بعد انجمن روس افغان دوستی کے صدر اٹھے۔ انہوں نے روس افغان دوستی کو صدیوں پر محیط قرار دیتے ہوئے امان اللہ خان کو اسلام اور افغانستان کا دشمن ٹھہرایا۔

### پارٹی میں شمولیت کی دعوت

یہ غالباً ۱۹۷۲ء کے موسم گرما کی بات ہے۔ میں دنسک میں اپنی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں قیام پذیر تھا۔ ایک رات میں اپنے ایک شناسا انور کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا۔ انور پرچم پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا جنرل سکرٹری تھا۔ اچانک اس نے میرا ہاتھ تھاما اور بڑی محبت سے کہنے لگا :

”تم اور حفیظ اللہ (میرا دوسرا ساتھی) پرچم پارٹی میں شامل ہو جاؤ؟“

میں اس کی پیش کش پر حیران ہوا کہ آخر اچانک اسے یہ بات کیوں سوچھی۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ خود ہی کہنے لگا : ”تمہیں کوئی خطرہ محسوس نہ کرنا چاہیے۔ ہم تمہاری مسلمانی میں کوئی رخنہ اندازی نہ کریں گے۔ بالکل آزادی سے عبادت کرنا۔ ہم تو تمہاری صلاحیتوں سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔“

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا : ”داؤد مکمل طور پر ہمارے ہاتھ میں ہے۔ وہ کارمل کو اپنا وزیر اعظم بنالے گا اور پھر کابل کی سلطنت



ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ وزیر دفاع سلیمان لائٹ پہلے ہی ہمارے آدمی ہیں۔ جیسے ہی  
کارمل وزیر اعظم بنائیں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ حکومت کا کوئی اہم ترین عہدہ تمہارے  
سپردہ کر دیں گے۔“

میں نے انور سے معذرت کر لی۔ اس پر اسے خاصا صدمہ ہوا۔ وہ دائرہ کا اس  
قدر دیوانہ تھا کہ اکثر اس کے فوٹو طلبہ میں بانٹا کرتا تھا۔

اسی طرح پرچم پارٹی کا ایک اور اہم کارکن سرور بھی میرے ساتھ مذہبی معاملات  
پر بحث کرتا جو بعض اوقات تلخی پیدا کر دیتی تھی۔ وہ مجھے تنبیہ کرتا کہ میں پرچم پارٹی  
پر اعتراض نہ کروں ورنہ مجھے نقصان اٹھانا پڑے گا!

انور اور سرور کی طرح کچھ دوسرے افغان لڑکے بھی کیونسٹ پارٹی سے تعلق  
رکھتے تھے، مگر زیادہ سرگرم نہ تھے۔ خلق پارٹی کے لڑکے بھی تھے، وہ زیادہ تر مغرور  
اور اکٹھے تھے۔ طلبہ سے میل جول نہ رکھتے تھے۔ اس لیے ”خلق“ دسک کی حرکت  
کنزور پارٹی تھی۔ آپس میں دونوں پارٹیوں میں اختلاف رہتا تھا، لیکن مسلمانوں کے  
خلاف دونوں متحد ہو جاتے تھے۔

## اشتراکی چالیں

”خلق“ اور ”پرچم“ کے لڑکوں نے متفقہ طور پر افغان سفارت خانے اور  
وزارت خارجہ کے دفتر جاکر میری شکایت کی کہ یہ طلبہ میں افتراق پھیلاتا ہے۔ نماز  
پڑھتا ہے اور حکومت کا مخالف اور اشتراکیت کا دشمن ہے، وغیرہ۔ اس پر مجھے کسی  
وزارت خارجہ کے دفتر سے تنبیہ کی گئی۔

ایک شیعہ طالب علم جس کا نام قاسم تھا، اُسے پرچمی اور خلقی میرے خلاف  
اکساتے کہ یہ سنی ہے اور شیعہ اکابرین کو برا بھلا کہتا ہے۔ میرے پاس آتے تو مجھ



سے کہتے، قاسم تمہیں گالیاں دیتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ قاسم کو اپنے کمرے میں دعوت دی اور اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ میں شیعہ اور سنی کے اختلافات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ہمارا مقابلہ کفر سے ہے۔ اگر وہ مجھے اپنا مخالف سمجھتا ہے تو سمجھا کرے، میں اسے اپنا سمجھتا ہوں۔ اس پر ہمارے درمیان اختلاف ختم ہو گیا، لیکن کمیونسٹوں کی چالوں میں کمی نہ آئی۔

انور اور سرور مجھے تکلیف پہنچانے کے لیے کسی موقعے کی تلاش میں رہے۔ اسی اثنا میں انہیں میری کمیونزم دشمنی کا ایک ثبوت مل گیا۔ یہ افغانستان سے میرے ایک دوست ڈاکٹر الف خان کا خط تھا۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ ”داؤد عملاً کمیونسٹ ہے“ مسلمانوں کو عموماً اور علماء کو خصوصاً سخت اذیتیں دے رہا ہے۔ مولوی شینواری اس کے مظالم سے تنگ آکر آزاد قبائل کی طرف ہجرت کر گئے ہیں۔“ خدا جانے کیسے یہ خط سرور کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے خط انور کو بھی دکھایا اور پھر میری کتابوں میں رکھ دیا۔

دوسرے روز دونوں میرے پاس آئے اور مجھ پر ”اخوان“ کارکن اور ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا۔ میں نے انکار کیا تو کہنے لگے تمہارے پاس الف خان کا خط آیا ہے جس میں اس نے تمہیں افغانستان کے اخوان کے حالات سکھے ہیں۔ میں نے خط انہیں دے دیا۔ کہ وہ خود پڑھ لیں۔ انہوں نے خط پڑھنے کے بجائے مجھے دھکی دیا کہ الف خان تمہارا دوست ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی ”اخوانی“ ہو۔ ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اگر میری اخوان سے وابستگی ہوتی، تو ضرور مان لیتا، مگر جب میرا ان سے کوئی تعلق ہی نہ تھا تو کیسے مان لیتا۔ میرے انکار پر کہنے لگے، ”ہمیں اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ تم روس اور اس کے دوستوں کے دشمن ہو۔ یہاں کئی اجتماعات ہیں برک کارمل اور ترہ کمی کی مخالفت کر چکے ہو۔“



وہ مجھے دھمکاتے ہوئے چلے گئے۔ کئی بار انہوں نے مجھے یونیورسٹی کے اساتذہ وائس چانسلر اور دوسرے اعلیٰ عہدیداروں کی نگاہوں سے گرانے کی کوشش کی۔ وہ ہر ایک سے کہتے پھرتے تھے کہ میں روس کا مخالف ہوں اور صرف جاسوسی کے لیے روس آیا ہوں۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے یونیورسٹی سے نکال دیا جائے، لیکن خدا تعالیٰ نے میری اعانت کا غیب سے انتظام کر دیا۔ وہ نہ صرف مجھے نقصان نہ پہنچا سکے بلکہ خود روسیوں کی نگاہوں میں بے وقعت ہو کر رہ گئے۔ اپنے ترقی پسند ساتھیوں کو پیش آنے والے دو واقعات یہاں پیش کر رہا ہوں۔

### لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گئے

افغانستان کے یوم استقلال کے موقع پر ہم افغان طلبہ نے روس میں جشن کی تقریب منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو افراد مدعو کیے گئے۔ ان میں صنعتی اور علمی اداروں کے سربراہ، یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے نگران اور پروفیسر، غیر ملکی طلبہ اور کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر شامل تھے۔

یہ تقریب دنسک شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ مہمانوں کی تواضع کے لیے روسی اور افغان دونوں قسم کے کھانے موجود تھے، لیکن شراب خالص روسی تھی۔ تفریح طبع کے لیے ہندوستانی فنکاروں کا ایک گروپ مدعو کیا گیا، جو ان دنوں روس کے دورے پر تھا۔ اناؤنسز کے فرائض پرچم پارٹی کا سرور انجام دے رہا تھا۔ ہم نے ممکنہ بد مزگی سے بچنے کے لیے فیصلہ کیا تھا کہ جلسے میں سیاسی اختلاف کی کوئی بات نہ ہوگی، لیکن سرور نے افتتاحی کلمات میں پرچم پارٹی کے لیڈروں کا یوں تعارف کر لیا جس سے خلق کے لڑکوں کو تکلیف پہنچی۔ سرور نے حاضرین کو بتایا کہ افغان تان میں کمیونسٹ تحریک کا بانی ببرک کارمل ہے اور خواتین میں پارٹی کی رہنمائی انامیتہ



راتب زادہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے عمدتہ کی حفیظہ الشد امین اور دوسرے خلقی رہنماؤں کا نام نہیں لیا تھا۔

اس کے بعد ہماری یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے روس افغان دوستی پر تقریر کی۔ ابھی وائس چانسلر صاحب تقریر ختم کر کے بیٹھے ہی تھے کہ ایک افغان طالب علم کھڑا ہو گیا۔ وہ غصے سے لرز رہا تھا۔ اس نے ببرک کارمل کو "دزدِ دربار" درباری کتے اور اناہتہ راتب زادہ کو "سیاسی طوائف" کے خطابات بخشتے ہوئے ترہ کی اور امین کی سیاسی عظمت کے گن گائے۔ ان الفاظ نے پوری مجلس میں ہیجان برپا کر دیا۔ بہت سے لڑکے یکبارگی کھڑے ہو کر شور مچانے لگے اور چیخ سے لڑکوں کو خاموش رہنے کی تلقین بے اثر ہو کر رہ گئی، چنانچہ پروگرام کے برعکس موسیقی کا پروگرام شروع کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ حالانکہ موسیقی کا پروگرام آخر میں رکھا گیا تھا۔

موسیقی نے محفل میں رنگ جمایا تو مہمانوں کو کھانے اور پینے کی دعوت دی گئی۔ اب ہمارا خیال تھا کہ تقریب پر امن انداز میں ختم ہو جائے گی، لیکن شراب کی بوتلیں خالی ہوتے ہی دلوں کے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ شراب کے بعد جب مہمانوں کے آرکسٹرا کی دھنوں پر رقص کرنے کی دعوت عام دی گئی تو ایک بار پھر سے ایک دوسرے کی توہین و تذلیل شروع ہو گئی۔

اس مرتبہ بد مزگی کا آغاز اس طرح ہوا کہ خلق پارٹی کے ایک طالب علم رجب علی نے سرور سے مہمانوں کو اپنا گانا سنانے کی پیش کش کی۔ چونکہ اناؤنسر سرور تھا اس نے رجب علی سے کہا کہ اس کی آواز بھدی ہے اس لیے وہ اپنا یہ شوق پورا نہیں کر سکتا۔

رجب علی نے احتجاجاً اپنی ایک دراز قامت معلمہ کا ہاتھ تھاما اور بے سنگم انداز میں رقص شروع کر دیا۔ رجب علی کا قد اٹھائی پست تھا۔ اس لیے جو بھی اس



جوڑے کو دیکھتا ہنسنا شروع کر دیتا۔

سرور رجب کے پاس گیا اور اسے غصے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر اسے رقص نہیں آتا تو دوسروں کو کیوں مذاق کا موقع دیتا ہے !

خلقی طلبہ پہلے ہی سرور پر تاؤ کھا رہے تھے۔ انہوں نے رجب اور سرور کو غصے میں بات کرتے دیکھا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ، سرور کو پکڑ لیا اور اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور خوب پٹیا۔ اس پر پرچم پارٹی کے لڑکے سرور کی مدد کو آئے اور خلق و پرچم پارٹی کے لڑکوں کے درمیان زوردار معرکہ ہوا۔ ہوٹل کے بہن اٹھا اٹھا کر مارے گئے اور شراب کی خالی بوتلوں سے ایک دوسرے کے سروں کو نشانہ بنایا گیا۔

ہم نے بیچ بچاؤ کی بہت کوشش کی، لیکن شراب کے نشے میں بہکے ہوئے لڑکوں پر کوئی بات کارگر نہ ہوتی تھی، تاہم اساتذہ نے مداخلت کر کے معاملہ کسی حد تک ٹھنڈا کر دیا۔ لڑکوں کو میزوں پر بٹھایا گیا۔ سب نے انہیں لعنت طاعت کی کہ اپنے ملک کے یوم آزادی کے موقع پر انہوں نے ملک کا خوب نام روشن کیا۔

تھکے ہوئے لڑکوں نے میز پر بچی کچھی شراب پی لی اور اس شراب نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔ پھر دھینکا شستی شروع ہوئی تو روسی مہمان ایک ایک کر کے واپس جانے لگے۔ جب صلح کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو کسی نے ہوٹل کی انتظامیہ کو خبر کر دی اور ہوٹل کے ملازمین نے ہال میں پنچ کر ہم سب کو حکم دیا کہ فی الفور ہوٹل سے نکل جائیں !

جس وقت میں ہوٹل کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ مجھے ایک خلقی طالب علم ہاتھ میں ایک ڈنڈا لیے ہوئے دکھائی دیا۔ اس نے قہر آلود لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: کہاں بھاگ گئے پرچمی ؟

اتنے میں چند پرچمی سیڑھیوں پر نمودار ہوئے اور ان کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ ہوٹل سے باہر نکل کر بھی لڑائی اور گالیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی اثنا میں ہوٹل کی انتظامیہ



نے پولیس کو خبر کر دی۔ پولیس والوں نے دونوں گروہوں کو چھڑایا۔ ہر پرچی اور خلقی طالب علم کو کہیں نہ کہیں زخم لگا تھا۔ یوں روسیوں پر اپنے کیونسٹ دوستوں کی حقیقت آشکارا ہو گئی۔

### ترقی پسندوں کا برہمنہ رقص

دوسرا واقعہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ غالباً یکم جنوری ۱۹۷۵ء کی رات تھی۔ روس میں اس رات ہر جگہ جشن منائے جاتے اور بڑی مقدار میں شراب پی جاتی ہے۔ ہمارے ترقی پسند افغان دوستوں نے سوچا کہ وہ کیوں روسیوں سے پیچھے رہیں؛ چنانچہ ہمیں دعوت دی گئی کہ چونکہ روس میں لوگ اس رات کی بہت عزت کرتے ہیں تو کیوں نہ ہم بھی جشن منا کر ان کو خوش کریں!

حقیقت میں ان لوگوں کو شراب نوشی کا کوئی بہانہ چاہیے تھا۔ افغان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اپنے ہم وطنوں سے الگ تھلگ رہنا خصوصاً روس میں مشکل تھا، لہذا مجھے بھی اس تقریب کے لیے چندہ ادا کرنا پڑا۔ مجھ سے رعایت یہ کی گئی کہ تم پندرہ روپے ادا کرو، کیونکہ تم شراب نہیں پیتے۔ باقی لوگوں نے تیس تیس روپے دیے۔

تقریب کا انعقاد ہاسٹل کے تین کمروں میں کیا گیا۔ روسی لڑکوں اور لڑکیوں کے علاوہ کچھ جیبا بختہ قسم کی عورتیں بھی اس تقریب میں مدعو کی گئی تھیں۔

کھانے اور شراب کے دور کے بعد محفل رقص و سرود برپا ہوئی۔ رات کو روسی ٹیلی ویژن پر جو فلم دکھائی گئی۔ اس میں مذہب کا مذاق اڑایا گیا تھا۔

فلم کا موضوع انسان کی تخلیق تھا۔ اس میں ڈارون کی تھیوری کا اثبات کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے اہل مذہب کا یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ حضرت آدم کو مٹی سے پیدا کر کے جنت



تقریب کے خاتمے پر جب میں ایک دوست کے ہمراہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو ایک خلقی طالب علم کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے کچھ شور سنائی دیا۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ پڑوسی اور خلقی طلبہ کچھ روسی لڑکیوں کے ساتھ عربا رقص کر رہے ہیں۔ ان کے جسم پر لباس کے نام سے ایک تار بھی موجود نہ تھا۔ میرا ساتھی تو اس تماشے کو قریب سے دیکھنے کمرے کے اندر چلا گیا، لیکن مجھ میں اس نظارے کو دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ آگے بڑھا تو ایک روسی طالب علم نے اپنے کمرے سے مجھے پکارا۔ یہ صاب بھی نشے میں دھت تھے، مگر تھے پورے لباس میں اور خاصی انسانیت سے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ سے پوچھا :



”کیا تم افغان نہیں ہو؟“

میں نے کہا: ”افغان ہوں۔ کیوں تمہیں کیسے شبہ ہوا؟“

کہنے لگے: ”تمہارے ساتھی تو فلاں صاحب کے کمرے میں برسہہ تن خوشیاں

منار ہے ہیں تم کیوں نہیں گئے؟“

میں بہت شرمندہ ہوا کہ کیا اب افغانوں کی پہچان عریانی اور فحاشی ہی رہ گئی ہے۔ کبھی لوگ ان کی غیرت اور جیا کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ ہمیں اس کمرے سے شور و غل کی آوازیں سنائی دیں جہاں یہ ہنگامہ ہو رہا تھا۔ ہم وہاں گئے تو دیکھا کہ سب افغان لڑکے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ پلیٹیں، چمچے اور بوتلیں دھڑا دھڑا بالکونی میں گر رہی تھیں۔ ایک صاحب کو تین ننگوں نے کمرے کے ایک کونے میں لٹا رکھا تھا اور اس پر لاتوں اور مکوں کی بارش ہو رہی تھی۔ دوسرے کونے میں ایک اور صاحب کی درگت بن رہی تھی۔ کچھ کمرے کے وسط میں گتھم گتھا تھے۔ لڑکیاں ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی رو رہی تھیں۔ ایک خلقی طالب علم لیڈر جوہری طرح زخمی ہو چکا تھا زور زور سے رو رہا تھا۔ ایک صاحب سالن سے بھرے ہوئے پریشر لکمرے دوسرے کے سر میں ضربیں لگا رہے تھے۔

یہ سب کچھ نہایت شرمناک تھا۔ لڑکیاں نہیں دیکھ کر کچھ شرمائیں اور کچھ حوصلہ پا کر بھاگ نکلیں۔ ہمیں ننگوں کے اس حجام میں جانا اچھا تو نہ لگتا تھا، مگر کیا کرتے؟ یہ ہمارے ہم وطن تھے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ جنوری کی اس سرد ترین رات ہیں یہ لوگ لباس سے عاری ہو کر زندہ کیسے تھے! شاید یہ شراب کا کمال تھا یا دھینکا مستی سے ان میں یہ چستی آگئی تھی۔

ایک ناتوان سالگرہ کا جو بہت زیادہ پٹ چکا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ہماری پناہ کا طالب ہوا۔ میں اور میرا ساتھی حفیظ اللہ اسے تنہا کر اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہ شراب



کے نشے میں بری طرح دھت تھا۔ مار دھاڑ میں شراب کی بوتل سے اس کے سر میں زخم آیا تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ خون بند کرنے کی کوئی ترکیب نظر نہ آئی تو حفیظ اللہ نے اسے نہانے کے ٹب میں لٹا کر پانی کا نل کھول دیا۔ اب اس کی بد قسمتی دیکھیے کہ غلطی سے ٹھنڈے کے بجائے ابلتے ہوئے گرم پانی کا نل کھل گیا۔ گرم پانی کی پہلی دھاڑ پڑتے ہی وہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ٹب سے باہر چھلانگ لگا کر زمین پر لوٹنے لگا۔ گرم پانی کی وجہ سے اس کے چہرے اور سینے پر آبلے پڑ گئے۔

دوسرے روز ہمارے تمام ترقی پسند ساتھی سفید ٹیوں کی وجہ سے یونیورسٹی اور ہاسٹلوں میں پہچانے جاتے تھے۔ انہیں رات کے ہنگامے کی جوابدہی کے لیے غیر ملکی طلبہ کے دفتر جانا پڑا۔ وہاں دونوں گروپوں نے ایک دوسرے کے خلاف الزامات لگائے اور تحریری درخواستیں دیں۔ روسی افسروں نے انہیں خوب شرمندہ کیا اور آئندہ کے لیے تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔

اس طرح روسی افسروں کی نگاہوں میں ان کی ساکھ گر گئی اور میں آئندہ کے لیے ان کی چالوں سے خاصی حد تک محفوظ ہو گیا۔ وہ جب بھی میری شکایت لے کر اعلیٰ افسروں کے پاس جاتے وہ انہیں جھڑک کر لوٹا دیتے تھے۔ کوئی ان کی بات کو درست نہ سمجھتا تھا۔ ایک ادھ مرتبہ میری جواب طلبی ہوئی، تو میں نے اپنی گواہی کے لیے روسی طلبہ پیش کر دیے جنہوں نے میری تعریف کی اور میں باعزت بری ہو گیا۔

### شراب خانہ، خرابی کا شاخصانہ

ایسا ہی ایک واقعہ ماسکو میں پیش آیا جب میرے ایک افغان ساتھی نے مجھے حکومت کی نگاہوں سے گرانے کی کوشش کی۔ یہ سردی کے دن تھے۔ ہم کچھ ضروری چیزوں کی خریداری کے لیے ماسکو گئے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ ایک استاد اور ایک روسی



طالب علم کے علاوہ ایک افغان ساتھی بھی تھا۔ ماسکو میں ہم ایک روسی دعوت میں شریک ہوئے۔ یہ واقعہ اسی دعوت کے موقع پر پیش آیا۔

یہ دعوت روسی طرز کی تھی۔ خورد و نوش کی ہر شے کثیر مقدار میں موجود تھی۔ خصوصاً شراب کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔ چونکہ میرے میزبانوں کو معلوم تھا کہ میں شراب نہیں پیتا اس لیے میرے لیے لذیذ شربت کی ایک صراحی رکھ دی گئی تھی۔ محفل کا آغاز روایت کے مطابق ماسکو کی ایک یونیورسٹی کے استاد کے ابتدائی کلمات سے ہوا۔ انہوں نے افغانستان میں آنے والے سوشلسٹ انقلاب کے بارے میں نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد شراب کا دور چلا اور پھر میزبان نے مجھے بحیثیت مہمان کچھ کہنے کی دعوت دی۔

میں نے افغانستان کے معروضی حالات پر چند کلمات کہے۔ بات ختم کر کے بیٹھا ہی تھا کہ ماسکو کی ایک یونیورسٹی میں زیر تعلیم ایک افغان طالب علم (حلقی) نے کھڑے ہو کر میرا "نیا تعارف" پیش کیا۔ ان کے مطابق میں انقلاب دشمن اور رجعت پسند تھا۔ اس نے ثبوت کے طور پر میرے سامنے پڑے ہوئے شربت کے جگ کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ یہ افغانوں کو چودہ سو سال پیچھے لے جانا چاہتا ہے۔ اس نے میری تقریر کا یہ فقرہ حوالے کے طور پر پیش کیا :

”ہم افغانستان کی غیر وابستہ ملک کی حیثیت برقرار رکھنا چاہتے ہیں“

افغان طالب علم نشے میں بری طرح بہک رہا تھا۔ اُس نے مجھے برا بھلا کہنے کے بعد اپنا شراب کا جام اٹھا کر مجھ پر پھینکنا چاہا، مگر دوسرے لوگوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جب تک میں کمرے سے باہر نہ چلا گیا، وہ بکتا جھکتا رہا۔

دوسرے مہمانوں پر بھی شراب کا نشہ طاری تھا، لیکن وہ ہوش سے اس قدر بے گانہ نہ ہوئے تھے کہ اس واقعے میں اس کی زیادتی کو محسوس نہ کرتے۔ دسکے



یونیورسٹی سے میرے ہمراہ آئے ہوئے استاد کو تو میری توہین پر بے حد افسوس تھا۔  
 ونک واپس جانے کے بعد انہوں نے غیر ملکی طلبہ کے نگران کو رواد سفر کہہ سنائی،  
 جس کے بعد انہوں نے مجھے اپنے دفتر میں بلا کر ذاتی طور پر اس ناخوشگوار واقعے پر  
 معذرت کی۔

حکایتِ شام



## دسواں باب

### غربت کے اندھیرے

روس جانے والے اکثر لوگوں کو صرف شہری علاقوں میں جانے کا موقع ملتا ہے۔ دیہات میں جانے کی اجازت کم ہی دی جاتی ہے۔ اس لیے بہت کم لوگوں کو اس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ شہروں اور دیہات کے مابین کس طرح کا تفاوت پایا جاتا ہے۔ مجھے خوش قسمتی سے بارہا دیہی علاقے میں جانے کا موقع ملا۔ اس لیے مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ روس میں شہروں کے لوگ دیہی علاقوں کے لوگوں سے کتنی مختلف زندگی گزارتے ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ شہروں کے عام لوگ دیہات کے آسودہ حال لوگوں سے بہتر زندگی گزارتے ہیں۔ ویسے شہروں میں لوگوں کی بہتر حالت ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہاں کے لوگ بہت زیادہ امیر اور آسودہ ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے شہروں میں بھی مفلسی کے ایسے ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں کہ افغانستان جیسے پسماندہ ملک میں بھی ان کا سراغ نہیں ملتا۔ میں نے لوگوں کو شہر میں ایسے جھونپڑوں میں آباد دیکھا ہے جہاں چوپائے بھی نہیں رہ سکتے۔ ان گھروں میں پانی اور بجلی جیسی بنیادی سہولتیں تک

موجود نہیں ہیں۔ کیونٹ پارٹی کے بعض ارکان نے مجھے بتایا کہ حکومت ایسے لوگوں کو سرکاری



مکانات میں رہائش اختیار کرنے کی پیش کش کر چکی ہے، مگر وہ اپنے چھوٹیڑوں میں رہنا پسند کرتے ہیں اور آسائش کی روشنی پر غربت کے اندھیروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

میری ایک ہم جماعت ناتاشا نے بڑے اصرار سے مجھے اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ اس کا گھر شہر کے امراء کے خوبصورت محلات سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ ہم غریب لوگ ہیں، لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ ان کا پورا کنبہ بارہ تیرہ فٹ مربع کے ایک کمرے میں مقیم ہوگا۔

برف باری کا موسم تھا۔ میں ناتاشا کے گھر پہنچا تو برف کے گائے گر رہے تھے۔ ناتاشا کے والدین اور بھائی بہن اسی کمرے میں مقیم تھے۔ وہ میری آمد پر خوش بھی تھے اور کچھ شرمندہ بھی۔ بار بار جگہ کی تنگی پر معذرت کر رہے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں تنور بنا ہوا تھا جس میں ناتاشا کی بوڑھی ماں نے روٹیاں لگا بیٹیں۔ دوسرے کونے میں مٹی کے چبوترے پر ایک پرانا ٹرانزسٹر رکھا تھا جسے اس کے والد بار بار کھولتے لیکن جب وہ شوں شوں کر کے رہ جاتا تو بند کر دیتے تھے۔ ٹرانزسٹر کا تین باتوں کی تاروں سے بندھا ہوا تھا۔ گھر کا سامان اتنا مختصر تھا کہ کسی خانہ بدوش گنبے کا پڑاؤ معلوم ہوتا تھا۔

ناتاشا کے بوڑھے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا لباس میلا اور پرانا تھا۔ انہوں نے میرے بارے میں یوکرینی زبان میں بات چیت کی، تاکہ اُن کی کمزوری اور غربت کا پھید مجھ پر نہ کھلے، لیکن مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ وہ میری تواضع کرنے کے لیے منانا سامان خورد و نوش نہ ہونے پر شرمندہ تھے۔

ناتاشا کا والد ادھیڑ عمر کا مزدور تھا۔ اس نے خاصی دیر تک مجھے باتوں میں الجھائے رکھا۔ اس دوران میں اس کی بیوی اور بیٹی نے میرے لیے کھانے کا بندوبست کیا۔ اس نے اپنی غربت کو خورد واری کے پردے میں چھپائے رکھا۔ جنگ کے دور



کا ذکر کیا جب روس میں روٹی اور دوسرے سامانِ خورد و نوش کی سخت قلت تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ بوڑھا ہے اس لیے ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے۔

اسے صرف ۳۵ روپل ماہانہ پنشن ملتی تھی۔ بیوی کام کرنے کے قابل نہ تھی اس لیے بچوں کو پالنے کے لیے خود اسے اضافی کام کرنے پڑے تھے اس نے بڑے فخر سے بتایا کہ وہ فارغ اوقات میں سٹور پالتا ہے اور ان کا گوشت بازار میں فروخت کر کے خاصے پیسے کمالتا ہے۔

ناتاشا کے والد نے بتایا کہ وہ اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا خواہاں ہے اس لیے اس کی آمدنی کا بڑا حصہ ان کی تعلیم پر خرچ ہو جاتا ہے۔

ناتاشا بڑی کلاس میں تھی اس پر بیس روپل اخراجات اٹھتے تھے۔ بوڑھے باپ نے اپنی بیٹی کے بارے میں بڑے فخر سے کہا: "میری ناتاشی فضول خرچ نہیں۔ وہ بہت جلد انجینئر بن جائے گی اور اپنے لیے کوئی شوہر پسند کرے گی اور پھر میری پریشانی کم ہو جائے گی۔"

ناتاشا کے ہاں کھانے میں خلوص کی چاشنی تھی، لیکن وہ پوری کوشش سے صرف ایک ہی ڈش تیار کر سکے۔ روٹی، شوربہ، کچھ سلاد اور مکھن کی ایک ٹکیا۔

روس کے بین الاقوامی کلبوں میں، جہاں ملیش و عشرت کا ہر سامان موجود ہوتا ہے روسی دانشور پس ماندہ ممالک کے طلبہ کو سوشلسٹ انقلاب لانے کی تدبیریں بتاتے تھے۔ میں ایک جانب یہ تقریریں سنتا اور دوسری طرف روسی معاشرے میں غربت کے ہر طرف پھیلے ہوئے مناظر دیکھتا تو میرا دل خود بخود اس انقلاب سے بیزار ہو جاتا۔ ایک مزدور اپنی پوری زندگی روس کو سپر یادر بنانے کے لیے وقف کیے رکھتا ہے۔ اس کا انعام اسے یہ ملتا ہے کہ بڑھاپے میں ۳۷ روپل ماہانہ پنشن ملتی ہے اکثر بوڑھوں کو پنشن پر جانے کے بعد بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ بوڑھی عورتیں ۲۰، ۲۵ روپل



ماہانہ کی مزدوری تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ ہاں اعلیٰ فوجی اور سول افسروں کی حالت مختلف ہے۔ ان کی پنشن ۲۵۰ سے ۱۰۰۰ روپل ماہانہ اور بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انہیں مفت گھر دیے جاتے ہیں۔ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت حکومت کے ذمے ہوتی ہے۔ علاج معالجے پر اٹھنے والے اخراجات بھی حکومت کے ذمے ہوتے ہیں۔

### لینن گراڈ کی سیر

لینن گراڈ کی سیر کا موقع مجھے بہت دیر سے ملا۔ روس میں قیام کے آخری سال کچھ دوسرے طلبہ کے ہمراہ مجھے اجازت ملی کہ میں وطن جانے سے پہلے روسی انقلاب کے اس گہوارے کو دیکھ لوں۔ یہ ۱۹۷۶ء کا موسم سرما تھا۔ لینن گراڈ کا درجہ حرارت سردی کے چھ ماہ نقطہ انجماد سے نیچے رہتا ہے۔

لینن گراڈ کے ہوائی اڈے کی سطح بستہ فضا میں ایک درجن سے زیادہ نوجوان کمیونسٹ لڑکیاں ہمارے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ ہمارے گروپ میں میرے علاوہ بیت نام، یمن، بنگلہ دیش، افریقہ، لاطینی امریکہ اور افغانستان کے تقریباً بیس طلبہ تھے۔ غیر ملکی طلبہ کے ادارے کی خاتون سیکرٹری ہمارے گروپ کی قائد تھیں۔ وہ ہمیں پہلے سے طے کردہ پروگرام کے مطابق مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کیلئے لے گئیں۔

زاروں کے عہد میں لینن گراڈ روس کا پایہ تخت رہ چکا ہے۔ اس لیے سینکڑوں تاریخی عمارتیں اس کے شکوہ میں اضافے کا سبب ہیں۔ دریائے نیوا کے کنارے آباد شہر میں تقریباً چالیس لاکھ افراد رہتے ہیں اور یہ ماسکو کے بعد روس کا دوسرا بڑا شہر ہے۔



لینن گراڈ بہت بڑا صنعتی اور تجارتی مرکز ہونے کے علاوہ ایک علمی اور تہذیبی مرکز کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتا ہے۔ پانسو عجائب گھر، دو ہزار لائبریریاں، ایک سوانسی تحقیقاتی ادارے، چالیس اعلیٰ تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیاں شہر کے حسن میں تنوع اور وقار پیدا کرتی ہیں۔

ہوائی اڈے سے ایک خوبصورت بس کے ذریعے ہمیں ادارہ جہاز سازی کے پرنسکوہ ہاسٹل پہنچایا گیا جہاں ہمارے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اجتماعی سیاحت کے علاوہ لڑکوں کو اجازت دی گئی کہ وہ انفرادی طور پر کہیں جانا چاہتے ہیں تو جاسکتے ہیں۔

### ہوس کے مارے طلبہ

میرے ساتھ چند ایسے افغان طلبہ تھے جنہیں روس آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا اس لیے وہ روسی زبان سے نابلد تھے۔ انہوں نے روس کے بارے میں افسانوی داستانیں سن رکھی تھیں اور لینن گراڈ کی شان و شوکت اور رنگینیوں سے بے حد مسحوب تھے۔ خصوصاً روس میں جنسی آزادی کو دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہوئے جاتے تھے۔ اخلاقی تربیت سے محرومی اور نئے ماحول کی چکا چونڈ نے ان میں نندیدہ پن پیدا کر دیا تھا۔ گلیوں میں گزرتے ہوئے ہر لڑکی کی طرف ہوسناک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ مجھے ان کی سہرا سی زیادہ پسند نہ تھی، لیکن وہ زبان کی اجنبیت کے مسئلے سے دوچار تھے اور میں ان کا ہم وطن ہونے کی وجہ سے ان کی ترجمانی پر مجبور تھا۔

دوسرے روز میں ان میں سے ایک ہم وطن بھائی کے ہمراہ ایک قریبی ہوٹل میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ دوروی لڑکیاں ہمارے قریب والی میز پر آ بیٹھیں۔ دونوں آتے ہی سگریٹ نوشی میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی فشکار کو پھانسنے کی فکر میں ہیں۔



میں نے اپنے ساتھی کو تنبیہ کر دی کہ ان کی طرف نہ دیکھے، ورنہ وہ اسے دعوت تصور کرتے ہوئے ہمارے پاس آ بیٹھیں گی۔ مجھے اس کا پہلے تجربہ ہو چکا تھا، لیکن میرے ساتھی کی نگاہیں بہک کر رہیں۔ دونوں لڑکیاں اسی لمحے کے انتظار میں تھیں۔ وہ مسکراتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھیں اور ہماری میز پر آ بیٹھیں۔ میں نے اپنے دوست پر واضح کر دیا کہ وہ اس صورت حال کا ذمہ دار ہے۔ اس لیے لڑکیوں کے خورد و نوش کے اخراجات اسے ادا کرنے ہوں گے۔ اس نے بخوشی منظور کر لیا، لیکن کچھ دیر بعد بیرابل لے کر آیا تو ۸۰ روپل کے ہند سے کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ دونوں خواتین نے شراب اور دوسری چیزیں اتنی سرعت سے ختم کر لی تھیں کہ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ اتنی رقم بن سکتی ہے۔

میں کھانا کھا کر سیدھا قیام گاہ پر جانا چاہتا تھا لیکن وہ لڑکیاں ہم سے جدا نہ ہونا چاہتی تھیں۔ میرا ساتھی بھی ریشہ خطمی ہو جاتا تھا۔ ہوٹل سے باہر نکل کر اس نے مجھے بخوشی جانے کی اجازت دے دی اور صبح واپس آنے کا عزم ظاہر کیا۔ میں نے اسے الگ کر کے سمجھایا کہ وہ اسے کنگال کر دیں گی، مگر اس کے سر میں سودا سمایا ہوا تھا۔ کہنے لگا: ”کچھ بھی ہو۔ میرے پاس کچھ رقم ہے۔ زبان کا مسئلہ ہے، مگر گزارہ کر لوں گا۔“

ہمارے ساتھ ایک افریقی طالب علم بھی تھا۔ اس کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی، لیکن حسینان روس کی کشش اسے بھی تڑپاتی تھی۔ سارا دن گلیوں کی خاک چھانتا اور میٹرو کے سٹیشنوں کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ دن میں سینکڑوں عورتوں سے اپنی ملاقات کی داستانیں سنا تا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ انجام سے بے نیاز ہو کر روسی عورتوں سے گپ شپ لڑتا ہے، لیکن ایک بار بھی اسے مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔



## عجائب گھروں کی سیر

لینن گراڈ میں ہیں متعدد تاریخی مقامات اور عجائب گھروں کی سیر کرائی گئی۔ ان میں ہر میتاز کا تاریخی عجائب گھر، قصر پتروپالوسکی، گنبد ایساکولسکی، لینن گراڈ کا عجائب گھر اور دوسری جنگ عظیم کا عجائب گھر زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ہمیں زارن روس کے عہد کا وہ قید خانہ بھی دکھایا گیا جس میں روس کے مشہور ادیب میکسم گورکی نے زمانہ اسارت گزارا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں لینن گراڈ پر کیا گزری۔ اس کی پوری تصویر اس عجائب گھر کی سیر کرنے کے بعد لگا ہوں میں پھر نے لگتی ہے۔ جنگ کے دوران میں کس طرح لینن گراڈ کے شہریوں نے گیارہ سو قیامت خیز دن جرمینوں کے محاصرے میں گزارے۔ جب رسد اور غذائی اجناس شہر تک پہنچنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ لوگوں نے بھوک، سردی اور جنگ کی آگ کا کیسے مقابلہ کیا۔ غلے کی شدید کمی کا علاج یہ ڈھونڈا گیا کہ آٹے کے ساتھ لکڑی کا برادہ ملا کر روٹی پکائی جائے۔ اس روٹی میں آٹے کی مقدار برادے سے کم ہوتی تھی۔ اس روٹی کے نمونے عجائب گھر میں رکھے گئے ہیں۔ دستاویزی فلموں کے ذریعے دکھایا گیا کہ مسلسل بھوک کی وجہ سے ہزاروں لوگوں کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔

جنگ کی ایک فلم تو بہت ہی اثر انگیز تھی۔ ایک نوجوان جو مسلسل بھوک کی وجہ سے جسمانی توانائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کی ماں اسے ایک تختے پر بٹھا کر برف کے میدانوں میں کھینچتی ہوئی لے جاتی ہے۔ ایسے علاقے کی تلاش میں جہاں اسے اپنے بخت جگر کے لیے روٹی کا ایک ٹکڑا مل سکے۔ جنگ کی آگ اور شدید سردی کے طوفان میں ایک ضعیف عورت کی اپنے بیٹے سے محبت کا منظر دل میں اتر جاتا ہے۔



اس فلم میں بھوک کے کئی اور دلہوز مناظر بھی تھے۔ بہار کے موسم میں جب درختوں پر نئی کونپلیں نکلتی ہیں تو سینکڑوں بھوکے لوگ انہیں پھنچ پھنچ کر کھاتے ہیں۔ اس فلم کا تعارف کرتے ہوئے عجائب گھر کے ایک افسر نے بتایا کہ لینن گراڈ میں جنگ کے زمانے میں ایسا بھی ہوا کہ کسی گھر میں کوئی فرد بھوک سے مر گیا تو گھر کے دوسرے افراد اپنے مردہ عزیز کا گوشت تک کھا گئے۔

لینن گراڈ کا تاریخی عجائب گھر اس قدر دلچسپ ہے کہ دور دراز تک سیر کرنے کے بعد بھی ہمارا جی نہ بھرا۔ دنیا بھر کے مصوروں کے فن پارے زبانی ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں۔ ہر گیلری میں روسی مصوروں کے فن کی نمائندگی موجود ہے۔ روسی مصوروں میں ششک کے شہکار سب سے خوبصورت ہیں۔ اگرچہ جدید دور میں مصوری نے بے حد ترقی کی ہے، لیکن قرون وسطیٰ کے روسی مصوروں کا فن بھی اپنی جگہ لاثانی ہے۔

اس عجائب گھر میں روس کی مشہور ملکہ کاتیرینی کے دور کے بنے ہوئے مجسمے اور بُت بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اکثر مجسمے چاندی اور ایلونیم سے بنائے گئے ہیں۔ بنانے والوں نے اتنی مہارت کا ثبوت دیا ہے کہ ان مجسموں پر زندہ انسانوں کا گمان ہوتا ہے۔ ہماری گائیڈ کیونسٹ پارٹی کا تاریخی عجائب گھر دکھانے بھی لے گئیں۔ عجائب گھر کے اہلکاروں نے بڑے منظم طریقے سے ہمیں ایک ایک چیز دکھائی اور اس کا پس منظر سمجھایا۔ اشتراکی نظام کا شاید یہ خاصہ ہے کہ ہر موقع پر پروپیگنڈے کے ذریعے پارٹی کا جھنڈا بلند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عجائب گھر کے ملازموں نے کیونسٹ پارٹی سے متعلق دستاویزات دکھاتے ہوئے ہم پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ پارٹی کے بانیوں کی فراست اور بصیرت کی وجہ سے روس آج عظمتوں کو چھونے کے قابل ہوا ہے۔ اس عجائب گھر میں کیونسٹ پارٹی کی پہلی کانگریس سے لے کر آج تک کی تمام اہم دستاویزات محفوظ ہیں۔ لینن کی زندگی کے متعلق بھی بہت سی چیزیں رکھی گئی ہیں۔



انقلاب کے بانی کے ملبوسات، جوتے، خطوط، اس کی گاڑی، زیر استعمال فرنیچر اور دوسری دفتری اور گھریلو اشیاء شامل ہیں۔

ایسا کوپسکی ہٹا بوڑھین گراڈ کا مشہور کلیسا ہے۔ اس کی مغربی دیوار کے وسط میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مجسمہ دیوار میں شیشوں کے اندر نصب کیا گیا ہے جو باہر سے دیکھنے والوں کو زندہ معلوم ہوتا ہے۔ دیوار کے دوسرے حصے عیسائیت کے تاریخ کی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔

قصر پتروپالو کی وسیع رقبہ پر پھیلے ہوئے محلات کا سلسلہ ہے۔ یہاں شاہی خاندان کی قبریں زار ان روس کی سطوت رفتہ کی مظہر ہیں۔ یہیں وہ قید خانہ بھی ہے جس میں روسی زار اپنے سیاسی مخالفین کو تعذیب و تشدد کے مختلف مرحلوں سے گزارتے تھے۔ قیدیوں کو نظر بندی کے دوران میں مسلسل وحشت ناک تاریکی میں رکھا جاتا تھا۔ رفع حاجت کے لیے باہر جاتے، تب بھی آنکھوں پر پٹی ہوتی تھی۔ اس مقام کو دیکھ کر واقعی عبرت ہوئی۔ انسان اپنے دور اقتدار میں انجام سے اتنا بے خبر کیوں ہوتا ہے! میرے ایک روسی دوست نے زاروں کے قید خانے کے سامنے کھڑے ہو کر مجھ سے کہا:

”ہم نے زاروں کے انجام سے عبرت حاصل نہیں کی۔ اپنے مخالفوں کو معاف کرنا ہمارے نزدیک حماقت ہے۔ سائبیریا کے بیگار کیمپوں میں انسانیت پر ہونے والے مظالم بھی شاید کبھی تاریخ کے صفحات پر نظر آئیں گے، اور آنے والا دور موجودہ دور کے زاروں کی سیاہ کاریوں کی نشاندہی کے لیے یادگاریں اور عجائب گھر تعمیر کرے گا۔“

زلمینوی دور پریچ وہ تاریخی محل ہے جس میں سرخ انقلاب کے بعد پہلی حکومت قائم کی گئی تھی۔ اب یہ انقلاب کے عجائب گھر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ لینن گراڈ ہی وہ شہر ہے جہاں لینن جرمینوں کی مدد سے فن لینڈ کے راستے داخل ہوا اور انقلاب کے



قیادت کی۔ اس کے معتمد ساتھیوں میں اکثریت یہودیوں کی تھی۔ ان میں ٹراٹسکی، میلی کوف، گونخو کوف اور کرنسکی قابل ذکر ہیں۔

اس تاریخی عجائب گھر میں انقلاب کی مکمل داستان دستاویزوں کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ انقلاب کے بعد بننے والی پہلی قومی اسمبلی میں، ۵۴ افراد تھے جن میں ۴۴ یہودی تھے۔ انقلابی حکومت کا وزیراعظم لینن تھا اور صدر ایک انتہا پسند یہودی کامینن۔ خود لینن کی بیوی کروفسکایا بھی یہودن تھی اور اولین دستور تیار کرنے والی کمیٹی کا چیئر مین سویر لوف بھی یہودی تھا۔

### قیدی مسجد

لینن گراڈ میں قیام کے دوران میں ہماری گائیڈ خاتون نے ایک روز بتایا کہ شہر میں ایک مسجد بھی ہے۔ میرے پوچھنے پر کہ آیا اس میں نماز ہوتی ہے؟ اس نے بتایا کہ ہفتے میں ایک بار مسجد نمازیوں کے لیے کھولی جاتی ہے اور یہ دن جمعے کا ہوتا ہے۔ جمعے کا دن آیا تو میں نے اس مسجد کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ گائیڈ نے میری درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور چند دوسرے مسلم طلبہ کے ہمراہ مسجد میں نماز ادا کرنے پہنچا۔ جمعے کی نماز کا وقت تھا، لیکن مسجد میں کسی نمازی کا وجود نہ تھا۔ صحن میں کھلنے والا واحد دروازہ مقفل تھا اور مسجد کے چاروں جانب خاردار تاروں کی باڑھ لگائی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طویل عرصے سے مسجد میں کوئی انسان داخل نہیں ہوا۔ میں نے خاردار تار کے قریب جا کر مسجد کا اندرونی منظر دیکھا۔ دیواروں پر بنائے گئے خوبصورت نقش و نگار گردوغبار میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر بھی دیوار کے ایک حصے پر سورہ ملکہ صاف پڑھی جاسکتی تھی۔

مسجد کی عمارت اور اس میں بنائے گئے نقش و نگار وسط ایشیا کے اسلامی طرز



تعمیر کا دلکش نمونہ تھے۔ ہم نے اپنی گائیڈ سے مسجد کی بندش کے بارے میں پوچھا تو اس نے بڑی معصومیت سے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ چند برس پہلے اس مسجد میں نمازیوں کی خاصی تعداد جمع ہو جاتی تھی۔ جمعے کے روز مسجد نمازیوں سے بھری ہوتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ لوگوں کا رجحان کم ہوتا چلا گیا۔ اب شاید مسجد میں کوئی آتا ہی نہیں اس لیے مسجد بند کر دی گئی ہے۔ ہمیں اس کی غلط بیانی پر غصہ تو بہت آیا، لیکن اسے کیا کہتے۔ ایک گھنٹے تک انتظار کے بعد بھی جب کوئی شخص مسجد کھولنے کے لیے نہ آیا اور نماز کا وقت گزر گیا تو ہم نماز جمعہ ادا کیے بغیر واپس ہو گئے۔

لینن گراڈ میں قیام کی مدت پوری کرنے کے بعد ہم نے واپسی کا ارادہ کیا۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ تو مل گئے لیکن جہاز بروقت نہ مل سکا۔ سردیوں میں برف باری کی وجہ سے جہازوں کا شیڈول اکثر متاثر ہوتا ہے۔ پورا دن ہوائی اڈے پر جہاز کے انتظار میں گزر گیا۔ تھوڑی دیر بعد اعلان ہوا کہ دنسک جانے والے مسافر انتظار کریں۔ جہاز کچھ دیر بعد روانہ ہو گا لیکن برفانی طوفان کا زور نہ ٹوٹا اور اس روز کی پروازیں منسوخ کر دی گئیں۔ ہوائی اڈے کی قلفی جمادینے والی سردی میں رات بسر کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ ہمارے ساتھ جو گائیڈ آیا تھا، وہ ہماری کچھ رہنمائی نہ کر سکا۔ ادھر پرواز منسوخ ہوئی اور ادھر وہ صاحب ہم سے رخصت ہو گئے۔ ہم پریشان حال انتظار گاہ میں بیٹھے تھے کہ ایک راہ سو جھبی کیون نہ غیر ملکی مہمانوں کی قیام گاہ پر رات گزاری جائے! رات گئے ہمارے مینر بانوں کو ہماری آمد زیادہ خوشی کا باعث نہ تھی، لیکن ہماری حالت زار دیکھ کر انہیں رحم آ ہی گیا۔ ہمارے پاسپورٹ اور کاغذات دیکھ کر ہمیں رات گزارنے کی اجازت دے دی۔ مہمان خانہ بہت گرم اور آرام دہ تھا۔

اگلے روز بھی موسم کا مزاج نہ بدلا اور میں دنسک نہ جا سکا۔ دوسری رات بھی اسی مہمان خانے میں گزاری۔ تیسرے روز ہم نے جہاز پر جانے کا فیصلہ واپس لے



لیا اور ریل گاڑی کے ذریعے دنسک روانہ ہو گئے۔

### الوداعی اجتماع

آخر کار روس میں قیام کی آخری ساعت آہی گئی۔ دنسک یونیورسٹی کے انٹرنیشنل کلب کے ہال میں رخصتی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ یہیں الوداع کہنے کے لیے آنے والوں میں یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ، شعبوں کے سربراہ، غیر ملکی طلبہ کے خصوصی معاونین، کسمول کمیٹی کے سیکرٹری اور دوسرے کیونسٹ قائدین شامل تھے۔ اس روز ہال کی دیواریں الوداعی کلمات کے سرخ پلندروں سے سجائی گئی تھیں۔ غیر ملکی طلبہ کو بڑے اعزاز کے ساتھ خصوصی نشستیں پیش کی گئیں۔

تقریب کی رسمی کارروائی کا آغاز کسمول کے سیکرٹری نے کیا۔ افتتاحی کلمات میں انہوں نے کہا:

”عزیز دوستو! آپ کی شاندار کامیابیوں پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ روس میں قیام کے چھ برس کے دوران میں آپ نے اس ملک کی ترقی اور کامرانی کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ گزشتہ نصف صدی کے دوران میں روسی عوام نے شاہراہ ترقی پر کتنی سرعت سے سفر طے کیا ہے۔ ہم نے فیوڈل ازم کے بلے پر سوشلزم کی بنیادیں اٹھائی تھیں۔ جنگ و جدل اور لوٹ کھسوٹ نے ہمارے ملک کو تباہی کے دہانے پر لاکھڑا کیا تھا۔ آج دنیا کے کونے کونے میں ہمارے انقلاب کے ثمرات سمیٹ رہے ہیں۔ کیوبا، ویت نام، انگولا، یمن، ایتھوپیا، منگولیا، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، یوگوسلاویہ، بلغاریہ، چین، رومانیہ، مشرقی جرمنی اور البانیہ جیسے ممالک انقلاب کے سرخ پرچم تلے آپکے ہیں اور لاؤس، کمبوڈیا، برما، سری لنکا، شام، لبیا، الجزائر، افغانستان اور تیسری دنیا کے بیسیوں دوسرے ممالک



تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔

”عزیز ساتھیو! آپ خوش قسمت ہیں کہ لینن کی سرزمین پر اُس کے عقائد و افکار سے آگاہ ہوئے۔ اپنے اس امتیاز کو ہمیشہ یاد رکھیے۔ بین الاقوامی امن اور اپنے ملکوں میں انقلاب برپا کرنے کے لیے آپ کو کلیدی کردار ادا کرنا ہوگا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی غار محسوس نہیں ہوتی کہ روسی حکومت، عوام اور دنیا بھر کے سوشلسٹ عوام آپ کی پشت پر اور آپ کے معاون رہیں گے۔ ہم دوسرے ممالک کی خود مختاری کا احترام کرتے چلے آئے ہیں۔ اس کی واضح مثال ہمارا قریب ترین ہمسایہ افغانستان ہے۔ ہم نے اس کی اقتصادی اور صنعتی ترقی میں بے پناہ رہنمائی کی ہے، لیکن ہمیشہ خود کو اس کے اندر دخیل معاملات سے الگ رکھا ہے“

کسومول کے سیکرٹری نے آخر میں غیر ملکی طلبہ کو ”کامریڈ“ کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”روس آپ کا دوسرا گھر ہے۔ اپنے اس دوسرے گھر کو کبھی نہ بھلائیں۔“  
اس کے بعد یونیورسٹی کے ریکٹر نے طلبہ کو کامیابی پر مبارک باد کے کلمات کہے اور اس ضمن میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور انتظامیہ کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا:  
”ہم نے آپ کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بیک وقت نظریاتی اور فنی تعلیم دینے کی کوشش کی ہے۔ آپ کو ایسے مواقع فراہم کیے ہیں کہ آپ روس کے مختلف شہروں، تاریخی اور تفریحی مقامات اور علمی اور صنعتی اداروں کا بغور مشاہدہ کر سکیں۔ آپ نے روسی انقلاب کے کمالات اور کارناموں کو دیکھا اور سنا ہے۔ آپ چاہیں تو اس کی روشنی میں پوری دنیا کو سرخ انقلاب سے متعارف کرا سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے اپنے ملکوں میں انقلاب کی قیادت بھی کریں گے اور اپنے عوام کو ان پہلوئوں اور آسائشوں سے مستفید کریں گے جن سے آج روسی عوام مستفید ہو رہے ہیں۔ مجھے



یہ بھی امید ہے کہ آپ ہماری یونیورسٹیوں سے رابطہ برقرار رکھیں گے۔ بار بار روس آئے اور ہمیشہ روسی عوام اور اپنے اساتذہ کے خبر خواہ رہے۔  
غیر ملکی طلبہ نے بھی باری باری مختصر الفاظ میں اپنے خیالات پیش کیے۔ اکثر لڑکے اس عزم کا اظہار کر رہے تھے کہ وہ اپنے ملکوں میں جا کر سب سے پہلے انقلاب لانے کی کوشش کریں گے۔ سنے والے یہ باتیں سن کر تالیاں بجاتے رہے۔ میں نے اپنی باری پر اپنے اساتذہ کی محنت اور شفقت کا ذکر کرتے ہوئے تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا۔

والہی کا مرحلہ آیا تو تمام امور بڑی آسانی سے طے ہو گئے۔ افغانستان کے پانچ طلبہ نے دنسک یونیورسٹی سے ڈپلومہ حاصل کیا تھا۔ ہم میں سے تین لڑکے ایسے تھے جن کے روسی انتظامیہ سے پختہ روابط استوار تھے۔ دورانِ تعلیم میں انہیں یہ سہولت بھی حاصل رہی کہ جب چاہتے افغانستان سے اپنی بیویوں کو بلا لیتے تھے اور کچھ عرصے کے بعد انہیں واپس بھیجتے تو اس طرح کہ ہزاروں روپے کا تجارتی سامان ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اب یہ لوگ روس سے مستقل رخصت ہونے لگے تو ان کا دل روس میں رہا جاتا تھا، لیکن ناچار اپنے جسم اور اس سامان کو افغانستان کے لیے ہجک کر رہے تھے۔

یونیورسٹی نے ان تینوں کو مشترکہ پروجیکٹ دیا تھا، لیکن وہ اسے مکمل نہ کر سکے تھے۔ پھر بھی انہیں ڈگریاں مل گئی تھیں۔ روس سے جانے سے پہلے انہوں نے اپنا سامان ٹرانسپورٹ طیاروں کے ذریعے وطن بھجوایا۔ ہر ایک کے بکسوں کی تعداد چالیس پچاس کے قریب تھی۔ میں اس پر بے حد حیران تھا۔ اس لیے کہ دوسرے طلبہ روس کے کٹز کے کٹے تو انین سے محض چند چیزیں ہی نکال سکتے تھے لیکن ان تینوں پر کوئی پابندی نہ تھی۔



## تاشقند کے دو چہرے

روس سے رخصت ہوتے ہوئے ہم نے تاشقند کی راہ لی۔ میری عرصے سے خواہش تھی کہ میں اس شہر کو قدرے قریب سے دیکھوں۔ قدرت نے میرے لیے یہ موقع فراہم کر دیا۔ بروقت پرواز نہ ملنے کی وجہ سے مجھے کئی روز تاشقند میں بسر کرنے پڑے۔ ہم نے تاشقند کے دونوں رنگ دیکھے، نیا بھی اور پرانا بھی۔

نیا شہر یورپی طرز تعمیر کی خصوصیات لیے ہوئے ہے۔ جدید اور فلک بوس عمارتیں، کشادہ بازار، سینما گھر، صاف ستھرے پارک اور باغات۔ یہاں مٹی بسکٹ میں ملبوس یوکرینی اور روسی عورتیں ہر جانب رواں دواں نظر آتی ہیں۔

دوسری طرف قدیم عمارتوں اور تنگ گلیوں والا تاشقند ہے جہاں ازبک عورتیں ابھی تک دوپٹہ اوڑھے، شلوار قمیص میں ملبوس نظر آتی ہیں۔ اکثر بوڑھے ازبک باریش ہیں اور افغانوں کی طرح نسوار استعمال کرتے ہیں۔

مجھے شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں گھوم پھر کر بہت مزا آیا۔ کئی جگہ رک کر میں نے لوگوں کو سلام کیا تو انہوں نے بڑی فراخ دلی سے سلام کا جواب دیا اور میری خیر خبر پوچھی۔ میں ان سے پوچھتا کہ — وہ مسلمان ہیں، تو وہ فوراً کہتے: ”الحمد للہ ہم مسلمان ہیں“۔ کئی نوجوانوں نے میرے اس سوال کے جواب میں فر فر کلمہ طیبہ پڑھ کر سنایا اور قرآن پاک کی کئی آیات نہایت خوش الحانی سے تلاوت کیں۔ پورے شہر میں مجھے کسی جگہ کوئی شخص نماز پڑھتا دکھائی نہ دیا۔ میرے پوچھنے پر لوگوں نے بتایا کہ آبادی کے اکثریت نمازی ہے، لیکن نماز گھروں میں ادا کی جاتی ہے۔ ایک صاحب نے کہا: ”مسجدیں بند کر دی گئیں، لیکن ہر مسلمان کا گھر مسجد ہے جہاں ہم اجتماعی طور پر نماز ادا کرتے ہیں۔ تاشقند کے اکثر لوگوں کے پاس قرآن پاک کے نسخے موجود ہیں، لیکن



اکثر نئے بہت پرانے ہیں اور لوگ ان کی حفاظت اپنی جانوں سے زیادہ کرتے ہیں۔ لوگوں نے کہا۔ ہم عام طور پر خفیہ طریقے سے عبادت کرتے ہیں، لیکن عیدین کی نماز علی الاعلان ہوتی ہے اور حکومت پوری کوشش کے باوجود عید کے تہوار پر پابندی عائد نہیں کر سکی۔

ایک بوڑھے ازبک سے میں نے پوچھا: ”بابا! کیا آپ مسلمان ہیں؟ میری بات سن کر اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ مجھے غضبناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہنے لگا: ”کیا میں تمہیں کافر نظر آتا ہوں؟“

اس کے بعد اس نے کئی بار کلمہ طیبہ کا ورد کیا اور پھر کہنے لگا: ”یہاں کوئی شخص کافر نہیں ہے۔ کچھ لوگ خوف کی وجہ سے روسی بن گئے ہیں، لیکن دل سے وہ بھی مسلمان ہیں۔“

شہر کے قدیم حصوں پر کابل اور جلال آباد کا گمان ہوتا ہے۔ وہی تنگ و تاریک گلیاں جگہ جگہ گنداپانی بہتا ہوا۔ گلیوں میں مال مویشی بندھے ہوئے اور مزدور اپنے گدھوں کے ساتھ شور کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گلیوں میں دکانوں پر لکڑی کے تختے پر سامان بچایا ہوا لوگ بالکل ویسی انداز میں فروخت کرتے ہیں۔

قدیم شہر میں سبز چائے کے قہوہ خانوں میں لوگوں کا بہت ہجوم ہوتا ہے۔ لوگ سبز چائے کے اتنے شیدائی ہیں کہ ایک نشست میں کئی کئی قہوہ دانیاں ختم کر کے اٹھتے ہیں۔ شرک کے کنارے بڑی بڑی دیگجوں میں روایتی پلاؤ فروخت ہوتا ہے۔ لوگ پلیٹوں میں پلاؤ ڈالے شرک کے کنارے کھڑے ہو کر کھاتے ہیں۔ گرمے، سردے، تربوز اور انگور بھی شرک کے کنارے بیٹھے ہوئے لوگ فروخت کرتے ہیں۔ یہ مناظر دیکھ کر مجھے بے اختیار افغانستان کے شہروں کی یاد آگئی۔

افغانستان کی طرح شہر کے اکثر لوگ سر پر ٹوپی پہنتے ہیں۔ جو عورتیں دوپٹے نہیں



اور ہتھیں وہ بھی اپنے سروں کو رومال یا سکارف سے ڈھکے رکھتی ہیں۔

## اپنے وطن میں

میں وطن واپس آیا، تو داؤد حکومت کے آخری دن تھے۔ میں ملک کے داخلی حالات سے زیادہ آگاہ نہ تھا۔ ایک روز افغان فروشگاہ ہوٹل میں ایک شناسا ڈاکٹر عبدالزاہد سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ روسی، سردار داؤد سے نگاہیں پھیر چکے ہیں۔ ڈاکٹر زاہد کے خاندان کے داؤد فیملی سے گہرے روابط تھے۔ انہوں نے بتایا کہ داؤد حکومت اقتصادی مشکلات میں گھری ہوئی ہے۔ اسلامی تحریکوں کے نوجوان اس کے کٹر دشمن ہیں اور پرجہم پارٹی کے لوگ جو اس کے دست راست تھے درپردہ اس کے خلاف ہو چکے ہیں۔

میں کچھ عرصے تک کابل میں حالات کی سن گن لیتا رہا۔ داؤد کے قریبی دوستوں نے ڈاکٹر زاہد کی باتوں کی تصدیق کر دی۔ کاروبار حکومت نا تجربہ کار اور کھلڈرے لوگوں کے ہاتھوں میں جا چکا تھا۔ مشیران سلطنت ڈاکٹر عبدالجمید اور علی احمد خرم جیسے لوگ تھے جو نکٹائی باندھنے اور سگریٹ پینے سے زیادہ کچھ نہ جانتے تھے۔ حالات کی بنصوں پر اسلام آباد اور عبدالقادر ڈگر وال جیسے لوگوں کی انگلیاں بھین اور داؤد ان کے ہاتھوں میں محض کٹھن پٹی تھا۔ انہی دنوں وزیر منصوبہ بندی علی احمد کو گولی مار دی گئی۔ یہ روسی ایجنٹوں کا کام تھا۔ شاید روسی دیکھنا چاہتے تھے کہ حکومت میں کتنا دم ختم باقی ہے! انتظامیہ کئی ماہ تک اس عقدے کو حل نہ کر سکی۔ ہزاروں بے گناہ لوگ جیلوں میں بند کر دیے گئے۔

یہی زمانہ تھا جب اسلامی تحریک یونیورسٹی کیمپس سے باہر نکلی اور ایک زبردست قوت بن کر دارالحکومت اور دوسرے شہروں میں پھیلنے لگی۔ داؤد کی ساری تدبیریں اس قوت کے سامنے بند باندھنے سے عاجز آ گئیں۔ نوجوانوں نے اپنی تقدیر اسلام سے وابستہ کر لی اور وہ ملک سے جبر و استبداد اور کفر والحاد کا ہر نشان مٹانے



پر کمر بستہ ہو گئے۔

داؤد حکومت نے اسلامی تحریک کے نفوذ کو روکنے کے لیے جبر کا سہارا لیا۔ مختلف مقامات پر سینکڑوں نوجوان گولیوں سے بھون دیے گئے۔ ہزاروں جیلوں میں ڈال دیے گئے اور ہزاروں کو ترک وطن کر کے اپنی جانیں بچانی پڑیں، لیکن اس کے باوجود اسلامی تحریک کا بڑھتا ہوا سیلاب نہ رکا۔

میرے اکثر و بیشتر دوستوں کا خیال تھا کہ روس، سردار داؤد کو بچانے اور اسلامی قوتوں کو کمزور کرنے کی کوشش کرے گا، لیکن روسی دوسری چال چلنے کا فیصلہ کر چکے تھے وہ اپنے محسن اور دوست داؤد کو قربان کر کے ہی اسلامی تحریک کا راستہ روک سکتے تھے، یہی انہوں نے کیا۔ داؤد سے پہلے پرچم پارٹی کے ایک اہم لیڈر میر اکبر خیبر کو گولی ماری گئی، تاکہ سردار داؤد پر ہاتھ ڈالنے کا بہانہ مل سکے۔ یہ منصوبہ روسی سفارت خانے میں تیار کیا گیا۔

میر اکبر کی موت پر کمیونسٹ پارٹی نے داؤد حکومت کو وارنگ دی۔ ترہ کی کارل اور سلیمان لائق وغیرہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ خلق اور پرچم پارٹیوں نے باہمی اختلاف ختم کر کے متحدہ جلوس نکالنے شروع کر دیے۔ جلوسوں کی شدت بڑھی تو عبدالقادر ڈگر وال نے سردار داؤد سے طاقت استعمال کرنے کی اجازت طلب کی جو اسے مل گئی۔ یوں داؤد نے اپنی موت کے پروانے پر خود دستخط کیے۔

عبدالقادر ٹینک دستے لے کر صدارتی محل پر چڑھ دوڑا اور داؤد حکومت کچے اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

میں اس زمانے میں کابل میں تھا۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ خلق اور پرچم اتنی جلدی اپنے اختلافات ختم کر سکتے ہیں۔ اگرچہ مجھے ایک آدھ مرتبہ ایسی سن گئی تھی کہ روسی خلیقوں اور پرچیوں کے اختلافات دور کرنے کی کوشش کر رہے



ہیں۔ ترہ کی کے برسر اقتدار آنے سے بہت پہلے ایک مرتبہ مجھے اپنے دو کیونسٹ دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے ایک سرفراز کا تعلق پرچم سے تھا۔ دونوں روس سے میرے ساتھ ہی واپس آئے تھے۔ دوسرا سرور خان خلتی تھا اور کابل یونیورسٹی میں پستو پڑھاتا تھا۔

ہماری ملاقات کے دوران میں زیادہ تر گفتگو پرچم اور خلق کے اختلافات پر ہوتی رہی۔ سرفراز سرور کو اطمینان دلاتا رہا کہ روس عنقریب دونوں گروپوں میں صلح کرانے والا ہے۔ ترہ کی کو پارٹی کا جنرل سیکرٹری اور کارمل کو اس کا نائب منتخب کر لیا جائے گا۔ سرور کو اس کا زیادہ یقین نہ تھا اس لیے کہ کابل میں ان دونوں گروپوں میں بے پناہ اختلافات موجود تھے۔

روسیوں نے سرفراز کی بات درست ثابت کر دی۔ روسی سفارت خانے نے دونوں گروپوں کے قائدین کو صاف بتا دیا کہ اگر انہوں نے یک جا ہو کر واؤڈر کا تختہ نہ الٹا تو اسلامی تحریک کے نوجوان اقتدار پر قبضہ جمالیں گے اور پھر کیونسٹ انقلاب لانے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

### انقلاب کے تیور

ترہ کی کے اقتدار کے بعد کسی کو شبہ نہ رہا کہ روس افغانستان میں عملاً داخل ہو چکا ہے۔ اگر کچھ لوگ ابھی تک خوش فہمی میں مبتلا تھے تو کیونسٹوں نے ان کی غلط فہمی دور کر دی۔ انقلاب سے تین روز بعد کی بات ہے۔ میرا ایک ہمسایہ کسی بات پر میرے ساتھ الجھ پڑا۔ میں نے نرمی سے بات کی، مگر اس کے لہجے میں تلخی بڑھتی چلی گئی۔ ہمارے درمیان برسوں کے ہمسائیگی کا رشتہ تھا، لیکن اس نے بڑی رعوت سے کہا:

”میں چاہوں تو چند لمحوں میں تمہارا کام تمام کر سکتا ہوں تمہیں معلوم نہیں کہ انقلاب



آچکا ہے۔ اب اس ملک میں رجعت پسندوں کے دن گنے جا چکے ہیں۔  
 اس کے بعد ترہ کی اور پھر امین حکومت نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنا شروع  
 کر دیا۔ عوام پر جو بیتی وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں پر جو قسم ڈھائے گئے  
 اس نے چنگیز اور ہلاکو کے مظالم بھلا دیے۔

امین کے دور میں لاکھوں افغانوں کو بلڈ وزروں کے ذریعے زندہ اجتماعی قبروں  
 میں دفن کر دیا گیا۔

کارمل نے اپنے پیشروؤں کا ریکارڈ بھی مات کر دیا۔ اس کے ہاتھ روکنے والا کون  
 تھا روس کی ایک لاکھ منظم فوج اس کی پشت پر تھی۔

اپنے وطن کو فروخت کرنے اور ابنائے وطن سے غداری کی یہ داستان طویل بھی  
 ہے اور میرے موضوع سے ہٹ کر بھی۔ مجھے تو روس میں گزارا ہوا اچھ سالہ دور یاد  
 آ رہا ہے جہاں ہمیں اخلاق و کردار سے غاری کر کے وطن فروش کی تربیت دی گئی تھی۔  
 مجھے اس بات پر بے حد ندامت ہے کہ وطن کا سودا چکانے والوں میں میرے ہم سبق بھی  
 شریک تھے۔